۹۳/۸۶ء

بیادگار تاجدار اہلسنت مفتی اعظم ہند حضرت علامہ محمد مصطفےٰ رضا خان صاحب علیہ الرحمہ

مولانا حسن رضا بریلوی نمبر



ماہنامہ

سُنّی دُنیا

بریلی شریف



سرپرست و نگراں

حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خان صاحب ازہری قائم مقام مفتی اعظم ہند بریلی شریف

شہاب الدین رضوی

بسم اللہ الرحمن الرحیم
نحمدہ و نصلی علی رسولہ الکریم

مرکز سواد اعظم اہلسنّت و جماعت آستانہ عالیہ قادریہ رضویہ بریلی شریف
کا ترجمان

سُنّی دنیا
استاذِ زمن مولانا حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نمبر

مالک و نگراں

جانشین حضور مفتی اعظم فقیہ اسلام حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں ازہری دامت برکاتہم العالیہ

نائب نگراں

صاحبزادہ محمد عسجد رضا قادری

ایڈیٹر

محمد شہاب الدین رضوی

زر سالانہ ۶۰ روپیہ — فی شمارہ : ۶ روپیہ — اس شمارہ کی قیمت ۳۵ روپیہ

جاری کردہ

ادارہ سُنّی دنیا، ۸۲ سوداگران رضا نگر بریلی شریف، یوپی

فون :..... ۷۲۱۶۶

صفر المظفر ۱۴۱۵ھ
اگست ۱۹۹۴ء

اشاریات

ضروری اعلان

ماہنامہ سنی دنیا کا زیر نظر شمارہ مولانا حسن بریلوی نمبر تین ماہ کا مشترکہ شمارہ ہے یعنی ستمبر، اکتوبر، نومبر ۱۹۹۲ء کا تصور فرمائیں۔

ایڈیٹر

اداریہ

وقت فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے

اعلیحضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کے برادر اوسط، اور انکے پسندیدہ شاعر، استاذ زمن حضرت مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی علیہ الرحمہ کی شخصیت دبستانِ شعر و ادب خصوصاً بزم نعت میں محتاج تعارف نہیں ـــــ اور یہ حقیقت ہے کہ ان پر خاطر خواہ کام بھی نہیں ہوا۔ مولانا حسن بریلوی کا پوری دنیائے سنیت پر احسانِ عظیم ہے کہ انھوں نے امام احمد رضا بریلوی کی دیگر ذمہ داریاں اپنے سر لے کر امام احمد رضا بریلوی کو مصروف خدمت دین رکھا۔ ورنہ آج یہ علمی ذخیرہ جو وافر مقدار میں ہم سب کے سامنے ہے، وہ نہ ہوتا۔

راقم السطور کی ہمیشہ کوشش رہی ہے کہ غیر متعارف، گم نام، اور ان افراد پر کام ہونا چاہئے جن پر کچھ کام نہیں ہوا ہے، اور وہ عظیم حیثیت کے مالک تھے ـــــ زیر نظر ماہنامہ سنی دنیا کا "مولانا حسن بریلوی نمبر" ایک سال قبل نکالنے کا ارادہ تھا، راقم السطور نے مقالات و مضامین اسی دوران حاصل کر لئے تھے، مگر بہت دنوں تک بے توجہی کا شکار رہا۔ بالآخر اب ادارہ سنی دنیا آپ کی خدمت میں پیش کرنے کا شرف حاصل کر رہا ہے ـــــ "مولانا حسن بریلوی نمبر" کے جملہ مضامین پر نظر ثانی حضرت علامہ تحسین رضا خاں تحسین بریلوی نے کرائی گئی ہے۔ بعض مضامین کی تصحیح حضرت مولانا حبیب رضا خاں حبیب بریلوی نے فرمائی، اور میرے دوست جناب شاکر حسین رضوی (انشورنس کمپنی جسولی بریلی) بھی پروف ریڈنگ میں میرے ساتھ ساتھ لگے رہے انھوں نے میرا بہت سارا بوجھ ہلکا کر دیا۔ برادرم کاتب افتخار رضوی پورنوی کی شب و روز کی انتھک محنت نے جلد مرحلہ طے کرا دیا۔ اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے۔

مقالات کی نظر ثانی اور کتابت کی تصحیح وغیرہ میں بہت زیادہ اہتمام کیا گیا ہے، مگر یقینی طور پر یہ نہیں کہا جا سکتا ہے کہ غلطیوں کا امکان ختم ہو گیا ہے۔ اس لئے اگر کہیں بھی کوئی خامی نظر سے گزرے تو برائے کرم طعن و تشنیع کا نشانہ نہ بنا کر راقم السطور کو مطلع فرمانے کی زحمت گوارہ کریں، راقم رہنمائی کرنے والوں کا ممنون ہوگا۔

طالب دعا

محمد شہاب الدین رضوی

۲۱ رجولائی ۱۹۹۲ء

از: حجۃ الاسلام علامہ مولانا حامد رضا بریلوی قدس سرہٗ

نگارستان لطافت کا تعارف

چمن مدحت سرائے مصطفوی کا عندلیب نغمہ سرا گلشن نعت احمدی کا بلبل خوش نوا محب و محبوب جل جلالہٗ و
صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے راز و نیاز کی بولتی چالتی تصویر صحت روایات صدق حکایات حلاوت بیان سلاست زبان
آپ ہی اپنا نظیر جس کو عم مکرم مفخم و محترم شیریں بیان جناب مولانا مولوی حسن رضا خاں صاحب حسنؔ صین عن
ن نے تصنیف فرمایا اور نظر فیض اثر شمع بزم ہدایت آئینہ ماہ رسالت حکیم امت حضرت عالم اہلسنت استاذنا
والد ماجد نا و مقتدانا و ہادینا جناب مولانا مولوی احمد رضا خاں صاحب ابرح بالمواہب سے نور پاکر ۱۳۰۲ھ
ں ایک ہزار جلد چھپکر شائع ہوا اور بفضلہٖ تعالےٰ قبول قبول کے سرد جھونکوں کے ساتھ خوشبو کی طرح
پھیل کر دماغوں میں بسا دلوں میں سرور آنکھوں میں نور ہوکر اترا عزت کے ہاتھوں نے ہاتھوں ہاتھ لیا،
حتی کہ ایک سال میں ایک نسخہ بھی باقی نہ بچا مسودہ تک بعض احباب نے چھین لیا اور مشتاق نگاہوں کا انتظار
رزومند دلوں کا اضطرار فرمائشوں پر فرمائشوں کا تار روز افزوں ترقی پر ترقی کرتا رہا میرے معزز کرم
رما حافظ محمد ارشاد علی صاحب مہتمم مطبع اہلسنت نے مجھے اس خدمت عجاب ہم خرما و ہم ثواب کے پورا کرنے
بھارا حضرت عم مکرم نے تھوڑی ترمیم کے بعد کچھ اپنا کلام اور زائد فرمایا میں نے بہ نیت معاونت مطبع اہلسنت
جماعت بریلی بقلم جلی دبیز کاغذ پر گلکاری وغیرہ اہتمام کے ساتھ بحسن انتظام چھپوانا شروع کیا اب کہ یہ
مبارک رسالہ قریب اختتام ہے، مدح خوانی کے عاشقوں نعت سرائی کے شیدائیوں کو صلائے عام ہے کہ سہل
نگاری کو کام میں نہ لائیں فرمائشیں حتی الامکاں جلد آئیں پہلے کی طرح کہیں اس دفعہ بھی محروم نہ رہجائیں۔
نظر رفاہ عام اس رسالہ کی قیمت پانسو فرمائشوں تک چار آنہ بلا محصول اور پانسو کے بعد پانچ آنہ پچاس
جلد پچاس سے زائد کے خریدار کو کمیشن بھی دیا جائیگا جو مشتہر سے بذریعہ خط و کتابت طے ہو سکتا ہے۔
فرمائشیں ذیل کے پتہ سے آنا چاہیں۔

ماہنامہ تحفہ حنفیہ پٹنہ محرم الحرام، ش ۲، ج ۳

استاذِ زمن اعلیٰحضرت کی نظر میں

نبیرۂ استاذِ زمن
حضرت مولانا حبیب رضا خاں بریلوی

میرے جدِ امجد حضرت مولانا حسن رضا خاں صاحب حسن بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان کی ذات بابرکات محتاجِ تعارف نہیں انھوں نے اپنے کلام بلاغت نظام کیوجہ سے ہند و پاک میں امتیازی شہرت حاصل کی انکی تصنیفات نظم و نثر زبان و بیان کے اعتبار سے بہت بلند پایہ ہیں نیز شرعی لغزشوں سے پاک و صاف ہیں ماہرین فن نے ان کے کلام کی تحسین فرمائی ان کے برادر اکبر (اعلیٰحضرت امام احمد رضا علیہ الرحمہ والرضوان) جوکہ امام العلما بھی ہیں اور سلطان الشعرا بھی کس طرح داد تحسین دیتے ہیں وہ اعلیٰحضرت کے فارسی اشعار سے ظاہر ہے جوکہ ذوقِ نعت کی طباعت اول کے وقت شامل کتاب کئے گئے تھے۔ ان اشعار میں ذوق نعت کی تعریف بھی ہے اور اس کی طباعت کی تاریخ بھی نیز حضرت علامہ حسن رضا خاں علیہ الرحمہ کی مختصر اور جامع تحسین۔ وہ اشعار یہ ہیں

قوتِ بازوئے من سنی نجدی فگن
حاج و زائر حسن سلمہ ذوالمنن

شرع ز شعرش عیاں عرش بتیش نہاں
سنیاں را حرزِ جاں نجدیاں را سر شکن

نعت چہ رنگیں نوشت شعر خوشِ آئیں نوشت
شعر مگو دیں نوشت دور ز ریب و ظن

قلقلِ ایں تازہ جوش بادہ بہنگام نوش
نور فشاند بگوش شہد چکاں در دہن

کلکِ رضا سالِ طبع گفت بہ افضال طبع
زانکہ ز اقوالِ طبع کلک بود نغمہ زن

اس کے بعد سات شعر ہیں جن میں ہر شعر سے سنۂ طباعت نکلتی ہے ان میں آخر کے تین شعر یہ ہیں

نعت حسن آمدہ نعت حسنے
۱۳۲۶ھ

حسن رضا باد بزیں سلام

انّ من الذوق لسحر ہمہ
۱۳۲۶ھ

انّ من الشعر لحکمۃ تمام
۱۳۲۶ھ

کلک رضا داد چناں سال آں
۱۳۲۶ھ

یافت قبول از شہ راس الانام

یہ دیواں اس وقت سے ابتک متعدد بار چھپ چکا ہے لیکن اس کی خداداد قبولیت میں کمی نہیں آئی ملفوظات شریف میں ہے کسی نے اعلیٰحضرت سے عرض کیا کہ واقعات کربلا پر ایسی کتاب بتائیں جس میں صحیح روایات ہوں تو اعلیٰحضرت نے مولانا حسن رضا خاں صاحب کی تصنیف کردہ کتاب آئینۂ قیامت کا نام لیا اور فرمایا کہ میرے بھائی کی کتاب آئینہ قیامت میں صحیح روایات ہیں اعلیٰحضرت کی اس تحسین نے کتاب کی اہمیت میں غیر معمولی اضافہ کر دیا۔

سرگذشت عہد گل را از نظیری بشنوید
عندلیب آشفتہ تر میگوید این افسانہ را

تذکرہ مختصر حضرت مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی

از :- حکیم سید برکت علی نامی بریلوی تلمیذ حسن بریلوی

"آہ چمنستان سخن کا وہ سرسبز و شاداب گلشن جسمیں طرح طرح کے شگفتہ پھول طرح طرح کی کلیاں طرح طرح کے غنچے تر و تازہ نظر آتے تھے آج ایک کملایا ہوا پھول بصد حسرت و حرمان نظر آرہا ہے کہ زمانہ کے ناگوار صدموں سے مرجھا گیا ہے آہ یہ پھول کون سا ہے یہ حضرت استادی حسن بریلوی رضی اللہ تعالے عنہ ہیں، جن کے کمال سخن کی خوشبوؤں سے چمن شاعری مہک رہا تھا جنکی رنگینی کلام کی سرسبز و شاداب شاخیں میدان سخن کو گھیرے ہوئے تھیں جن کی زبان کی دلچسپیاں ایک عالم پر سکہ جمائے ہوئے تھیں جنکے محاورات کی بندشیں عالم و عالمیان کو اپنا وارفتہ بنائے ہوئے تھیں اور کیوں نہ ہوتے آخر کس کیاری کے پھول تھے، کس چشمہ سے سیراب ہوئے تھے، یہ اپنے پدر بزرگوار اعلیٰ حضرت امام العلما حضور سیدنا مولوی محمد نقی علی خاں صاحب قدس سرہ العزیز کے خزائن علم و عقل سے مستفیض اور جواہر معانی و فضل سے بہرہ ور تھے۔ اور سرچشمہ سخن فصیح الملک بلبل ہندوستان حضرت استاد داغ دہلوی مرحوم کی نہروں سے اپنے گلستان شاعری کے پودوں کو سینچا تھا۔ ایک مدت تک ریاست رام پور میں رہ کر استاد کی گلشن سخن سے گلچینی فرماتے رہے اور بریلی آکر اپنے اخی معظم مرکز دائرہ علوم مجدد مائۃ حاضرہ عالم اہلسنت حضرت مولٰنا مولوی حاجی مفتی جناب محمد احمد رضا خاں صاحب قبلہ دام اللہ تعالیٰ برکاتہم و افضالہم کی صحبت سے فیض معنوی حاصل کیا کئے۔ غرض ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ سے ۳ شوال ۱۳۲۶ھ تک اسی معزز گھر میں نشو و نما پائی۔ اللہ اللہ خوش قسمتی دیکھئے کہ سال گذشتہ ہی میں حج بیت اللہ کے اہم فرض کو پورا کر کے اپنے بچے اور پاک قلب کو زیارت حرمین طیبین کے چمکتے ہوئے نور سے منور کیا اس سچے نبی صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کی سچی محبت نے انکے دل پر ایسا گہرا اثر کیا کہ واپس آکر دنیوی کاموں کی طرف نگاہ اوٹھا کر نہ دیکھا آتے ہی انکے جذب محبت نے ان کو طبع دیوان نعت پر آمادہ کر دیا اور اشاعت شروع کر دی انشاء تعالے العظیم سرکار کریم سے وہ حسن قبول پایا کہ دوران طبع ہی میں یاایتھا النفس المطمئنۃ ارجعی الی ربک راضیۃ مرضیۃ فادخلی فی عبادی وادخلی جنتی کا حکم پہنچا وہ تو اچھے تھے اور انشاء اللہ الکریم بہت اچھے رہے مگر مہجور و نیز گذری جو گذری اُف نہیں قیامت خیز سین کو نامی نحزون کے قلم دو زبان کے دل میں کہاں قوت جو کچھ بھی لکھ سکے۔ لہذا سلسلہ مضمون کو اس وعدہ پر ناتمام چھوڑ کر رخصت ہوتا ہے کہ اس کے بعد ہی جو کلام عاشقانہ سے حلیہ اشاعت سے آراستہ ہونیوالا ہے۔ بعونہ تعالے اس میں اس مضمون کو پورا کر دے اور اس میں حضرت مرحوم کی تفصیل تصانیف مذکور ہوگی۔ انشاء اللہ تعالے۔"

نوٹ :- جناب نامی بریلوی مولٰنا کے شاگرد تھے صحافت اور شاعری میں کافی ملکہ حاصل تھا نامی بریلوی کا یہ مضمون ذوق نعت اشاعت بار اول مطلع اہلسنت و جماعت بریلی سے ماخوذ ہے، مذکورہ مضمون مولانا کے انتقال کے بعد لکھا گیا۔ اور آخر میں اس عزم کا بھی ذکر ہے کہ آئندہ مولانا پر کچھ لکھا جائیگا مگر نامی بریلوی کی یہ خواہش تکمیل کی منزل تک نہ پہونچ سکی۔

(محمد شہاب الدین رضوی)

مولانا حسن پر ایک سرسری نظر

مولانا حسرت موہانی

نام و خاندان

حسن رضا خاں نام حسن تخلص خلف اوسط جناب مولانا مولوی محمد نقی علی خاں مرحوم بریلوی اور برادر خورد جناب مولانا مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی۔ ۱۲۷۶ھ میں پیدا ہوئے بفضل و کمال اور فقر و تصوف کو آپ کے خاندانی خصوصیات میں سمجھنا چاہیے۔

تعلیم و تربیت

حکیم سید برکت علی صاحب نامی بریلوی (شاگرد حسن) اپنے استاذ کے "تذکرہ مختصر" میں لکھتے ہیں کہ:

"یہ اپنے پدر بزرگوار اعلیٰ حضرت امام العلماء حضور سید نا مولوی نقی علی خاں صاحب قدس سرہ العزیز کے خزائن علم و عقل سے مستفیض تھے۔ اور جواہر معانی و فضل سے بہرہ ور رہتے......... علاوہ بریں بریلی میں اپنے اخی معظم مرکز دائرہ علوم مجدد مائۃ حاضرہ عالم اہل سنت حضرت مولانا حاجی مفتی جناب محمد احمد رضا خاں صاحب قبلہ ادام اللہ تعالےٰ برکاتہم و افضالہم کی فیض صحبت سے فیض معنوی حاصل کیا کیے۔"

سلسلۂ شاعری

شعر و سخن کا شوق حضرت حسن کو ابتداء ہی سے تھا۔ کچھ روز تک بہ طور خود مشق کرتے رہے اس کے بعد مرزا داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کر دیا اور ایک مدت تک رامپور میں رہ کر استاذ کے گلشن سخن سے گل چینی فرماتے رہے یہاں تک کہ بجائے خود استاذ مستند قرار پاتے۔

شاگرد و اولاد

چنانچہ اس وقت بریلی کے اکثر خوش گو شاعروں کو آپ ہی کے دامن کمال سے وابستہ ہونے کا فخر حاصل ہے منجملہ ان میں حکیم سید برکت علی صاحب نامی، منشی دوارکا پرشاد علم بریلوی۔ حافظ و باج احمد صاحب محشر، سید محمود علی عاشق، منشی ہدایت یار خاں نفیس، منشی اختر حسین اختر، برج موہن کشور فیروز، منشی مظہر حسین مظہر، حکیم سید مسعود غوث فیض، منشی تہور علی تہور، منشی محمد حسین اکبر بدایونی اور منشی اعجاز احمد قیصر مرادآبادی کے قطعات تاریخ آپ کے دیوان عاشقانہ و نعتیہ کے آخر میں درج ہیں۔ آپ کے بڑے صاحبزادے حسین رضا خاں حکیم ہیں لیکن ان کی طبیعت کو شعر و شاعری سے مناسبت نہیں ہے۔

تصانیف

آپ کی تصانیف میں دیوان عاشقانہ کے علاوہ باقی کل کتابوں اور رسالوں پر زیادہ مذہبی رنگ غالب ہے۔

(۱) تزک مرتضوی در اثبات تفضیل شیخین
(۲) نگارستان لطافت در ذکر میلاد شریف
(۳) بے موقع فریاد کا جواب در مسئلہ قربانی

۴ آئینۂ قیامت ذکر کربلائے معلیٰ۔
۵ دین حسن در حقانیت اسلام اور رد مذاہب۔
۶ وسائل بخشش ذکر کرامات سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ۔
۷ ذوق نعت معروف بہ صلۂ آخرت مجموعہ کلام نعتیہ اردو۔
۸ ثمر فصاحت کلام مجاز اردو مع قند پارسی کلام مجاز پارسی اور ۔ ان میں ابتدائی چھ کتابیں آپ کے زمانہ حیات میں چھپ کر مقبول خاص و عام ہو چکی تھیں دیوان نعتیہ زیر طبع تھا کہ آپ نے سفر حج سے واپس آکر ۱۳۲۶ھ میں انتقال فرمایا اور دیوان عاشقانہ آپ کے بعد ۱۳۲۷ھ میں طبع ہوا۔

حسن کی شاعری

شاگردان مرزا داغ میں حسن مرحوم بریلوی کا پایۂ شاعری بہت بلند تھا وہ بجائے خود استاذ مستند تھے انہوں نے اپنے انداز سخن کو استاذ کے رنگ کلام سے مشابہ بنانے میں اس قدر کامیابی حاصل کی ہے کہ اکثر قطعوں میں داغ و حسن کی شاعری میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

ان کا جلوہ نہیں دیکھا جاتا!
دیکھ دیکھا نہیں دیکھا جاتا
قتل کرنے کی وہ جلدی تھی تمہیں
اب تڑپنا نہیں دیکھا جاتا
چشم خونبار خدا رحم کرے
تیرا رونا نہیں دیکھا جاتا
الفت ان کی نہیں چھوڑی جاتی
حال دل کا نہیں دیکھا جاتا

چشم ظاہر سے رخ یار کا پردہ دیکھا
آنکھیں جب پھوٹ گئیں تب یہ تماشا دیکھا
دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے تمہیں کیسا چاہا
پوچھنا یہ ہے کہ تم نے ہمیں کیسا دیکھا

گلشن خلد کی کیا بات ہے کیا کہنا ہے
پر ہمیں تیرے ہی کوچے میں پڑا رہنا ہے

برسی پھوار رنگ کھلے دل بکھر گئے
آئی بہار پھول کھلے جام بھر گئے

ساقیا اور بھی اک ساغر پر جوش مجھے
دیکھ ایسا نہ ہو آجائے کہیں ہوش مجھے

آرزوئے دید جاناں ، بزم میں لائی مجھے
بزم میں سے آرزوئے دید جاناں لے چلا

ڈھونڈھتی تھی ہر طرف کس کو نگاہ واپسیں
اس کس کے دید کی بیمار ہجراں لے چلا

تلووں سے راستہ چمن و دلکشا بنا
جلووں سے آئینہ در و دیوار ہو گئے

طور نے تو خوب دیکھا جلوۂ شان جمال
اس طرف بھی اک نظر اے برق تابان جمال

بہاروں پر ہیں آج آرائشیں گلزار جنت کی
سواری آنے والی ہے شہیدان محبت کی
ہوا چھڑکاؤ پانی کی جگہ اشک یتیماں سے
بجائے فرش آنکھیں بچھ گئیں اہل بصیرت کی
ہوائیں گلشن فردوس سے بس بس کے آتی ہیں
نرالی عطر میں ڈوبی ہوئی ہے روح نکہت کی
زمین کربلا پر آج ایسا حشر برپا ہے
کہ کھنچ کھنچ کر مٹی جاتی ہیں تصویریں قیامت کی

---

(۱) ماخوذ از اردوئے معلیٰ علی گڑھ

وہ بھی ہیں ساغر شراب بھی ہے :: چاند کے پاس آفتاب بھی ہے

حسن بریلوی حیات اور کارنامے

ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب ـــــ بریلوی، پی، ایچ، ڈی

ولادت وخاندان

مولانا حسن رضا خاں حسن ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو بریلی شریف میں پیدا ہوئے۔ آپ کا شجرۂ نسب یہ ہے۔ حسن رضا خاں بن حضرت مولانا نقی علی خاں بن مولانا رضا علی خاں بن حافظ محمد کاظم علی خاں بن شاہ محمد اعظم خاں بن حضرت محمد سعادت یار خاں بن حضرت محمد سعید اللہ خاں۔ سعید اللہ خاں کا اصل وطن قندھار تھا۔ اور وہ عہد مغلیہ میں وارد ہندوستان ہوئے تھے۔ ان کو ششہزاری منصب بھی ملا۔ محمد سعادت یار خاں محمد شاہ کے وزیر تھے۔ دہلی میں بازار سعادت گنج اور سعادت خاں کی نہر اُن کے نام سے منسوب تھیں اعظم خاں تارک دنیا ہوگئے۔ محلہ بہاری پور معماران بریلی میں شاہزادے کا تکیہ ان کی نسبت سے مشہور ہے۔ جس میں اُن کی قبر بھی ہے۔ حافظ محمد کاظم علی خاں بدایوں کے تحصیلدار تھے۔ انھیں آٹھ گاؤں معافی کے عطا ہوئے تھے۔ حضرت مولانا شاہ رضا علی خاں کا شمار صوفیوں میں ہوتا تھا۔ حضرت مولانا نقی علی خاں عالم دین اور صوفی منش بزرگ تھے۔ جن کے فیض تربیت میں حسن رضا خاں نے پرورش پائی۔ حسن رضا خاں کے بڑے بھائی مولوی احمد رضا خاں مشہور عالم دین، ماہندس، علم جفر کے ماہر، متقی ومتورع اور بلند پایہ نعت گو تھے۔

تعلیم وتربیت

مولانا حسن رضا رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے مروّجہ علوم اپنے خاندانی بزرگوں سے حاصل کئے۔ اور معقولات ومنقولات میں مہارت حاصل کرنے کے بعد طالبانِ علم دین کو درس دینے کا فرض منصبی انجام دیا۔ خدا نے طبیعت موزوں عطا کی تھی۔ شعر گوئی کی طرف بھی راغب ہوئے۔ اس وقت نواب مرزا داغؔ کا قیام رام پور میں تھا۔ حسن بریلوی رام پور گئے اور اپنے پھوپھا جناب فضل حسن خاں صاحب کے یہاں مقیم ہو کر داغؔ کے شاگرد ہوئے۔ اور شاعری میں مہارت حاصل کی۔ داغؔ ان پر بہت مہربان تھے۔ اور ان کو "پیارے شاگرد" کہہ کر مخاطب کیا کرتے تھے۔ حسن نے مرثیہ داغؔ میں لکھا ہے ے

پیارے شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزا کہیے

اقلیم شاعری کا بادشاہ

جب مولانا حسن رضا خاں رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ رام پور سے بریلی شریف آئے تو عوام نے ان کو ہاتھوں ہاتھ لیا۔ وہ بہت مشہور ہوگئے۔ مشاعروں کا وہ زور بندھا کہ باید وشاید۔

محلہ معماران بریلی شریف میں وہ عمارت جو امام باڑہ کہلاتی ہے اور
جس میں ہر سال ۱۰ محرم الحرام کو بڑی دھوم دھام ہوتی ہے۔ نئے
شہر میں مشاعروں کا بڑا مرکز تھی۔ اسی عمارت میں استاد داغ کی
زیر صدارت بھی مشاعرہ ہوا تھا۔ جس کا حال میں نے اپنی کم عمری
کے زمانے میں بڑے بوڑھوں کی زبانی سنا تھا۔ حسن کے تلامذہ
کی تعداد شمار میں نہیں آسکتی۔ وہ جب تک زندہ رہے، بریلی
کی اقلیم شاعری ان کے قبضے میں رہی۔ مولانا حسن کے تلامذہ میں
مداح رسول (صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم) جناب جمیل الرحمن خاں
جمیل، قاضی محمد خلیل حیراں، سید محمود علی عاشق اور دوارکا پرشاد
حسلم مشہور ہوئے۔ یہ تمام شعراء خود اپنی ذات میں ایک انجمن تھے۔
حسن رحمۃ اللہ علیہ کے انتقال کے بعد انھوں نے بریلی کے
ادبی وقعت کو قائم رکھا اور داغ کے طرز شاعری کو فروغ بخشا۔

حسن بریلوی اور ان کی صحافت

مولانا حسن رضا خاں رحمۃ اللہ تعالے علیہ نے دینی موضوعات
پر کتابیں تصنیف کیں اور تحریک رد وہابیت اور متنازعہ مسائل
فقہ وعقیدہ میں اپنے بڑے بھائی مولوی احمد رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ
کے پُرجوش معاون مددگار بنے رہے۔ انھوں نے اپنے مکان
کے قریب ہی (محلہ سوداگران) مطبع اہل سنت قائم کیا جس
میں ان کے دواوین غزل ونعت بھی طبع ہوئے۔ ان کی نگرانی
اور سید محمود علی عاشق کی ادارت میں ماہنامہ "بہار بے خزاں"
اور ہفتہ وار "روز افزوں" بھی جاری ہوا اس عہد کے مذاق کے
مطابق پاکیزہ ادب پیش کرتے تھے۔ گلدستہ بہار بے خزاں
کا فروری ۱۹۰۲ء میں اجرا ہوا۔ حضور احمد خاں آثم بریلوی نے
تاریخ لکھی تھی ؎

لکھی تاریخ آثم نے یہ اس کی
بہت زیبا بہار بے خزاں ہے

گلدستہ کا نام نواب مرزا داغ نے عطا فرمایا تھا۔ اور وہ اس
کے سرپرست بھی تھے۔ اس کے سرورق پر یہ تحریر موجود ہے۔
"ہم بہت فخر کے ساتھ کہتے ہیں کہ یہی
گلدستہ کے لئے یہ مبارک نام، جہاں استاد
ناظم یار جنگ بلبل ہندوستان عالیجناب
حضرت نواب مرزا خاں صاحب داغ مدظلہ
نے عطا فرمایا تھا۔"

اس زمانے کے رواج کے مطابق اس گلدستہ میں بھی مصرع
طرح پر کہی ہوئی غزلیات طبع ہوتی تھیں۔ مثلاً فروری ۱۹۰۲ء
کی اشاعت میں یہ مصرعہ طرح تھا ؎

جلوۂ یار کا آنکھوں نے تماشا دیکھا

جس پر ۲۶ غزلیات لکھی گئیں اور گلدستہ میں طبع ہوئیں۔ بیشتر
غزلیات کا تعلق شعرائے بریلی سے تھا۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا
کہ گلدستہ کس سن میں بند ہوا۔

اخبار "روز افزوں" ہفتہ وار کا اجرا ۱۹۰۲ء میں ہوا۔ اس
کے مدیر بھی میر محمود علی عاشق بریلوی تلمیذ حسن رضا خاں حسن
رحمۃ اللہ تعالے علیہ تھے۔ یہ ہفتہ وار اخبار اپنے زمانے میں بہت
مشہور تھا۔ اس کا اشتہار گلدستہ "بہار بے خزاں" میں
چھپا تھا۔ جس کی عبارت یہ ہے ؎

"اخبار "روز افزوں" نے ملک میں اپنی روز افزوں
ترقی ۱۹۰۲ء سے نہایت مستعدی کے ساتھ حمایت
مذہب اور پولیٹکل معاملات پر اپنی آزادانہ ظاہر کرکے
بڑا نام پیدا کیا ہے۔ ہم اس کی نسبت ناظرین والا
تمکین کی خدمت میں صرف اس قدر عرض کرتے ہیں
کہ اگر آپ کو ایسا اخبار دیکھنے کا شوق ہے جو سچوں کا
دوست جھوٹوں کا دشمن، قوم کا خیر خواہ، گورنمنٹ کا
مشیر، رعایا کے حقوق کا دستگیر ہو تو شہر بریلی کا مشہور
اخبار روز افزوں ہفتہ وار دیکھئے جس میں ہر
شخص کی طبیعت کا عمدہ سامان موجود ہے۔ اگر
آپ کو فاضلانہ مضامین پڑھنے سے شوق ہے تو
ایڈیٹوریل مضامین ملاحظہ فرمائیں۔ اور اگر آپ
کو علم دین اور مسائل شرعیہ سے دلچسپی ہے تو مذاکرہ
علمیہ سے آپ کی پوری تسکین ہو سکتی ہے۔ اگر آپ
خبروں کے شائق ہیں تو عطر مجموعہ اور جام جہاں نما
کی سیر کیجئے۔ اگر آپ کو شعر وسخن سے دل بستگی

ہے تو نامی گرامی شعرائے زمانہ کا کلام جو نہایت
حسن انتظام سے شائع کیا جاتا ہے ملاحظہ فرمائیے۔"[1]
اس زمانہ میں یہ اخبار بہت ہی دلچسپ تھا
کیونکہ اس میں ہر شخص کی طبیعت کا عمدہ سامان
موجود تھا۔ اس اشتہار سے مولانا حسن رضا
خاں حسن رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ اور ان کے
شاگرد، مہتمم اور ایڈیٹر محمود علی عاشق کی ذہانت
و وسیع النظری کا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ گویا وہ
صرف شاعر و عالم دین ہی نہ تھے، دنیا کا پختہ
تجربہ رکھنے والے ایک صحافی بھی تھے۔

بریلی کی ادبی انجمنیں اور مشاعرے

مولانا حسن رضا خاں رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے زمانے میں
ہی نعتیہ مشاعروں کا رواج پڑا۔ ان سے قبل بریلی کے مشاعروں
میں بطور ہدیہ تبریک حمد و نعت و منقبت خوانی ہوتی تھی۔ جب حسن
رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کی نعت گوئی نے ہندوستان گیر شہرت حاصل
کی اور بریلی میں نعت گوئی کو غیر معمولی مقبولیت نصیب ہوئی تب نعت
گوئی کے لئے مشاعرے بھی جدا منعقد ہونے لگے۔

مولانا حسن رضا خاں رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے زمانے سے ہی
مشاعروں میں مزاح نگاروں نے اپنا کلام پڑھا۔ اس کا آغاز یوں
ہوا کہ حسن سے ایک ہزل گو خنداں وابستہ تھے۔ اور حکیم عبد الصمد
سرشار سے ایک سقہ، جن کا تخلص قلقل تھا۔ مشاعروں میں ہر
دو گروپوں کی طرف سے یہ ہزل گو پیش ہوتے اور سامعین کے
لئے انبساط کا سامان فراہم کرتے۔ خنداں کے دیوان کا سائز
بغدادی قاعدہ، تعداد صفحات ۲۴، کاغذ بھدا گلابی، ایک نسخہ
میرے پاس محفوظ ہے[2]

بحیثیت مجموعی بریلی میں اردو شاعری کا وہ دور جس کا آغاز
مولانا حسن رضا خاں رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے ساتھ ہوا۔ اور جس
کا اختتام ۱۹۴۷ء میں ہوا، ایک دلچسپ، رنگارنگ، اور ہمہمی
کا دور تھا۔ جس کی شیریں یاد آج بھی عمر رسیدہ اشخاص کے قلوب
میں باقی ہے۔ نواب مرزا داغ، ان کے تلامذہ اور ان کے متبعین
نے فصیح البیانی کو غزل کی خاص خصوصیت سمجھا۔ داغ فصیح الملک
کہلائے اور ان کے تلامذہ و متبعین نے فصاحت کو ہی ہنر غزل
گوئی سمجھ کر سخن سنجی کی۔ ان تمام شاعروں کی غزلیات کا مطالعہ
کرنے کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اشعار میں کشادگی، تیز
زبانی، خوش گوئی ملتی ہے۔ ان کے اشعار بالعموم ایسے الفاظ سے
خالی ہیں جنہیں بلغاء نے ناپسند کیا۔ یا جن کی سند ان سے نہیں
ملتی۔ ان کے اشعار میں ضعف ترکیب کلمات اور
ترکیب غیر مانوس و الفاظ ثقیل و درست بھی نہیں ملتے۔ ان کے
اشعار میں اجتماع دو حرف از یک جنس، کہ موجب ثقل ہو، نہیں ملتا۔
غیر مانوس الفاظ اور مشکل لغات بھی نہیں ملتے۔ لہٰذا علم معانی کی
اصطلاح میں شعراء کا یہ گروہ فصیح البیان تھا اور اس کے سرخیل
فصیح الملک تھے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا سابقین فصیح البیان نہ تھے؟
جب فصاحت کے بغیر اعلیٰ شعر گوئی کا تصور ناممکن ہے تو بلا
حجت یہ ماننا پڑتا ہے کہ سابقین بھی فصیح البیان تھے۔ لہٰذا اب یہ
سوال پیدا ہوتا ہے کہ داغ اور ان کے حلقے کے شعراء کی فصیح البیانی
میں وہ کون سی قدر غیر مشترک ہے جو وجہ امتیاز بن سکتی ہے۔؟

میرے خیال میں وہ قدر غیر مشترک بداعت ہے۔ سابقین نے
بداعت کا استعمال بالالتزام کیا۔ داغ اور ان کے گروہ کی شاعری
اس التزام سے خالی ہے۔ لہٰذا سابقین کی غزلیات ایک ایسے مرمریں
مجسمہ کی طرح تھیں۔ جس کی تزئین کے لئے یا جس کو قابل قبول بنانے
کے لئے خارجی حسن کاری کا سہارا لیا گیا۔ داغ اور ان کے گروہ
کی غزلیات صرف مرمریں مجسمہ کی طرح تھیں۔ جس کے اعضاء
نشیب و فراز، برہنگی، خود سپردگی اور مستقل احساس تلذذ نے ہی
اس کو قابل قبول بنایا۔

حسن نے داغ کی تقلید کی ہے

مولانا حسن رضا خاں حسن رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے دیوان کا شعر بہ
شعر مطالعہ کرنے کے بعد مستفاد ہوا کہ انہوں نے اپنے استاد
کی تقلید کی۔ ان کے الفاظ، تراکیب لغات، روزمرہ، محاورہ جان

فصاحت ہیں۔ ان کی زبان میں غضب کی کشادگی اور خوش گوئی ملتی ہے۔ انھوں نے بھی اپنے استاذ کی طرح بداعت کا سہارا انہیں لیا۔ مگر اس کی تقلید کے باوجود وہ امتیاز کے حامل ہیں۔ اس امتیاز کا باعث ان کی شخصی زندگی ہے۔

مولانا حسن رضا خاں حسنؔ رحمۃ اللہ تعالٰے عالم دین اور منقولات و معقولات کے منتہی تھے۔ ان کی تربیت دینی ماحول میں ہوئی تھی۔ وہ متقی و پرہیزگار انسان تھے۔ انہوں نے شاعری کو وسیلۂ رزق اور ذریعۂ شہرت نہیں بنایا تھا۔ وہ درباروں سے غیر متعلق تھے۔ وہ نہایت خود دار اور تہذیب نفس کی دولت سے مالا مال شاعر تھے۔ لہٰذا داغؔ کی تقلید میں غزلیں لکھتے وقت انہوں نے اپنے علم و فضل، اپنے اتقا، خود داری و تہذیب نفس کی کے چادر مرمریں مجسمے پر ڈال بالکل اسی طرح جیسے سابقین نے بداعت کے پردے میں حسن کی برہنگی کو چھپایا تھا۔ یہ اعلیٰ فنکاری تھی۔ سابقین میں جراتؔ اور متاخرین میں داغؔ ایسی فنکاری سے محروم رہے۔ داغؔ کے شاگردوں میں سے حسنؔ، اور امیر مینائی کے شاگردوں میں سے حفیظؔ جونپوری ایسی اعلیٰ فنکاری کے حامل ہیں۔ نقش ثانی نقش اول سے بدرجہا بہتر ہے۔

حسنؔ بریلوی غزل کے شاعر

مولانا حسن رضا خاں حسنؔ رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ نے داغؔ کی غزل کی سوقیت دور کی۔ زود گوئی کے باوجود غزل کی فضا کو برقرار رکھا۔ اظہار حدیث خلوت، خمریات، شوخی اور دیگر مضامین غزل کو باندھنے کے باوصف استاد کی تقلید میں ایک تنگ دائرے میں مقید نہیں ہوئے۔ انہوں نے دل کی فطری کسک اور قلب کے نور کو بھی اپنی غزل میں پیش کیا۔ وہ فطری طور پر غزل کے مزاج سے زیادہ ہم آہنگ معلوم ہوتے ہیں ؎

حسنؔ جب مقتل کی جانب تیغ براں لے چلا
عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لے چلا
آرزوئے دید جاناں بزم میں لائی مجھے
بزم سے یہ آرزوئے دید جاناں لے چلا
جلوہ گہہ میں سیل گریہ لے رہا ہے عمر دم دید
تشنہ لب ہو کے ہی گماؤں جوش طوفاں لے چلا
ڈھونڈتی تھی ہر طرف کس کو نگاہ واپسیں
اُس کس کے دید کی بیمار ہجراں لے چلا
اُف ری متوالی جوانی کچھ خبر تجھ کو نہیں!
ساغر مئے بوسۂ بسہالئے جاناں لے چلا
مہنگا سستا بیچ ڈالا مال اشتی نیٹھ بھی
اک جھلک میں وہ دم آخر دل و جاں لے چلا
کی ہیں کس کمبخت دل کے جذبے گستاخیاں
کون بے پردہ انھیں سوئے شبستاں لے چلا
میرے گھر تک پاؤں پڑ کر ان کو لایا تھا نیاز
ناز دامن کھینچتا سوئے رقیباں لے چلا
دل کو جاناں سے حسنؔ سمجھا بجھا کر لائے تھے
دل ہمیں سمجھا بجھا کر سوئے جاناں لے چلا

شوخی سے باز آئے وہ کن شوخیوں کے ساتھ
بے چین کر گئے وہ نگہ شرمسار سے

شوخیاں اس کی قیامت سے بھی کچھ اونچی گستیں
ہم تری نیچی نظر کو شرمگیں کہنے کو تھے

محو رضائے یار ہوں مجھ کو خبر نہیں
انداز لطف کیا ہے ادائے عتاب کیا

اب نظر آتے ہیں زاہد راہ پر آتے ہوئے
تا در میخانہ آجاتے ہیں سمجھاتے ہوئے
سرِ پ تو دل میں مرے ذاتا ترے باڑے کی خبر
دیہ کے بھوکے پھریں یوں ٹھوکریں کھاتے ہوئے

کچھ حسینوں کی محبت بھی بری ہوتی ہے
کچھ یہ بے چین طبیعت بھی بری ہوتی ہے
آپ کی ضد نے مجھے اور پلائی حضرت
شیخ جی اتنی نصیحت بھی بری ہوتی ہے

قیس کے حال کو سن سن کے جگر پھٹتا ہے
ساتھ کھیلنے کی محبت بھی بری ہوتی ہے

دادِ شوریدہ مری کس سے ملے گی یارب
جس جگہ میں ہوں وہاں در نہیں دیوار نہیں

دل میں غم ہے قلق ہے حسرت ہے
تمھیں کس چیز کی ضرورت ہے
ہاں مجھے ان سے عشق ہے ناصح
آپ کہتے مری...... طبیعت ہے

نقاب میں بھی وہ جلوہ نہ نقاب نہیں
سحاب سے جو چھپے یہ وہ آفتاب نہیں

تم اور بچی ہوئی کسی مے نوش کی پیو
بہکے ہوئے ہو شیخ ذرا ہوش کی پیو
اس مے میں سوزِ دل سے ہے لطف کباب بھی
بوتل دبی ہوئی مری آغوش کی پیو

ہجر تب ہے سبب ذکر خدا اے واعظ
رات دن ہائے خدا ہائے خدا کرتے ہیں

اے جانِ گل گزرتے ہیں جس رہگذر سے آپ
کہتی ہیں نکہتیں کہ گئے ہیں ادھر سے آپ

عمر روتے ہی کٹی جان پہ کھیلے ہی بنی
ہم ہنسی کھیل سمجھتے تھے محبت ان کی

عشق صد گونہ الم احسن ہزاراں غفلت
کیسے بھولوں میں انھیں وہ مجھے کیا یاد کریں

مچل جائے گا دل تو ساری شوخی بھول جاؤ گے
بلا سے بد ہے یہ کیا جانے تم نے اس کو کیا سمجھا

اعجاز کی باتیں تری گفتار میں دیکھیں
رفتار میں چلتا ہوا جادو نظر آیا

دمِ آخر ترے حسرت بھرے گھر کے قیامت تھی
گلے مل مل کے روئی بیکسی ایک ایک ارماں سے

کیا پاؤ گے تم ہم سے فقیروں کو ستا کر
بندے کو ذرا خوف بھی لازم ہے خدا سے

موت بھی کیا جانے کچھ بیمار ہے!
کیوں نہیں آتی ترے بیمار تک

آہ وہ حال جس کو ڈرے ترے
لا بھی سکتے نہ ہوں زباں تک ہم

نہ ہم چھوٹے محبت کے بکھیڑوں سے نہ چھوٹیں گے
جو دل خالی ہو رونے سے تو آہیں بھر نکلتے ہیں

جی میں ہے آج تو ایسی کوئی فریاد کریں
کچھ دنوں بھولنے والے بھی ذرا یاد کریں

بریلی کے نعتیہ مشاعرے اور شعرا

میں نے بتایا تھا کہ مولانا حسن رضا خاں حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے زمانے میں نعتیہ مشاعرے مروج ہوئے۔ اس وقت نعتیہ شاعری کو اس درجہ فروغ ہوا کہ نعتیہ مشاعروں کی ضرورت محسوس کی گئی۔ اور ان کا انعقاد بھی ہوا۔ میں جب بریلی کی تاریخ نعت گوئی کا تصور کرتا ہوں تو بے شمار سرمایہ نعت میں نظر آتا ہے۔ چوں کہ بریلی مدت مدید سے علماء و فقراء کا مرکز ہے۔ لہٰذا بریلی میں نعتیہ شاعری بھی عام اردو شاعری کی ہمسفر رہی ہے۔ یہ سرمایہ بہ اعتبار مقدار اتنا زیادہ ہے کہ اس موضوع پر ایک مستقل کتاب لکھی

جاسکتی ہے۔ ۱۸۵۷ء کا دور مابعد جس کا تعلق مولانا حسن رضا خاں
حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے ہے۔ بریلی میں عظیم المرتبت نعت
گویان پر مشتمل ہے۔ نواب حیدر حسین خاں حیدر، نواب محمد
عبدالرزاق خاں رزاق، شاہ سید حسین سید، مولوی لطف علی
خاں لطف، مولوی احمد رضا خاں رضا، سید شاہ فضل غوث
ساقی، حضور احمد خاں آثم، مولوی محمد حسن علمی، سید محمد فدا اعلیٰ
واثق، علی حسین شاہ طالب اور محمد جمیل الرحمان خاں جمیل۔ وہ
صاحب دیوان برگزیدہ شعرائے نعت ہیں جن پر جتنا بھی فخر کیا جائے
کم ہے۔ حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پیدائش سے فوراً پہلے
کے زمانے میں دو باہر کے آئے ہوئے شاعر یعنی کرامت علی خاں
شہیدی اور کفایت اللہ کافی مرادآبادی نے اپنی نعتیہ شاعری سے
بریلی میں نعتیہ شاعری کے لئے غیر شعوری تحریک پیدا کی تھی۔ میں
سمجھتا ہوں کہ ۱۸۵۷ء کے دور مابعد کے نعت گویان کے لئے بریلی
میں شہیدی اور کافی نے عقبی زمین کا کام کیا ہے۔

حسن بریلوی نعت گوئی کے میدان میں

مولانا حسن رضا خاں حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعلیم و تربیت
مذہبی ماحول، باعمل زندگی اور شعر گوئی کی فطری صلاحیت کا تقاضہ
یہی تھا کہ وہ نعت لکھتے۔ چنانچہ انہوں نے نعت گوئی میں بھی
وہ امتیاز پایا کہ باید و شاید۔ ان کی نعتوں کا مجموعہ مسمیٰ ذوق نعت
۱۳۲۵ھ/۱۹۰۷ء دس بارہ بار طبع ہو چکا ہے۔ ان کے تحریر
کردہ نعتیہ کلام اور نعتیہ غزلیں برصغیر ہند و پاک میں یکساں طور
پر مقبول ہیں۔ حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے نعتیہ کلام پر داغ کی
اصلاح نہیں ہوئی۔ ان کے بڑے بھائی مولوی احمد رضا خاں
رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے ضرور ان کی نعتوں کو کبھی کبھار
بہ نظر اصلاح دیکھا ہے۔ وہ ان کی نعتوں کی مداح تھے۔ انہوں
نے ملفوظات میں صرف دو نعت گویان اور دو یعنی کافی مرادآبادی
حسن رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی تعریف کی ہے۔
انہوں نے فرمایا کہ نعت لکھنا ایسا ہی ہے جیسا کہ تلوار پر چلنا۔ اگر
مدح میں غلو کیا تو گمراہ ہوا اور اگر مدح میں کمی کی تو گمراہ ہوا۔
انہوں نے حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے متعلق خاص
طور پر کہا کہ ان کی نعت میں شرعی نقص نہیں ملتا یعنی مدح بمنزلہ
مرتبہ ہے نہ زیادہ نہ کم۔[۲]

مولانا حسن رضا خاں حسن رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی نعتیں
پڑھنے کے بعد یہ سوال ذہن میں پیدا ہوتا ہے کہ کیا نعت میں
غزل کی مخصوص زبان یا پیرایہ اظہار اختیار کیا جاسکتا ہے۔؟
میں نے کتنے ہی صاحب الرائے افراد کو یہ کہتے سنا ہے کہ
غزل کی زبان میں نعت لکھنا گستاخی و بے ادبی سے عبارت
ہے مگر میں ایسا نہیں سمجھتا۔ نعت جزو شاعری بننے کے بعد سرمایہ
ادب ہے۔ لہٰذا ادب کو ادبی تنقید کی روشنی میں ہی دیکھنا ہوگا۔

نعت اقسام نظم میں سے ہے جس کا تعلق توصیف رسول
(صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) سے ہے۔ غزل اقسام شعر
میں سے ہے۔ جیسے مثنوی، قصیدہ، مستزاد، مسمط وغیرہ۔
بالفاظ دیگر نعت مضمون ہے اور غزل فارم، ہر فارم دوسرے فارم
سے مختلف ہے۔ غزل کی اشاریت، مضمون لب و لہجہ قصیدہ و
مثنوی سے مختلف ہے۔ نعت کے لئے کوئی مخصوص فارم نہیں
ہے۔ توصیف رسول (صلے اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) شعر کی
کسی بھی قسم میں کی جاسکتی۔ ہم ایسے کلام کو نعتیہ غزل، نعتیہ
مثنوی اور نعتیہ قصیدہ کہتے ہیں۔ نعتیہ مثنوی و قصیدہ میں مثنوی
و قصیدہ کا ماحول ملے گا تبدیلی صرف مضمون کی ہوگی یعنی اس
کا تعلق بشر سے نہیں افضل البشر (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم)
سے ہوگا۔ نعت کی موجودگی میں غزل غزل رہے گی۔ مثنوی مثنوی
اور قصیدہ قصیدہ میرے خیال میں تو خود اپنی جگہ یہ اعلیٰ فنکاری ہے۔
کہ غزل کی بنیادی خصوصیات اور تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے
نعت لکھی جائے۔ لہٰذا اس طرح کی باتیں کہ یہ لفظ غزل کا ہے۔
نعت میں کیوں استعمال ہوا۔ تشدد دار تنقید بلکہ ناسمجھی کی باتیں
ہیں۔

حسن بریلوی بحیثیت عاشق رسول

مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ عالم
دین تھے۔ نیک اور پرہیزگار مسلمان بھی تھے۔ ان کے سینہ میں

ایک گداز قلب تھا۔ ان کے صاحبزادے مولوی حسنین رضا خاں رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ بتایا کہ رسول مقبول صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر گرامی شکر ان کی آنکھیں نم ہو جاتی تھیں، فریضۂ حج کی ادائیگی کے بعد جو انھوں نے وفات سے سات ماہ قبل ادا کیا تھا۔ اور جس مدت میں انہوں نے ذوق نعت مرتب کیا ان کی حالت غیر سی رہی اور خاص کیفیت طاری رہی جس کا اظہار انکی نعتوں میں بار بار ہوا یہ حالت عشق نبی صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کی وجہ سے تھی جس میں فنائیت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ وہ قلبی کیفیت تھی جس کے اظہار کے لئے غزل سب سے زیادہ موزوں تھی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی نعتوں میں ان کے جذبات غزل کی زبان اور غزل کی اشاریت کے سہارے اس قدر زود اثر ہو گئے ہیں کہ وہ اردو کی نعتیہ شاعری میں اپنا جواب نہیں رکھتے ہیں۔ اس روش نعت گوئی سے وہ متقدمین سے بھی ممتاز ہو گئے کیونکہ انہوں نے نہ تو بداعت کے پردوں پر پرواز کی اور نہ مضامین نعت کو اہم روایات و واقعات تک محدود رکھا۔ انہوں نے اپنی نعتیہ غزلوں میں جذبات، تجربات اور مشاہدات کو منظم کیا۔ اس طرح وہ محض نعت کے نہیں روح نعت کے شاعر تھے۔ ؎

نگاہِ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں
لئے ہوئے یہ دلِ بے قرار ہم بھی ہیں

ہمارے دستِ تمنا کی لاج بھی رکھنا
ترے فقیروں میں اے شہریار ہم بھی ہیں

ادھر بھی توسنِ اقدس کے دو قدم جلوے
تمہاری راہ میں مشتِ غبار ہم بھی ہیں

کھلا دو غنچۂ دل صدقہ بادِ دامن کا
امیدوارِ نسیم بہار ہم بھی ہیں

تمہاری ایک نگاہِ کرم میں سب کچھ ہے
پڑے ہوئے تو سرِ رہگذار ہم بھی ہیں

جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعلِ پاک حضور
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں

حسن ہے جن کی سخاوت کی دھوم عالم میں
انھیں کے تم بھی ہو اک ریزہ خوار ہم بھی ہیں

دل میں ہو یاد تری گوشۂ تنہائی ہو
پھر تو خلوت میں عجب انجمن آرائی ہو
آستانے پہ ترے سر ہو اجل آئی ہو
اور اے جانِ جہاں تو بھی تماشائی ہو

بزم آرا ہوں آجائے تری زیبائی کے
کب سے مشتاق ہیں آئینے خود آرائی کے
خاک ہو جائے اگر تیری تمناؤں میں
کیوں ملیں خاک میں ارمان تمنائی کے

اس دل کے فدا جو ہے تری دید کا طالب
ان آنکھوں کے قربان جنھیں تو نظر آیا

ایسا تجھے خالق نے طرح دار بنایا
یوسف کو ترا طالب دیدار بنایا
اے نظمِ رسالت کے چمکتے ہوئے مقطع
تو نے ہی اسے مطلعِ انوار بنایا
یہ لذتِ پابوس کہ پتھر نے جگر میں
نقشِ قدمِ سیدِ ابرار بنایا

اگر قسمت سے میں ان کی گلی میں خاک ہو جاتا
غمِ کونین کا سارا بکھیڑا پاک ہو جاتا

واہ کیا مرتبہ ہوا تیرا
تو خدا کا خدا ہوا تیرا
اے چمن بھیک ہے تبسم کی
غنچۂ غنچہ کھلا ہوا تیرا
سو کھے گی نوں مرا تار ہو کیوں
کہ ہے دریا چڑھا ہوا تیرا

اگر چمکا مقدر خاکِ پائے رہرواں ہو کر
چلیں گے بیٹھے اٹھتے غبارِ کارواں ہو کر

تصور اس کا جان بخش کا کس شان سے آیا
دلوں کا چین ہو کر جان کا آرام جاں ہو کر

حسن بریلوی کی مثنویاں

"ذوق نعت" میں تین مثنویاں بھی ہیں۔
(۱) وسائل بخشش ۱۳۰۹ھ/۱۸۹۱ء
(۲) ذکر ولادت شریف
(۳) بے نام اور ناتمام ہے۔ ان میں قابل ذکر مثنوی وسائل بخشش ہے، جس میں ۴۰۲ اشعار ہیں اور نعت کے علاوہ مناقب بھی ہیں۔ اس مثنوی کا انداز مثنوی کی فضا کے مطابق غزل سے اور خاص طور پر داغ اسکول کی غزل سے بالکل مختلف ہے بہ حیثیت مجموعی یہ اعلیٰ درجے کی مثنوی ہے۔ "ذوق نعت" میں اس کی شمولیت نارواتھی۔ اس کو علیحدہ کتابی شکل میں طبع ہونا چاہیے تھا۔

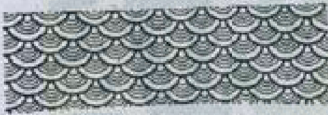
وسائل بخشش سے چند اشعار مندرجہ ذیل ہیں۔ ے

دلدار دامین خستہ حالاں ‏ فریادرس شکستہ حالاں
ہے یہ لطف شان مہربانی ‏ ہر وقت ہے سب کی میزبانی
کیوں دیر ہو سب یہاں ہیں موجود ‏ رحمت قدرت عطا کرم جود

سرکار میں کون سی نہیں شے ‏ ہاں ایک نہیں یہاں نہیں ہے
جانے کو ہیں یہ بلانے والے ‏ آتے ہوئے کو بلانے والے
سوتے کو یہ خواب سے جگائیں ‏ بیدار کو گھر پہ جاکے لائیں
امت کو دعا میں اس کو دیکھو ‏ دامان گدا میں اس کو دیکھو
اس ہاتھ کا نام ہے ید اللہ ‏ مَن عاهَدَهٗ یُعاهِدُ اللہ
گاہے یہ سر یتیم پر ہے ‏ گاہے یہ دل دو نیم پر ہے
بیمار کے واسطے عطا ہے ‏ ازہوں کے لئے یہ رہنما ہے
محتاجوں کے دل غنی کئے ہیں ‏ ہاتھوں میں خزانے بھر دیے ہیں

حسن بریلوی شمع محفل تھے

حاصل کلام یہ ہے کہ مولانا حسن رضا خاں حسن رحمۃ اللہ علیہ ایک غزل گو، نعت نویس، مثنوی نگار کی حیثیت سے باوقعت شاعر ہیں اور انہوں نے بریلی شریف میں جو شمع ادب روشن کی اس کے نور سے آئندہ نصف صدی تک شعراء فیضیاب ہوتے رہے۔



ماخوذ از: چند شعراء بریلی مطبوعہ ۱۹۷۶ء، لکھنؤ

حواشی

لے "گلدستہ بہار بے خزاں" از لطف اللہ بدوی، ماہنامہ قومی زبان کراچی، ص ۷، ۳-ص ۴۶ مئی ۱۹۶۸ء

ملے میر محمود علی نام عاشق تخلص تھا۔ بریلی کے باشندے تھے حسن سے تلمذ تھا۔ اور ان کے بہت چہیتے شاگرد تھے۔ ان کے ساتھ حسن کا سلوک اپنے بیٹوں جیسا تھا۔ پیشہ تجارت تھا۔ ان کے والد ٹوپیوں کی دکان رکھتے تھے۔ بہ حیثیت مجموعی مالدار آدمی تھے۔ حسن کے مطبع اہل سنت، روز افزوں اور بہار بے خزاں کے متعلق جملہ امور ان سے متعلق تھے، خوش گو شاعر تھے۔ ایک شعر بہ طور نمونہ یہ ہے۔ ے

مزہ جینے کا کچھ مل جائے دل کو عشق مرد گاں میں ‏ الٰہی ٹوٹ کر رہ جائیں یہ پھانسیں رگ جاں میں

سے مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی کے حالات زندگی دو ذرائع سے میسر ہوئے (الف) حیات اعلیٰ حضرت جلد اول ص ۲/۳ مکتبہ رضویہ کراچی۔ (ب) جناب حسنین رضا خاں بن حسن رضا خاں ساکن محلہ کانکر ٹولہ بریلی شریف۔

ھے ملفوظات، مولوی احمد رضا خاں، کتب خانہ رضویہ بریلی شریف

استاذ زمن کی نثری خصوصیات اور مشہور نثر نگاروں سے موازنہ

تحریر :- مرزا عبد الوحید بیگ رضوی، ۵۲ نجارپورہ بریلی شریف۔

امام احمد رضا فاضل بریلوی کے برادر اوسط استاذ زمن حضرت حسن رضا خاں حسن ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ مطابق ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو بریلی محلہ سوداگران میں پیدا ہوئے امام الاتقیا حضرت مفتی محمد نقی علی خانصاحب سے جملہ علوم و فنون کا اکتساب کیا امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی کی فیض صحبت سے جملہ فیوض و برکات سے مستفیض ہوئے۔ شعر و شاعری کی رغبت اوائل عمر سے ہی تھی اس زمانے میں داغ دہلوی کا طوطی بول رہا تھا لہٰذا داغ دہلوی کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے۔ شعر و شاعری کا ذوق سلیم آپ کے شعور و ادراک میں قدرتی طور پر تھا اس لئے جلد ہی فارغ الاصلاح ہوئے آپ کی جودت طبع اور علمی گہرائی اور خدا داد رنگ تغزل سے داغ دہلوی انتہائی متاثر تھے اور پیارے شاگرد کہہ کر مخاطب کرتے تھے آپ نے تمام اصناف سخن میں طبع آزمائی مگر آپ کی شاعری میں نیا موڑ اس وقت آیا جب امام احمد رضا فاضل بریلوی نے تحریک تجدید دین و تحفظ ناموس رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا آغاز کیا

حضرت استاذ زمن نے اپنی شاعری کے رخ کو تی سمت دی بہاریہ شاعری کو ترک کر کے اپنا مسلک شعری نعت گوئی اختیار کیا زبان و بیان پر پوری قدرت رکھتے تھے امام احمد رضا کی توجہ خصوصی تھی اس پر مستزاد یہ کہ زہد و تقویٰ علم و فضل اور عشق نبوی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم نے ان کے کلام میں حلاوت عطا کی وہ صف شاعری کے قادر الکلام اساتذہ میں شمار کئے جاتے تھے بریلی کی تاریخ شاعری میں کسی استاذ کو اتنے کثیر تعداد میں شاگرد میسر نہ ہوئے جتنی کثیر تعداد میں استاذ زمن کے شاگرد تھے۔

نکاح مسنون

استاذ زمن کے جد امجد حضرت شجاعت جنگ محمد سعید اللہ خاں قندھاری کے فرزند سعادت یار خاں تھے، جن کے تین فرزند محمد اعظم خاں۔ محمد معظم خاں۔ اور مکرم خاں تھے محمد اعظم خاں صاحب کی نسل میں حضرت استاذ زمن تھے۔ اور محمد اعظم خاں صاحب کے برادر اوسط محمد معظم خاں کے فرزند اعظم خاں اُن کے فرزند علیم اللہ خاں کی دختر اصغری بیگم کے ہمراہ آپ کا عقد مسنون ہوا۔ گویا استاذ زمن محمد اعظم خاں صاحب مرحوم کے فرزند نسبی تھے۔ تو محمد معظم خاں کے فرزند نسبتی۔

استاذ زمن کے تین شہزادے حکیم حسین رضا خاں علامہ حسنین رضا خاں اور فاروق رضا خاں تھے۔ لیکن آپ کی نسل حکیم حسین رضا خاں صاحب اور علامہ حسنین رضا خاں صاحب سے چلی فاروق رضا خاں صاحب لاولد فوت ہوئے علامہ حسنین رضا خاں صاحب کو اللہ نے تین فرزند اور دو دختران عطا کیں۔ دختر اصغر مخدومہ حضرت علیا ہیں جنکو حضرت علامہ ازہری میاں کی زوجہ ہونے کا شرف حاصل۔ علامہ حسنین رضا خاں صاحب کے شہزادہ اکبر علامہ سبطین رضا خاں صاحب رشد و ہدایت میں مصروف ہیں

اور دوسرے شہزادے صدر العلماء حضرت علامہ تحسین رضا خاں
صاحب علم وفضل حال وقال احوال واشغال میں اپنے اسلاف کا
مکمل نمونہ ہیں تیسرے شہزادے مولانا حبیب رضا خاں سے
مرکزی دار الافتا سوداگران بریلی سے منسلک ہیں۔ اللہ تعالٰے
سلسلہ کو برقرار رکھے اور اپنے اسلاف کی تقلید کی توفیق عطا
فرمائے

حسن انتظام

حضرت استاذ زمن علامہ حسن رضا خاں صاحب کے اپنے برادران
سے تعلقات انتہائی مشفقانہ تھے جسکی مثال شاذ ونادر ہی
ملتی ہے امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے آپ سے
دست راست تھے دار العلوم منظر اسلام کے پہلے مہتمم آپ
ہی تھے آپ کے دور اہتمام میں دار العلوم عالی منازل پر
پہونچا۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی کی علمی مشغولیت
اور دینی خدمات میں انہماک مقتضی تھا کہ آپ کا کاروبار
دنیا سے فارغ کر دیا جائے تاکہ یکسوئی سے آپ تجدید
دین اور تحفظ ناموس رسالت کے فریضہ کو انجام دیتے رہیں
جاگیر کا کامل انتظام استاذ زمن کے ذمہ آیا آپ نے
اس کو اس خوش اسلوبی سے انجام دیا کہ امام احمد رضا
فاضل بریلوی کو معاملات جاگیر کی فکر لاحق نہ ہوتی حتی کہ
گھر کے تمام انتظامات غلہ کپڑا تعمیر ومرمت کا بندوبست
بھی آپ ہی کرتے امام احمد رضا فاضل بریلوی کے شہزادہ
اکبر حضرت حجۃ الاسلام اور دو شہزادیوں کی شادی کے
جملہ انتظامات آپ کی ہی نگرانی میں انجام پائے شادیوں
سے متعلق تمام ضروریات فراہم کرنے کے بعد استاذ زمن
نے امام احمد رضا سے شہزادیوں کی شادی کی تاریخ
مقرر کرنے کے لئے عرض کیا تو امام احمد رضا کا ارشاد
اور استاذ زمن کا جواب ملاحظہ فرمائیے

اعلیٰ حضرت قبلہ نے ارشاد فرمایا کہ بیٹی
کی شادی کوئی آسان کام نہیں نہ کہ ایک
ساتھ دو بیٹی کی شادی میں لوگ بڑے
ساز وسامان کرتے ہیں تم نے کچھ ضروری
سامان بھی کرلیا ہے یا مجھ سے تاریخ
مقرر کرانے آگئے ۔۲

معاملات دنیا سے امام احمد رضا فاضل بریلوی کس قدر
بے نیاز تھے مذکورہ گفتگو سے بآسانی اندازہ لگایا جا
سکتا ہے اب ذرا استاذ زمن علیہ رحمۃ کا جواب ملاحظہ
فرمائیے۔ جس سے بخوبی واضح ہوتا ہے کہ آپ اعلیٰ درجہ
کے منتظم بھی تھے اور امام احمد رضا فاضل بریلوی کو دینی
خدمات انجام دینے کے لئے کتنی فارغت دے رکھی تھی

مولینا حسن رضا خاں نے عرض کیا کہ سامان
کی تیاری کے متعلق آپ بھابی جان سے
دریافت فرمایئے اعلیٰ حضرت نے ان سے
فرمایا کہ بیٹیوں کی شادی کے لئے کیا کیا
سامان تیار ہوگیا اور کیا کمی رہ گئی ہے؟
بی بی صاحبہ نے عرض کیا کہ ہمارے پاس تو
مسالے بھی پسے تیار رکھے ہیں دونوں
کے جہیز مکمل ہوگئے برات میں کھانے والے
کا کل سامان مہیا ہوچکا ہے صرف تاریخ کی
دیر ہے ۔۳

یہ تو حال رہا۔ استاذ زمن کی اپنے برادر سے شفقت و
انسیت اور انتظامی حسن نیز صلاحیت کا حال اب ذرا
امام احمد رضا فاضل بریلوی کے تاثرات بھی استاذ زمن
سے متعلق ملاحظہ فرمایئے اور اسکی روشنی میں استاذ زمن
کے مرتبہ کو ذہن نشین کرلیجئے۔

اعلیٰ حضرت نے جب بی بی صاحبہ کے الفاظ
سنے تو وفور مسرت آبدیدہ ہوکر فرمایا حسن
میاں (استاذ زمن کی عرفیت) تم نے مجھے
دنیا سے بالکل بے نیاز کر دیا میری بیٹیوں
کی شادیاں ہیں میں ان کا باپ ہوتے ہوئے
بالکل بے خبر اور آزاد بیٹھا ہوں تم نے مجھے
یہ سوچنے کی بھی زحمت نہ دی کہ جہیز میں کیا
کیا دیا جائے گا اور وہ کہاں کہاں سے
فراہم ہوگا یا یہ کہ برات میں جو کیا کیا کھانے
دیئے جائیں گے، آبدیدہ ہوکر فرمایا کہ

حسن میاں جو کچھ میں دین کی خدمت کر رہا ہوں
اس کے اجر میں ان اللہ حصہ دار تم بھی ہو اس
واسطے کہ تمہیں نے مجھے دینی خدمات کے لئے
دنیا سے آزاد کر دیا ہے ۔

استاذ زمن علیہ الرحمۃ کس منصب و مرتبہ کے مالک تھے امام احمد رضا فاضل بریلوی کی آراء مقدسہ حرف آخر ہیں استاذ زمن اعلیحضرت سے غایت درجہ محبت کرتے تھے اور جانتے تھے کہ یکسوئی سے وہ تجدید دین کا انجام دیتے ہیں اس لئے امام احمد رضا فاضل بریلوی کی تمام ضروریات کا خیال رکھتے تھے چھوٹی چھوٹی ضرورتوں پر ان کی نظر رہتی تھی اور ان کو پورا کیا کرتے اس سلسلہ میں حضرت علامہ حسنین رضا خاں کا بیان ملاحظہ فرمائیے ۔

مولینا حسن رضا خاں مرحوم کا یہ عمل بھی مدتوں
جاری رہا کہ ہفتہ عشرہ میں اپنے یہاں سے
دو قلم بنا کے لے جاتے اور اعلیحضرت
کے قلمدان میں رکھ آتے اور ان کے گھسے
ہوئے قلم خود لے آتے ۔ ۴؎

استاذ زمن علیہ الرحمۃ نے انتہائی مصروف زندگی گذاری جاگیر کا انتظام و انصرام گھریلو سامان و اسباب کی فراہمی دار العلوم منظر اسلام کا اہتمام اس کے ساتھ ہی شعر و سخن کی مشق کے علاوہ تصنیف و تالیف میں شغف گویا آپ کی شخصیت ہمہ گیر اوصاف کی حامل تھی یہی وجہ ہے کہ اپنی عظیم اور گوناں گوں ذمہ داریوں کو تا حیات ظاہری ادا کیا مگر کبھی برادران کو کوئی کمی محسوس نہ ہوئی کہ حرف شکایت زبان پر آتا ۔

شعر و سخن

آپ کے اشعار پُر مغز و کیف آور وجد آفریں ہوتے تھے رئیس المتغزلین حسرت موہانی کا خیال ہے کہ،

آپ نے اپنے انداز سخن کو استاد داغ
کے رنگ کلام سے اس قدر مشابہ بنا دیا
کہ اکثر داغ اور حسن (استاد زمن) کی
شاعری میں فرق مشکل ہو جاتا ہے ۵؎

استاذ زمن کی شاعرانہ صلاحیتیں مسلّمہ تھیں اردو کے معروف نعت گو شاعر محسن کاکوروی سے بھی آپ نے داد تحسین حاصل کی ۶؎ چونکہ آپ نے بہار کا رنگ ترک کر دیا تھا اور مجازی شاعری سے اجتناب کر لیا تھا اسی لئے آپ نے اپنی حیات ظاہری میں "ثمر فصاحت" شائع نہیں کیا ۷؎ آپ کی وفات کے بعد آپ کے بہاریہ کلام پر مشتمل مجموعہ غزل "ثمر فصاحت" کے نام سے آپ کے شاگرد سید برکت علی نامی بریلوی نے ۱۳۲۶ھ میں شائع کیا آپ کا مجموعہ نعت "ذوق نعت" معروف بہ صلۂ آخرت زیر طبع تھا کہ زیارت حرمین سے واپسی پر ۱۳۲۶ھ میں آپ کا وصال ہو گیا اپنے والد کی آخری آرام گاہ کے قریب دفن ہوئے امام احمد رضا فاضل بریلوی نے نماز جنازہ پڑھائی اور قبر انور میں اپنے دست اقدس سے رکھا

استاذ زمن حضرت علامہ حسن رضا خاں صاحب ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے وہ ایک جید عالم باعمل صاحب تقوی و ورع عابد شب بیداری کے علاوہ قادر الکلام شاعر اور صاحب طرز و اسلوب نثر نگار بھی تھے ان کی نثر میں الفاظ کی بازیگری نہیں ملتی ہے وہ اپنی بات کو اس خوبی سے الفاظ کا پیراہن پہناتے ہیں کہ ناظر اس کو پڑھ کر اثر لئے بغیر نہیں رہتا گویا ان کی نثر اثر اور تاثر سے پڑھتے اردو نثر میں آپ کی یادگار مندرجہ ذیل تصانیف ہیں ۔

(۱) تزک مرتضوی در اثبات تفضیل شیخین ــــــ
(۲) نگارستان لطافت در ذکر میلاد شریف ــــــ
(۳) بے موقع فریاد کا جواب در مسئلہ قربانی ــــــ
(۴) آئینہ قیامت ذکر کربلا معلیٰ ــــــ
(۵) دین حسن در حقانیت اسلام ــــــ
(۶) وسائل بخشش در ذکر کرامات غوث اعظم ــــــ
(۷) قہر الدیان علی مرتد بقادیان ۔ ــــــ

استاذ زمن علامہ حسن بریلوی کی مذکورہ بالا تصانیف کے متعلق حسرت موہانی تحریر کرتے

کہ انکی ابتدائی چھ کتابیں آپ کے زمانہ حیات
میں چھپ کر مقبول خاص و عام ہو چکی تھیں ۸؎

استاذ زمن کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں مگر رسم کے مطابق بعد تعارف اپنے اصل موضوع "استاذ زمن کا اردو نثر نگاری میں مقام و مرتبہ" پر گفتگو کرنے سے قبل اردو نثر کے آغاز و غایت پر بحث کر لینا ضروری ہے تاکہ استاذ زمن علامہ حسن بریلوی کے مقام و مرتبہ پر ٹھیک طور پر گفتگو کی جا سکے

اردو نثر کا آغاز

دنیا کی تمام زبانوں کا آغاز نظم سے ہوا اور نثر بعد کو معرض وجود میں آئی ہے اس لسانی ضابطہ کے مطابق اردو نثر بھی اردو نظم کے بعد معرض وجود میں آئی ہے اردو نثر کی کتاب حضرت نظام الدین اولیاء کے خلیفہ خواجہ نصیر الدین چراغ دہلوی کے سب سے اہم شاگرد و خلیفہ حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز "معراج العاشقین" ہے اس کے علاوہ سات آٹھ چھوٹی بڑی دیگر تصانیف سے بھی ان سے منسوب ہیں جن میں شکار نامے اور جبدہ اور جو زیادہ مشہور ہیں معراج العاشقین ۱۴۲۲ء میں تصنیف کی گئی تھی۔ وے حضرت خواجہ بندہ نواز گیسو دراز کے پوتے خواجہ عبداللہ حسینی مشہور بزرگ اور شیخ طریقت ہوئے ہیں انھوں نے "نشاط العشق" کا اردو نثر میں ترجمہ کیا پندرہویں صدی عیسوی میں شمس العشاق میران جی نے "مرغوب القلوب" کا ترجمہ اردو میں کیا اور ان کے فرزند و جانشین شیخ امین الدین علی نے اردو نثر میں "گنج مخفی" اور "وجود یہ" تصنیف کی ان ابتدائی نثر نگاروں کی روایت کو میران جی خدا نما، شاہ محمد قادری، سید میران حسینی اور شاہ معظم نے ترقی دی۔ بعدہ ایک طویل سلسلہ ان مصنفین کا ہے جنھوں نے اردو نثر کو ترقی یافتہ زبان بنایا۔

اردو نثر کی غایت

ہندوستان میں ایران ترکی، اور عرب سے آنے والے مسلمانوں کی مادری زبان فارسی اور عربی تھی جس کو ہند کے قدیم باشندے نہیں جانتے تھے یہ وہ دور تھا جب کہ ہندوستان بری طرح طبقاتی کشمکش کا شکار تھا انسان انسان کے درمیان تفریق نے انسانی معاشرہ کو حیوانی عیوب کی آماجگاہ بنا رکھا تھا انسان شقی القلبی کی اس حد کو پہونچ چکا تھا اور فہم و ادراک کا دیوالیہ پن اتنا بڑھ چکا تھا کہ ایک طرف تو ہندوستانی معاشرہ میں شجر و حجر کے علاوہ جانوروں کی پرستش کی جاتی تھی اور دوسری طرف جنم کے بنیاد پر مالی و اقتصادی پستی کے شکار انسانوں کو انسانی معاشرہ میں زندہ رہنے کا بھی حق نہیں دیا جا رہا تھا۔ ذات و برادری کی بنیاد پر حیوانیت کو فروغ دیکر فخر محسوس کیا جاتا تھا ماندہ قرار دی گئی اقوام کو نہ صرف علم حاصل کرنے سے روک دیا گیا تھا بلکہ ان کو شاہراہ عام پر چلنے کی اجازت نہیں تھی جنم کی بنیاد پر علی ذات ہی پیدا ہونے والوں پر پس ماندہ اقوام کے جسم کا سایہ بھی ان کو آدھرم کر دیتا تھا۔ بے چارہ سڑک پر چلتا تو ٹوٹے بانس سے کھٹ کھٹ کرتے جاتا تاکہ شاہراہ عام پر چلنے والے اونچی ذات کے لوگ اس کے سایہ سے اپنے جسم کو بچالیں ایسے انسانیت سوز ماحول میں اسلام کے ماننے والے جنکے یہاں انسانیت نوازی۔ اخوت، مساوات کا دور دورہ تھا کب انسانیت کو برباد ہوتے دیکھ کر خاموش بیٹھ سکتے تھے ایسے حالات میں نوآبادکار مسلمانوں نے انسان کو انسانیت کی تعلیم دینے کیلئے ایسی زبان تیار کی جو ملک کے قدیم باشندوں اور ان کے درمیان باہمی رابطہ کی زبان کا کام دے سکے۔ گویا اردو زبان کا آغاز مبلغین اسلام نے ہندوستان کے قدیم باشندوں کو دعوت اسلام دینے کے لئے کیا تھا اردو نثر کا آغاز جیسا کہ پیشتر لکھا جا چکا ہے۔ پندرہویں صدی عیسوی میں ہو چکا تھا اور سولہویں صدی عیسوی تک اردو زبان سارے ملک میں پھیل چکی تھی اس زبان میں تصنیف و تالیف کا آغاز ہو چکا تھا تصنیف و تالیف کی غرض و غایت کی طرف ہم اوپر اشارہ کر چکے ہیں۔ مگر اپنے دعویٰ کی تائید میں مندرجہ ذیل شہادت پیش کرتے ہیں۔

سید احتشام حسین مبلغین اسلام یعنی حضرت خواجہ بندہ نواز وغیرہ کی تصانیف کی غرض و غایت کے متعلق لکھتے ہیں

(۱) ان کے لکھنے یا قریب کرنے کی تحریک ادبی نہیں تھی بلکہ اپنے مذہبی اور صوفیانہ خیالات اپنے پیروں تک پہونچانے کی خواہش سے پیدا ہوئی۔ (۱)

(٢) اس درمیان (یعنی پندرہویں اور سولہویں صدی عیسوی میں بیشتر مذہبی کتابیں لکھی گئی ہیں[11]

(٣) جنوبی ہند میں خانقاہیں قائم کر کے اور عام بول چال کی زبان میں اظہار خیال کر کے صوفیانہ خیالات کی اشاعت بڑے پیمانے پر کی ہے[12]

(٤) اس طرح کی تخلیقات (تصانیف) زیادہ تر مذہبی اور صوفیانہ ہیں[13]

(٥) اردو نثر کی تصانیف کی غرض وغایت یہ تھی کہ وہ تقریباً چونتیس سال تک عرب میں گذار کر ہندوستان آئے اور بیجاپور قیام کے لئے منتخب کیا یہیں سے انہوں (میران جی) نے تبلیغی کام کا آغاز کیا ہے[14]

اردو نثر کو فروغ دینے کی غرض وغایت تبلیغ اسلام تھی تاکہ اہل ہند کو اسلام کی نعمت دیکر اچھا انسان بنایا جائے (اچھا مسلمان ہی اچھا انسان ہو سکتا ہے) چنانچہ تبلیغ اسلام کو فروغ دینے کے لئے علماء صوفیاء اور مشائخ نے مسلسل اردو نثر میں تصانیف کیں اور ان کی کاوشوں سے اردو نثر نشو ونما پا کر ارتقاء کی اعلیٰ منزل پر پہونچی انیسویں صدی تک اسلام کا علمی اور دینی سرمایہ اردو زبان میں بڑی حد تک منتقل ہو چکا تھا اردو نثر پر امام احمد رضا فاضل بریلوی کا احسان عظیم ہے کہ انھوں نے اردو نثر کو معیاری بنا کر مختلف علوم وفنون پر کتب تصنیف کر کے اردو زبان کو دیگر ترقی یافتہ زبانوں سے آنکھ ملا کر بات کرنے کے قابل بنایا آج عالم اسلام میں امت مسلمہ کے پاس کوئی ایک فرد امام احمد رضا فاضل بریلوی کے علاوہ نہیں ہے جس نے اسلامی علوم وفنون کو بالخصوص حدیث وفقہ کو اردو نثر میں منتقل کر کے اہل اردو کو قدیم زبانوں کی کتب سے مستغنی کر دیا۔

فورٹ ولیم کالج

اردو نثر میں کئی صدیوں تک مذہبی کتب تصنیف کر کے علماء صوفیاء اور مشائخ نے اہل ہند کو نعمت ایمان اور دولت اسلام عطا کی اردو کے محسنین اول نے اردو نثر کا آغاز جس مقصد کے حصول کے خاطر کیا تھا اس کو فوت کرنے کے لئے مئی ١٨٠٠ء میں فورٹ ولیم کالج کلکتہ میں انگریزوں نے قائم کیا کالج مذکورہ نے اہل اردو کی توجہ مذہب سے ہٹا کر ذہنی تفریح کی طرف لگانے کے لئے دیوؤں، بھوتوں، پریوں وغیرہ کی مافوق الفطرت فرضی کہانیوں اور قصوں پر مبنی کتب تصنیف کرائیں اس کام کو فروغ دینے کے لئے دہلی، لکھنؤ وغیرہ میں بھی آزاد مزاج لوگوں کو آمادہ تصنیف کیا مذہب اسلام کی طرف سے توجہ ہٹانے کے ساتھ ہی اصلاح وسدھار کے نام پر سر سید نے اردو نثر میں تصنیفی سلسلہ شروع کر کے اسلامی تہذیب وتمدن معاشرت کا نہ صرف مذاق ہی اڑایا بلکہ حشر ونشر جنت دوزخ ملائکہ کا بھی انکار کیا امت مسلمہ کے متفقہ عقائد پر شب خون مارا جانے لگا۔

افسوس اردو نثر جس مقدس مشن کو کامیاب بنانے کے لئے معرض وجود میں آئی تھی۔ وہی اردو نثر آج اسلام کی بیخ کنی کے لئے استعمال کی جانے لگی تھی شعوری وغیر شعوری طور پر طوطا مینا قسم کی فرضی کہانیوں کے لکھنے والا نے بھی مقدس مشن سے قوم کو ہٹانے کی جسارت کی اصلاح وسدھار کے نام پر مسلم معاشرہ کو مغربیت میں غرق کرنے کے لئے اردو نثر کا استعمال بر ملا کیا جانے لگا

اردو نثر کی آبرو

اس پس منظر کو ذہن میں رکھ کر سوچیے! اسلام کے بہی خواہ وہمدرد مبلغین اسلام جس کو اللہ تعالیٰ نے تبلیغ اسلام کے لئے مخصوص کیا تھا وہ کیونکر اسلامی عقائد کو پارہ پارہ ہوتے دیکھ کر خاموش تماشائی بنے رہ سکتے تھے ان مبلغین اسلام میں شاہ فضل حق خیر آبادی، مفتی صدر الدین، مفتی سعد اللہ، مولانا امام بخش صہبائی، مولانا فضل رسول بدایونی، مفتی محمد نقی علی خاں بریلوی، امام احمد رضا فاضل بریلوی اور استاذ زمن حضرت علامہ حسن رضا خاں حسن بریلوی قابل ذکر مصنف ہیں۔

جنہوں نے قوم کو گمراہی سے بچانے کے لئے اپنے قلموں
کو جنبش دی جہاں انھوں نے عقائد اسلامی پر آنچ نہ آنے
دی وہیں اردو نثر کی آبرو بھی بچائی انگریز اور اس کے
اعوان والانصار نے اردو نثر کو جس راہ سے ہٹانے کی
کوشش کی تھی ان بندگان خدا نے اردو نثر کو پھر صحیح سمت
کی طرف رہنمائی کرکے اردو نثر کے معرض وجود میں لانے
کی غرض وغایت کو پورا کیا۔

استاذ زمن علامہ حسن رضا خاں کی نثری تصانیف
کا جائزہ لیجئے تو بخوبی واضح جذبات کو پروان چڑھانے
حضور نبی اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی عزت وعظمت عشق
ومحبت سے سینوں کو لبریز کرنے کے لئے ہی اردو نثر کا
سہارا لیا۔ گو یا کہ آپ کی تصانیف کی تعداد کم ہے۔ مگر پس
منظر کو سامنے رکھ کر غور کریں تو اہمیت وافادیت بہت
زیادہ ہے انھوں نے اپنے دور کی مذہبی ضرورت کو پورا
کرنے کے لئے اردو نثر کو شرف سلامت روی بخشا۔

استاذ زمن نے انگریز اور اس کے حواریوں کی
پھیلائی ہوئی گمراہی کو زائل کرنے کے علاوہ زمانہ حال کے
سیاست دانوں کی پھیلائی گمراہی کو دور کرنے کے لئے
بھی اپنی قلم کو استعمال کیا۔ اہل سیاست کے مکر وفریب کو
آشکار کرنے کے لئے بے موقع فریاد کا جواب درمسئلہ
قربانی تصنیف کی جس سے واضح ہوتا ہے استاذ زمن کی
اہل سیاست پر گرفت سخت تھی راہ سیاست سے جب
مذہب اسلام پر شب خون مارا گیا تو عابد شب بیدار کو اسلام
کی محافظت کے لئے مستعد پایا۔

دشمنان اسلام نے مسلمانی لبادہ اوڑھ کر اسلام کو
آؤٹ آف ڈیٹ قرار دیا تو استاذ زمن نے ان کے باطل
نظریات کو رد کرنے کے لئے "دین حسن در حقانیت اسلام"
لکھ کر اردو نثر کو جدید طرز تخاطب کیا تھا۔ مولوی چراغ دہلوی
اور سرسید اینڈ کو پیدا کی گئی گمراہی کو جدید اردو نثر کے لبادے
میں پیش کیا گیا اسلام کی بے ادبی کو ادب اور روکھی سوکھی
زبان اور پھیکے بیان کو جدید اردو نثر باور کرا کر گمراہ کردہ
کے کرتوں پر پردہ ڈالنے کی کوشش کی گئی جس طرح کو

جدید اردو نثر لکھا گیا۔ حقیقت میں وہ جدید نہیں بلکہ
فصیح وبلیغ شستہ وشگفتہ زبان اردو کو روکھی سوکھی اور پھیکی
زبان بنا کر اردو کی شان پر بٹہ لگانے کی مذموم کوشش
ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مولینا فضل حق خیرآبادی کی ہدایت
پر غالب دہلوی نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی۔ مگر
پریس اور انگریزی حکومت کی قوت کے بل بوتے اس کا
سہرہ سرسید نے باندھ دیا گیا اور مخلص دولہا صرف
شکایت بھی زبان پر نہ لایا۔

اب نے سرسید کے سر جدید اردو نثر کا سہرہ باندھنے
والو سنو ان کے طرز تحریر پر ادب اردو نثر کا نقاد کیا
کہتا ہے۔

> ان کا (سرسید) طرز تحریر زوردار مگر صاف
> اور سادہ ہے اس میں کسی قسم کی عبارت سے
> آرائی نہیں ہے کچھ غلطیاں بھی اس میں نکلیں
> گیں مگر سید صاحب قواعد صرف ونحو کی پابندی
> کی قطعی پرواہ نہیں کرتے وہ مقررہ قواعد
> انشاپردازی سے بالکل بے نیاز تھے ۱۵

لیجئے قواعد صرف ونحو سے مطلق ناواقف قواعد انشاء
سے بالکل بے خبر غلط عبارت لکھنے والے کو جدید اردو
نثر کا بانی کہا جانے لگا جانبداری ہو تو اس ڈھٹائی سے
اور انصاف کا خون کیا جائے تو ایسی صفائی سے حقیقت
یہ ہے کہ جدید اردو نثر کے بانی سرسید نہیں ہیں ان کی
نثر قواعد واصول کے تحت عیوب ونقائص کا ڈھیر ہے روکھی
سوکھی اور پھیکی زبان کو جدید اردو نثر نہیں کہا جاسکتا ایک
عامی بھی تو روز بول چال میں سادہ زبان روکھے پھیکے
انداز میں بولتا ہے تو پھر یوں کہئے کہ سرسید ایک عامی
آدمی تھے جو جہلا کی مانند روکھی پھیکی زبان کا استعمال کرتے
ہیں۔

صداقت اپنے آپ کو منوالیتی ہے یہ بھی ایک
تاریخی صداقت ہے کہ غالب نے جدید اردو نثر کی بنیاد ڈالی
اور جلد ہی اس دنیا سے راہ لی مگر اس بنیاد پر اردو
نثر کا عالی شان قصر استاذ زمن علامہ حسن رضا خاں صاحب

ستعیر کیا ہمارے اس پر دعویٰ پر انکی تصانیف شاہد ہیں
یہاں یہ بات قابلِ غور ہے کہ دینیات کا عالم عربی وفارسی
کا ماہر جس کے گھر سے باہر تک ایسا ماحول ہو جہاں عربی
وفارسی مادری زبان ہو قدیم کتب زیر مطالعہ ہوں جن
میں صنائع وبدائع کی بھر مار ہو انداز تکلف ہو اور اس
طرز کو اپنانے والوں کی گرد پیش بھی بھر مار ہو ایسے
ماحول میں اپنے زمانے کی مروجہ طرز تحریر سے اپنے دامن
کو بچا کر جدید طرز اختیار کرنا انتہائی اہم بات ہے بس
یہی کہا جاسکتا ہے کہ یہ فیضان رضا ہے اس خصوصیت
کا حامل اردو لسانیات کا ماہر اور زبان وبیان کا با اختیار
ادیب شہیر ہی ہوسکتا ہے جس کو اظہار بیان پر قدرت
کاملہ حاصل ہو۔

نثر کی خصوصیات

استاذ زمن حضرت علامہ
حسن رضا خاں صاحب

حسن بریلوی کی نثری تصانیف کا غیر جانبدارانہ مطالعہ
کرنے والا بر ملا وثوق سے کہہ سکتا ہے کہ استاذ زمن
صاحب طرز واسلوب نثر نگار ہے ان کی نثر کی خصوصیت
پر بے لاگ تبصرہ اس طرح کیا جاسکتا ہے
استاذ زمن نے اپنی نثر میں عربی وفارسی کے
الفاظ بکثرت اس خوبی سے استعمال کئے ہیں کہ ان کی نثر بوجھل
وثقیل یا ادق نہیں بنی بلکہ ان کی نثر میں رنگینی شاعرانہ
حد تک ہے جس نے بیان کو زوردار باثر اور معیاری
بنا دیتا ہے وہ اکثر چھوٹے چھوٹے جملے روزمرہ کی
بول چال میں آسان مگر پر کیف انداز میں مدلل طریقہ سے
لکھتے ہیں وہ اپنے مقصد کو بخوبی زوردار انداز میں سے
لکھتے ہیں ان کا ہر ایک لفظ اور ہر ایک فقرہ نپا تلا ہوتا
ہے یعنی غیر ضروری الفاظ کا استعمال ان کے یہاں نہیں
ملتا ان خصوصیات پر مستزاد یہ کہ ان کی نثر صرفی ونحوی
عیوب ونقائص سے پاک ہے وہ الفاظ کا ٹھیک طور
پر عمدگی سے برمحل استعمال کر کے اپنی نثر کو پُر اثر بنا دیتے
ہیں وہ الفاظ کے موزوں استعمال سے پُر اثر فضا بنا کر
اظہار جذبات اس طرح کرتے ہیں کہ سماں بندھ جاتا ہے
اور ناظرین سماں میں اپنے کو محو کرنے سے روک نہیں پاتے ہیں
اثر آفرین کی بہترین نثر انھوں نے لکھی ہے وہ اپنے اس
فن میں باکمال ادیب ہیں اپنے ہمعصر ادباء کے برخلاف
آپ نے عربی وفارسی کے ادق ناموزوں الفاظ کا کبھی
استعمال نہیں کیا وہ جس لفظ سے جس محل پر جیسا کام لینا
چاہتے ہیں اس کو بڑی عمدگی سے استعمال کرکے
زوردار طریقہ پر کام لے لیتے ہیں اس لئے ان کی
نثر جوش اور زوردار ہے ان کی نثر جذبات کی گرمی
اور افکار کی سنجیدگی کا حسین امتزاج ہے ایک مفکر
کو جس زود اثر زور کی ضرورت ہے وہ ان کی نثر میں
بدرجہ اتم موجود ہے ان کے مضامین انتہائی فکر انگیز
جاندار بصیرت افروز اور پُر اثر ہوتے ہیں ان کے
یہاں سادگی ہے۔ سلامت ہے تصنع وتکلف ان
کی نثر میں نہیں وہ بے تکلف لکھتے ہیں مگر ابتذال
اور سوقیت سے ان کی نثر کا دامن پاک ہے ان
کی تہ در تہ پہلو دار نثر ہی ادبی شان ہے انھوں نے
انتہائی سلیس وروان اور رنگینی نثر میں جاندار زبان
معنیٰ خیز انداز میں استعمال کی ہے اس لئے بجا طور پر
ہم فخر سے کہہ سکتے ہیں کہ جدید اردو نثر کو رواج
عام اور مقبولیت عطا کرنے میں ان کا اہم کردار ہے
ان کا اردو نثر پر یہ بہت بڑا احسان جسکو اہل اردو
کبھی فراموش نہیں کرسکتے ہیں۔

اقسام نثر

حضرت استاذ زمن علامہ
حسن رضا خاں حسن بریلوی

کی نثری خصوصیات سے بحث نہ کی جائے تو تشنگی باقی
رہتی ہے اس ادبی تشنگی دور کرنے کے لئے اقسام
نثر کو ذہن نشین کرلینا از حد ضروری ہے۔
الفاظ کے لحاظ سے نثر کی چار اقسام ہیں [17]
(۱) نثر مرجز (۲) نثر مقفیٰ (۳) نثر مسجع (۴) نثر عاری
[17]
معنی کے اعتبار سے نثر کی دو قسمیں ہیں [19]
(۱) نثر سلیس (۲) نثر دقیق ۔ [19]

نثر سلیس کی بھی دو قسمیں ہیں۔

(۱) نثر سلیس سادہ (۲) نثر سلیس رنگین

اور نثر دقیق کی بھی دو اقسام ہیں۔

(۱) دقیق سادہ (۲) دقیق رنگین [20]

استاذ زمن حضرت علامہ حسن رضا خاں حسن بریلوی عربی و فارسی کے علاوہ اردو کے بھی مسلم الثبوت استاد قادر الکلام اور صاحب طرز انشا پرداز تھے اس لئے انھوں نے اپنے مطالب و مفاہیم کو واضح کرنے کے لئے ہمہ اقسام کی نثر کا استعمال کیا اس لئے ان کے تصانیف میں ہمہ اقسام کے نثری شاہکار موجود ہیں۔ لہذا استاذ زمن کے نثری شاہکاروں کو ہم اپنے مضمون کی زینت بنا رہے ہیں تاکہ استاذ زمن کی نثر نگاری پر مکمل طور پر فن کے اعتبار سے بحث کی جاسکے۔

(۱) **نثر مرجز** کا حسنی شاہکار ملاحظہ فرمائیے۔

"سیاہ پردے کی چلمن سے کسی محبوب دلنواز کی پیاری پیاری تجلیاں چھن چھن کر نکل رہی ہیں جن کی ہوشربا تاثیروں دلکش کیفیتوں نے یہ مجلس آرائیاں ہیں" [21]

اردو نثر کے جدید و قدیم تمام سرمایہ کو کھنگال ڈالئے [22] استاذ زمن کے دست کرامت کے ادبی شاہکار کی کہیں آپ مثال تلاش نہ کرسکیں گے یا نثر مرجز کی اردو کے نثری سرمایہ ہی لاتعداد مثالیں ملیں گی مگر استاد زمن نے جس سادگی اور صفائی سے اپنی عبارت کو حسین بنایا۔ وہ حسن عبارت آپ کہیں نہیں پائیں گے۔

(۲) **نثر مقفی** دہلی اور لکھنو دونوں اسکولوں کے ادیبوں نے نثر مقفی کا استعمال کیا ہے بلکہ انیسویں صدی عیسوی میں تو نثر مقفی کی بھرمار تھی آج تمام نقادان فن کو اعتراف ہے کہ نثر مقفی کے استعمال نے ادیبوں کو اظہار مقصد سے دور ہٹا دیا نثر نگاری الفاظ کی بازی گری بن گئی تھی اردو کی نثر مقفی خود نقادان فن کے اس تبصرہ پر شاہد ہے مگر استاذ زمن کی ذات ستودہ صفات اس نقص سے مستثنیٰ ہے استاذ زمن نے نثر مقفی کا استعمال کیا اور اپنے پیش رو اور ہمعصر ادیبوں سے بالکل مختلف انداز میں کیا جس کے باعث ان کے نثر کے مفاہیم مجروح نہیں ہوئے وہ اظہار مقصد میں ایسی مہارت تامہ رکھتے ہیں کہ ہمہ اقسام نثر انکے دولت فن پر دست بستہ خدمت کو حاضر رہتی ہے بلکہ یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ استاذ زمن نے نثر مقفی کی آبرو رکھ لی اور اس نظریہ کو غلط ثابت کر دیا کہ نثر مقفی اظہار مقصد کے لئے کافی نہیں ہے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اردو کے ادیب عموماً نثر مقفی پر قدرت کاملہ نہیں رکھتے تھے اس لئے اپنے مقصد کا اظہار نثر مقفی کے ذریعہ کرنے سے قاصر رہے گویا نقص ادیبوں کا تھا الزام نثر مقفی کے سر رکھ دیا گیا۔ اردو کے ادیب متحدہ آواز اٹھا کر ہمارے نظریہ پر احتجاج کریں اور اپنی قدرت کاملہ پر اصرار کریں تو ہم ضرور کہیں گے جس غزل پر اردو کے ادیب مجبور محض ہوجاتے ہیں وہاں استاذ زمن اپنے قلم کا اقتدار جمائے شہنشاہ ادیب تاج زریں پہنے اپنی امتیازی شان سے اپنے فن کا سکہ جماتے ہیں استاذ زمن کی نئی شان وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

(الف) دل کہتا ہے مر جائیے مگر یہاں سے قدم اٹھائیے
صبح کے کھٹکے کا تقاضہ ہے جلد تشریف لے جائیے [23]

(ب) [24]
جب وطن قدموں پر لوٹتی ہے کہ کہاں جاتے ہو
غربت دامن کھینچتی ہے کیوں دیر لگاتے ہو [25]

مثال نمبر (الف) میں استاذ زمن نے دونوں جملے ہم قافیہ لکھے ہیں "اٹھائیے" "جائیے" لیکن مثال نمبر (ب) کو بغور ملاحظہ کیجئے استاذ زمن نے نثر مقفی میں جدت پیدا کی ہے دو جملوں میں "جاتے" "لگاتے" ہم قافیہ ہیں اس کے ساتھ ہی دونوں جملوں کا اقسام "ہو" سے ہوتا ہے یعنی "ہو"

جن جملوں میں ردیف کی جگہ ہے گویا استاذ زمن نے قافیہ کے ساتھ ہی ردیف کا بھی استعمال کر کے نثر مقفیٰ میں جدت پیدا کی ہے اہل فن خوب جانتے ہیں کہ لکھنؤ اور دہلی اسکولوں کے ادیبوں کی نثر مقفیٰ مضمون کو پیچیدہ بنا دیتی ہے کیونکہ انھوں نے الفاظ پیچ در پیچ استعمال کئے ہیں حضرت استاذ زمن نے دونوں اسکولوں کی روش سے الگ اٹھ کر اپنی نئی راہ نکالی اور نثر مقفیٰ کو اس طرح لکھا کہ سلامیت بھی برقرار رہتی ہے اور شگفتگی بھی فوت نہیں ہوتی ہے جس کے باعث مقصد کا اظہار بھی بخوبی واضح ہو جاتا ہے یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ اسکول کے نمائندہ ادیب رجب علی سرور کی نثر مقفیٰ کو بطور مثال پیش کر دیا جائے تاکہ استاذ زمن کے ادبی کمال کو بخوبی واضح کرسکوں سرور صاحب لکھتے ہیں

اس گلزار ہمیشہ بہار میں بہمن ودے کا سامان ہے
ایسا آباد ملک سنسان ہو ویران ہے ۲۷

دیکھئے لکھنوی نازک خیالی الفاظ کے گورکھ دھندے میں پھنس گئی عبارت تو مقفیٰ لکھی مگر الفاظ اتنے غیر مانوس لکھے کہ نثر میں لطف نہ رہا، اس کے ساتھ ہی صنائع کے شوق استعمال نے معنویت پر بھی کالک پھیر دی گلزار میں خزاں آنا لازمی امر ہے غیر متوقع نہیں ہے خزاں آنے پر حیرت کیسی؟ حیرت تو انہونی کا ہوتا ہے گلزار کو ہمیشہ بہار کہنا خلاف واقع ہے، اس لئے بھی زور و تاثر سرور صاحب عبارت میں پیدا نہ کر سکے، ایسا طرز اور اسلوب اس دور میں عام تھا لیکن استاذ زمن کا اپنے دامن کو بچائے جانا ان کے ذوق سلیم پر دلالت کرتا ہے۔

استاذ زمن نے مثال (ب) میں حسرت، رنج والم کا اظہار کیا ہے مگر اس خوبی سے کہ مطلب بخوبی واضح ہو رہا ہے اور دل و دماغ میں غم و صدمہ پیوست ہو رہا ہے، استاذ زمن کے یہاں نثر مقفیٰ میں جو سادگی ملتی ہے وہ غالب کے یہاں بھی مجھ کو نہیں ملتی ہے شوکت الفاظ کی جو رونق غالب کے یہاں نہیں ملے گی وہ استاذ زمن کے یہاں بدرجہ اتم ملتی ہے، دیکھئے غالب اپنے ایک خط میں لکھتے ہیں۔

عرصے سے پیشاب میں ریت آتی ہے
اس وجہ سے طبیعت بگڑ جاتی ہے ۲۵

طویل عبارت نے ذہن کو الفاظ کی کھیپ میں الجھا دیا غالب کی بیماری سے جو تشویش پیدا ہونا چاہئے تھی وہ نہ ہو سکی مرزا غالب طویل کلام سے بچ کر اس طرح بھی اپنے مقصد کو لکھ سکتے تھے۔

"عرصے سے پیشاب میں ریت آنے سے طبیعت بگڑ جاتی ہے"

مگر یہاں غالب کی مجبوری یہ ہے کہ مقصد کا اظہار تو پُر اثر ہو جاتا مگر نثر مقفیٰ کے کمال سے عاری رہ جاتے گویا اظہار مقصد کو لیتے ہیں تو نثر مقفیٰ ہاتھ سے نکل جاتی ہے اور نثر مقفیٰ پر اختیار جتاتے ہیں تو اظہار مقصد فوت ہو جاتا ہے۔

استاذ زمن کی تمام تصانیف کو پڑھ جائیے انھیں آپ اس راہ پر کہیں مجبور نہیں پائیں گے۔

نثر مسجّع

استاذ زمن کی نثر مسجع ملاحظہ فرمائیے، استاذ زمن کے شاہ کار کو پڑھنے سے قبل پس منظر پر نظر رکھئے، حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو وصیت کرتے ہیں کہ اہل کوفہ پر اعتماد نہ کرنا وہ تم کو بلا کر کربلا کے میدان میں اکیلا چھوڑ دیں گے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی یہ وصیت بقول استاذ زمن موتیوں میں تولنے کے قابل ہے، امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ اہل کوفہ کی دعوت پر کوفہ کو روانہ ہوئے اس ٹریجڈی پر استاذ زمن کے تاثرات نثر مسجع

میں ملاحظہ فرمایئے۔

(الف) :۔ مگر اس ہونے والے واقع کو کون روک سکتا تھا۔ جیسے قدرت نے مدتوں پہلے سے مشہور کر رکھا تھا ۲۶

حضرت امام حسنؓ کو زہر دیا گیا اور اس کے اثر سے آپ شہید ہو گئے حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت امام حسن رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زہر دینے والے کا نام جاننا چاہا۔

تو زہر دینے والے کا نام ظاہر نہیں کیا بلکہ اپنے اخلاقِ عظیم کو ظاہر فرمایا امام حسن رضی اللہ عنہ کا جواب استاذ زمن اپنے اسلوب خاص میں تحریر فرماتے ہیں۔

(ب) کہ روز قیامت ہم ان کی شفاعت فرما کر کام آئیں نہ کہ ان کے ساتھ غضب اور انتقام کو کام میں لائیں کربلا کے حادثے کے بعد حضرت زین العابدین قدخطیہ واپس تشریف ۲۷۔ لاتے ہیں اس وقت کا سماں استاذ زمن نثر مسجع میں تحریر فرماتے ہیں۔

(ج) پھر شام سے یہ قافلہ مدینہ منورہ کو روانہ کیا گیا مدینہ میں پہونچنے کی تاریخ قیامت کا سامان اپنے ساتھ لائی گھر گھر میں کہرام تھا در و دیوار سے دل دکھتا اور کلیجے میں گھاؤ ڈالنے والی مصیبت ٹپکی پڑتی تھی ۲۸

حضرت استاذ زمن کی نثر مسجع کے مذکورہ بالا چھوٹے چھوٹے فقروں میں جیسا کہ مثال (الف) اور اوسط جملے جیسا کہ مثال (ب) اور طویل جملے جیسا کہ مثال (ج) میں لکھا ہے اسے ظاہر ہے کہ حضرت استاذ زمن نے اردو نثر میں دہلی یا لکھنو اسکولوں کے ادیبوں کی تقلید نہیں کی ہے انھوں نے اپنی راہ خود نکالے اور وہ خود ہی اپنی راہ پر اپنے ہمعصروں میں منفرد نظر آتے ہیں

نثر عاری | استاذ زمن نے نثر عاری لکھنے میں بھی اپنے ادبی ذوق کا بہترین مظاہرہ کیا ہے در اصل نثر عاری روز مرہ عام بول چال کی زبان ہے جس میں شگفتگی لطافت پیدا کرنا آسان نہیں ہے اساتذہ نے نثر عاری کو شگفتگی دینے کی کوشش کی ہے تو وہ ابتداء جو دہی کھو بیٹھی ہے مگر استاذ زمن یہاں پر بھی منفرد ہیں انھوں نے نثر عاری کا وجود بھی برقرار رکھا اور زبان و پچ دشمنی کے ہی لطافت و شگفتگی الفاظ سے نہیں بلکہ معنی و مرادسے پیدا کی یہ ان کے فن کا کمال ہے استاذ زمن نثر عاری کا استعمال کرتے ہیں۔ مگر شوکت الفاظ اسلوب بیان انکی نثر عاری کو زور اثر سے بھر دیتا ہے نثر عاری میں استاذ زمن کے ادبی نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

میدان کربلا میں حق و باطل کا معرکہ شباب پر ہے حضرت عبداللہ بن عمر کلبی۔ زیاد کا غلام یسار اور ابن زیاد کا غلام سالم کے مقابلے کے لئے تشریف لائے وہ ظالم بولے ہم تم کو نہیں جانتے زہیر بن قیس یا حبیب ابن مظہر یا یزید بن حضر ہمارے مقابلے پر آئیں دونوں ظالموں کا مطالبہ سن کر حضرت عبداللہ بن عمر کلبی کا جواب استاذ زمن کی زبان میں ملاحظہ فرمایئے۔

"حضرت عبداللہ نے یسار سے فرمایا اور بدکار عورت کے بچے تو مجھ سے نہ لڑے گا تیری لڑائی کے لئے بڑے چاہئے یہ فرما کر ایک ہاتھ مارا وہ قتل ہوا سالم نے آپ پر وار کیا۔ بائیں ہاتھ سے روکا انگلیاں اڑ گئیں داہنے ہاتھ سے وار کیا وہ بھی مارا گیا" ۲۹

حضرت عبداللہ کا جواب اور دونوں ظالموں سے جنگ کا منظر اور انکا انجام انتہائی آسان زبان میں اس طرح ادا کر دیا کہ جنگ کا نقشہ نظر کے سامنے گھومنے لگا نثر عاری میں کسی جنگ کے نقشہ کو اس قدر آسان اور

مختصر انداز میں اردو کے کسی ادیب نے لکھا ہو تو نشاندہی کی جائے ورنہ استاذ زمن کے تبحر و زانوئے ادب طے کرکے خراج عقیدت پیش کی جائے۔

نثر سلیس سادہ

حضرت استاذ زمن کو اردو انشاء پردازی پر مکمل طور پر عبور حاصل تھا انھوں نے سلیس سادہ نثر میں بھی اپنے مطالب و مقاصد کو انتہائی لطافت کے ساتھ بیان کیا اُن کی تصانیف سلیس سادہ نثر کے اعلیٰ نمونے کا مخزن ہیں

سر سیّد

سر سیّد احمد خاں کو ان کے حواریوں نے سلیس سادہ نثر کا بانی باور کرانے کی مہم شروع کی اہل اردو حواریوں کی پھیلائی غلط فہمی کا شکار ہوئے مگر حقیقتِ حال اس کے بالکل برعکس ہے انکشافِ حقیقت کے لئے سر سیّد کی سلیس سادہ نثر کا حضرت استاذ زمن کی سلیس سادہ نثر سے موازنہ ہدیۂ اہل انصاف ہے۔ یہاں مضمون طول کا مقتضی نہیں ہے اس لئے مختصراً عرض کرتا ہوں سر سیّد لکھتے ہیں۔

دو آمدنی کے ذریعوں میں ظاہراً دو ذریعے ایسے معلوم ہوتے ہیں جو تمام ذرائع کو حاوی ہیں۔ ایک زراعت دوسرا تجارت"۔ ع۲۹

سلیس سادہ نثر کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بیان کو اُلجھا دیا جائے، غور کیجئے سر سیّد جو بات کہنا چاہتے ہیں وہ صرف اتنی سی ہے کہ "دیگر ذرائع آمدنی پر زراعت و تجارت کو فوقیت حاصل ہے"۔ یعنی جو بات ایک فقرہ میں لکھی جا سکتی تھی اس کو سر سیّد نے تین جملوں میں لکھا طولِ عبارت کا نام سلیس سادہ نثر نہیں ہے۔ ذرا خط کشیدہ "ذریعوں" "ظاہراً" "حاوی" پر بھی غور کر لیجئے کہ ذوقِ سلیم پر کانٹوں کی طرح چبھ رہے ہیں اور بے محل غیر مانوس الفاظ کے استعمال کی وجہ سے جملوں کو پڑھ کر طبیعت اُب رہی ہے۔ ذہن مطلب کی طرف راغب نہیں ہو رہا ہے۔ ادبی زاویہ سے بھی "ظاہراً" اور "ذریعوں" کا استعمال عیب سے پر ہے فنی اعتبار سے بھی فوقیت کے مفہوم کو لفظ حاوی لکھ کر اردو نثر کو سولہویں صدی عیسوی کی طرف پھینک دیا ہے یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ سر سیّد زبان و بیان پر دسترس نہیں رکھتے تھے "فوقیت" کا مفہوم "حاوی" سے پورا نہیں ہوتا ہے دوسرے یہ کہ الفاظ کے برمحل استعمال کرنے پر بھی قادر نہیں تھے۔ پھر بھی ان کے حواری ان کو جدید اردو نثر کا بانی کہیں تو انصاف کا قتل عمد! ہے۔ یہاں میں استاذ زمن کی نثر سلیس سادہ کا نمونہ پیش کرکے اہل دیانت سے انصاف کا طالب ہوں۔

حضرت سیّدنا امام حسین کے مدینہ منورہ سے رخصت ہونے کی توجیہ بیان کرتے ہوئے حضرت استاذ زمن فرماتے ہیں اور بہت خوب نثر سلیس سادہ میں فرماتے ہیں دو نمونے ملاحظہ فرمایئے۔

"الف" اگر امام کو مدینہ نہ چھوڑنے پر قتل کر دیا جاتا تو قتل ہونا منظور فرماتے اور مدینہ سے باہر پاؤں نہ نکالتے مگر مجبوری کا کیا علاج کہ امام کے ناقہ کو قضا مہار پکڑے اس میدان کی جانب لیے جاتی ہے جہاں قسمت میں پردیسیوں کے قتل ہونے پیاسوں کے شہید کیے جانے کا سامان جمع کیا ہے"۔ ع۳۰

خط کشیدہ عبارت پر غور کیجئے ناقہ۔ قضا اور مہار کے استعمال سے استاذ زمن نے مدینہ منورہ سے حضرت امام کے رخصت ہونے کی توجیہ کس قدر مؤثر انداز میں بیان کی ہے ساتھ ہی بیان کی لطافت بھی محسوس کیجئے۔ ایسی مثال ادب اردو میں نایاب ہے استاذ زمن اردو کے مایۂ ناز ادیب ہی نہیں ہیں بلکہ عالم دین مبلغ اسلام بھی ہیں دشمنانِ حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اعتراضات کا جواب دینا بھی انکی منصبی ذمہ داری ہے استاذ زمن کی مذکورہ عبارت کو ذہن نشین رکھئے اور پھر خوارج کے اعتراض کو یاد کیجئے سوچئے خوارج نے واقعہ کربلا کے لئے

حضرت امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ہی ذمہ دار قرار
دیا وہ "خوارج" کہتے ہیں کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ
کو حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ کی وصیت کے مطابق مدینہ منورہ
سے اہل کوفہ کی دعوت پر کوفہ جانا ہی نہیں چاہئے پس خوارج
کے واہیات اعتراض کا استاذ زمن نے مدلل جواب
دے دیا اور اس اعتراض کا اس طرح رد فرمادیا کہ ناظر
کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ کسی گمراہ فرقہ کا رد فرما رہے ہیں استاذ
زمن کی توجیح کے بعد اگر غیر جانب دار ناظر خوارج کے اعتراض
کو سنے گا تو شعوری طور پر وہ ان کے اعتراض سے کوئی
اثر قبول نہیں کرے گا گویا استاذ زمن کا انداز بیان سے
نفسیاتی ہے جو انسان کے صرف دل و دماغ کو ہی متاثر
نہیں کرتا بلکہ انسان کی نفسیات کو بھی صالح خطوط پر متاثر
کرتا ہے۔

حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ معظمہ سے
مدینہ منورہ کو ہجرت کی خبر پاکر اہل مدینہ کے شوق انتظار
اور ذوق دیدار کے منظر کو استاذ زمن نے سلیس سادہ
نثر میں تحریر فرمایا پڑھئے اور ڈاکٹر سرسید کی سلیس سادہ
نثر سے موازنہ کیجئے۔

(ب) "مسرت آمیز امنگوں نے جوش مارا
اور آنکھوں میں شادیٔ عید کا نقشہ کھنچ گیا
آمد آمد کا انتظار لوگوں کو آبادی سے نکال
کر پہاڑوں پر لے جاتا۔ منتظر آنکھیں مکہ
کی راہ کو جہاں تک ان کی نظر پہونچتی ٹکٹکی
باندھ کر تکتیں اور مشتاق دل ہر آنے والے
کو دور سے دیکھ کر چونک پڑتے جب
آفتاب گرم ہوجاتا گھروں پر واپس آجاتے"
۳۱

استاذ زمن کی نثر سلیس سادہ اپنی زبان حال سے خود
ہی بول رہی ہے کہ الفاظ کا جامہ پہنے واقعات کے
پیکر شعور کے پردوں پر جلوہ آرا ہیں۔

نثر سلیس رنگین

استاذ زمن قادر الکلام
شاعر تھے انھوں نے
ابتدائی دور میں رنگ بہار میں بھی مشق سخن کرکے
اپنا منفرد مقام بنایا اور وہ رنگ پیدا کیا کہ داغ دہلوی
اور ان کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہوجاتا ہے ایسے قادر
الکلام شاعر کو سلیس رنگین نثر لکھنے میں مہارت ہو تو
تعجب کی بات نہیں ہے۔ ہاں تعجب ہے تو اس پر کہ
استاذ زمن نے جیسے شوخ اشعار کہے ویسی ہی
رنگین سلیس نثر بھی لکھی دونوں باتوں کا اجتماع عموماً دیکھنے
کو نہیں ملتا ہے مگر استاذ زمن میں دونوں خوبیاں بدرجۂ
اتم پائی جاتی ہیں۔ استاذ زمن کربلا پر اپنے تاثرات
رقم فرماتے ہیں۔ کتنی سلیس اور رنگین زبان استعمال
کی ہے۔ استاذ زمن کی نثری کاوشوں میں سلیس رنگین نثر کے
بہترین شاہکار دیکھے جاسکتے ہیں:

"واقعات شہادت پر نظر جاتی ہے تو حسرت
کی آنکھوں سے آنسو نہیں لہو کی بوندیں ٹپکتی
ہیں اور خدا کی بے نیازی کا عالم آنکھوں
کے سامنے چھا جاتا ہے" ۳۲

استاذ زمن کی سہل اندازی دیکھئے ساتھ ہی مطلب کو
واضح کرنے کے لئے مناسب الفاظ کی رعایت یعنی
"آنکھوں سے آنسو" اور "لہو کی بوندیں" ملاحظہ کیجئے پھر اس
دردناک واقعہ کے ساتھ ہی خدا کی "بے نیازی" اور
آنکھوں کی مناسبت سے بے نیازی کا عالم آنکھوں
میں چھا جاتا۔ اس بات کی علامت ہے کہ ہم کو صبر کرنا
کرنا چاہیے مرضی مولا ہمہ اولیٰ۔

رجب علی سرور

لکھنو اسکول کے نمائندہ
ادیب رجب سرور نے
بھی سلیس رنگین نثر کو استعمال کیا ہے مگر استاذ زمن اور
سرور کے درمیان جو فرق ہے۔ اس کا اندازہ سرور کی نثر سے
باسانی لگایا جاتا جاسکتا ہے۔ سرور لکھتے ہیں۔
اس سال نیا ساز و سامان ہے۔ شب برات۔ بہار
سے دست و گریباں ہے باغبان ازل دفعتہً چمن نکالے
کا لوٹا بتا جوبن نکالنے گا۔ ۳۳
سرور نے ایک ہی بات کو دو جملوں میں بیان

کیا ہے جس سے ذہن اُلجھ جاتا ہے کہ نثر نگار کیا تاثر دینا چاہتا ہے یہ ایک دم محسوس نہیں ہوتا ہے اس کے برعکس استاذ زمن جو تاثر دینا چاہتے ہیں وہ ان کی رنگین عبارت میں بھی بآسانی سمجھ میں آجاتا ہے اور عبارت لکھنے کا اصلی مقصود بھی یہی ہوتا ہے استاذ زمن کی ایک اور عبارت ملاحظہ کرنے سے پہلے پس منظر کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے یزید پلید نے جعدہ سے سازش کر کے حضرت امام حسن کو زہر دلوایا اور اس سے یہ وعدہ کیا تھا اس کو اپنی بیگم بنائے گا اس قول و قرار کو حضرت استاذ زمن دیکھیے کس روانی سے بیان کرتے ہیں کہ ناظر پڑھتے ہی   کی بدبختی پر لعنت بھیجنے لگتا ہے۔

"وہ شقیہ (جعدہ)، بادشاہ بیگم بننے کے لالچ میں شاہان جنت کا ساتھ چھوڑ کر سلطنت عقبیٰ سے منہ موڑ کر جہنم کی راہ پر ہوئی" ع ۳۴

مناسبت الفاظ اور ان کی رعایت کا حسین امتزاج استاذ زمن کے مذکورہ بالا نمونہ میں قابل صد تحسین ہے نثر سلیس ہونے کے باعث ذوق سلیم   آسانی سے   سمجھ لیتا ہے کہ استاذ زمن کی زبان و بیان پر گرفت انتہائی سخت ہے بادشاہ بیگم کے مدمقابل شاہانِ جنت اور سلطنتِ عقبیٰ کے مدمقابل جہنم کے استعمال سے عبارت تاثیر سے بھر جاتی ہے۔ فنی اعتبار سے عبارت انتہائی مؤثر ہے مناسبت الفاظ اور رعایت لفظی کے اعتبار سے انگوٹھی میں نگ کی مانند حسین ہے۔ حضرت امام حسن کی منکوحہ ہونے کے ناطے جعدہ کی فضیلت یعنی شاہان جنت کے ساتھ، اور امام حسن رضی اللہ عنہ کو زہر دینے کے جرم کی سزا جہنم، جیسے الفاظ سے ظاہر کر کے جعدہ کی بدبختی کو اس انداز میں ظاہر کیا کہ ناظر کا دل و دماغ عبارت پڑھ کر جعدہ کی تحقیر کے جذبہ سے لبریز ہو جاتا ہے اس مقام پر استاذ زمن نے اپنی نثر نگاری کی بہار دکھاتے ہوئے تحریر فرمائے ہیں۔

"ایسے بادشاہ جنکے مقدس سر پر دونوں عالم کی حکومت کا چمکتا تاج رکھا گیا۔ ایسے رفعت پناہ جنکے مبارک پاؤں کے نیچے تخت الٰہی بچھایا گیا۔" ع ۳۵

سر کی مناسبت سے تاج پاؤں کی مناسبت سے تخت اور پاؤں کے نیچے   کی رعایت سے رفعت پناہ کا استعمال جہاں زور پیدا کرتا ہے وہیں نثر کو رنگین بھی بنا دیتا ہے زور اور رنگینی کے باوجود نثر سلیس ہے جس میں سرور کی طرح کوئی ادبی نقص نہیں ہے نہ ہی سر سید کی طرح حشو و زائد کا عیب انکی نثر میں ہے ادائیگی مفہوم کی خاطر حشو و زائد کا جواز اردو کے ادیبوں کے یہاں ہے مگر اس جواز سے ادیب کی ادبی مہارت اور فنکارانہ صلاحیت پر حرف آتا ہے استاذ زمن کی نثر حرف گیری کے عیب سے پاک ہے۔ حشو و زائد کا اور اس سے پیدا ہونے والا عیب مبارک ہو سر سید اور ان کے حواریوں کو کہ استاذ زمن نے خداداد صلاحیت سے ثابت کر دیا کہ باصلاحیت ادیب حشو و زوائد کے جواز کے قائل ہیں نہ حشو کے آگے مجبور محض ہیں بلکہ ایک استاد کامل کے سامنے حشو و زائد اس کی فنی صلاحیت کے آگے فوت ہو جاتے ہیں۔

استاذ زمن سلیس رنگین عبارت لکھنے کے بادشاہ ہیں ادب اردو کے تمام سرمایہ کا جائزہ لے لیجیے حضرت استاذ زمن جیسے شاہکار کسی نثر نگار کے یہاں نہیں پائیں گے، مثال رقم کرنے سے قبل پس منظر پر نظر رکھیے حضرت نافع بن ہلال مرادی میدان کربلا میں مزاحم بن حرث کے مقابل آئے آپنے مزاحم بن حرث کو قتل کر دیا اس جدال و قتال کو استاذ زمن نے انتہائی سلیس مگر رنگین زبان کا استعمال کرتے ہوئے مختصر جملہ تحریر کر دیا۔

"نافع ہلال مرادی میدان میں آئے مزاحم بن حرث انکا مزاحم ہوا مرادی بامراد نے اس نامراد کو قتل کیا۔" ع ۳۵

عبارت کی سلاست اور اس کے ساتھ رنگینی ملاحظہ فرمائیے

مزاحم بن حرث کی حرکت کی مذمت "نامراد" کے لفظ سے کی یعنی واصل جہنم ہوا۔ اور نافع ہلال مرادی کی داد شجاعت ادا کرنے کو "بامراد" کے لفظ سے ظاہر کیا پھر یہاں ادبی لطف یہ بھی قابل غور ہے کہ مرادی کی رعایت سے بامراد کتنا لطف آفریں مفہوم پیدا کر رہا ہے۔
یعنی استاذ زمن نے انکو عقبیٰ کی کامیابی کا مستحق قرار دیا استاذ زمن کا مذکورہ جملہ ادبی لطافت ومدرت سے پر ہے مرادی کی رعایت لفظی بامراد اور بامراد کی رعایت سے نامراد کے الفاظ لکھ کر استاذ زمن نے حق استادی بھی ادا کر دیا۔

محاسبات

محاکات کا بیان انتہائی مشکل کام ہے اہل فہم بخوبی واقف ہیں یہ مشکل اور بھی زیادہ مشکل ہو جاتی ہے جب سلیس رنگین نثر میں لکھنا پڑے یہ وہ مشکل اور سنگلاخ راہ ہے کہ بڑے بڑے پھسل گئے اس راہ میں آپ حالی کو بے حال اور سرسید کو بے سرد یکھیں گے تو ابوالکلام کو زبان وبیان کی دسترس سے آزاد پائیں گے مگر استاذ زمن اس سنگلاخ راہ کو بھی آسانی سے پار کر جاتے ہیں ملاحظہ کیجئے! استاذ زمن کی مہارت تامہ۔ میدان کربلا میں ابن جوزہ سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر حملہ آور ہوا اس حملہ کی کیفیت استاذ زمن کی زبان سے سن کر زبان منہ پر پھیرتے ہی بن پڑتی فرماتے ہیں۔

"ابن جوزہ نے حضور کی طرف گھوڑا جھکایا قدرت خدا کی گھوڑا بھڑکا اور یہ پھسلا ایک پاؤں رکاب پر الجھ کر رہ گیا اور اب گھوڑا اڑا چلا جاتا ہے۔ یہانتک کہ اس مردود کی ران اور پنڈلی ٹوٹی سر پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا آخر اسی حال میں واصل جہنم ہوا" [۳۶]

عبارت کی رنگینی ملاحظہ فرمایئے حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کی جانب گھوڑا دوڑانے کو "جھکایا" اور گھوڑے کے گھبرا کر دوڑنے کو "اڑا چلا جاتا" کے الفاظ سے تعبیر کرتے سر کے بری طرح مجروح ہونے کو "پاش پاش" کے لفظ سے بیان کیا۔ جھکا بھڑکا۔ پھسلا۔ اڑا وغیرہ الفاظ استعمال کر کے نثر کو مقفیٰ بھی بنا دیا علاوہ ازیں نثر کی سادگی کو بھی برقرار رکھا اور حسن بیان کو بھی حسین بنا دیا ہے ——— اہل علم بخوبی واقف ہیں کہ سلیس رنگین نثر میں اظہار مقصود ناظر کے دل ودماغ میں پیوست کرنے کے لئے مناسبات کے لحاظ سے رعایت لفظی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے رعایت لفظی کا اہتمام اس طرح کرنا چاہیے کہ بیان میں تصنع نہ محسوس کیا ہو ورنہ رعایت لفظی سلیس رنگین نثر میں عیب پیدا کر دیتی ہے استاذ زمن نے اظہار مطلب میں مناسبات الفاظ کے ساتھ رعایت لفظی کا شاندار اہتمام کیا اور اس طرح کیا کہ اظہار مبنی بر حقیقت محسوس ہوتا ہے تصنع وبناوٹ کے عیب سے انکی نثر یہاں پر بھی اپنے دامن عصمت کو محفوظ رکھے ہوئے ہے مثال کے لئے استاذ زمن کی عبارت ملاحظہ کیجئے

"تشنہ کاموں پر تیروں کا مینہ برسانا شروع کر دیا" [۳۷]

غور فرمایئے تشنہ کی مناسبت سے "مینھ برسانا" عبارت میں حسن واثر پیدا کر رہا ہے دوسری طرف تشنہ کاموں کی رعایت سے "تیروں کا مینھ" اہل بیت کی مظلومیت اور یزیدیوں کی بربریت وحیوانیت کو آشکارا کر رہا ہے یعنی مجاہدین اسلام پر پانی بند کر دیا گیا۔ پیاسے ہیں ظالموں نے پانی فراہم کرنے کے بجائے پیاسے مجاہدین کو اپنے نرغہ میں لے کر ان پر تیروں سے بورش کر رکھی ہے استاذ زمن کی تصانیف میں ادب عالیہ کے علمی نمونے اتفاقیہ نہیں ہیں۔ ان کا اسلوب اور طرز بیان ادب عالیہ کو جنم دیتا ہے مذکورہ بالا جملہ مختصر ہے مگر اس مختصر جملہ میں استاذ زمن نے سلاست ورنگینی کی بہار پیدا کی ہے اور یہ حرف اتفاقیہ نہیں ہے میرے اس دعوے پر شاہد ہے استاذ زمن کی نگارشات اور ملاحظہ کیجئے۔

میدان کربلا میں شمر مردود حسینی کاروان سے
پر حملہ کر کے خیمہ اطہر کے قریب پہونچا اور جنت والوں کا خیمہ
نذر آتش کرنا چاہا شمر کے اس ارادۂ بد کو استاذ زمن کی
زبان میں سنئے۔

"شمر مردود حملہ کر کے خیمہ اطہر کے قریب پہونچا
اور جنت والوں کا خیمہ پھونکنے کو جہنمی نے
آگ مانگی" ع ۳۸

استاذ زمن کی نثری قدرت ملاحظہ فرمایئے "خیمہ اطہر"
کی مناسبت سے "جنت" اور خیمہ اطہر میں آگ لگانے
کی مناسبت سے "جہنمی" کتنا برمحل ہے اس کے ساتھ ہی یہ
قابل غور یہ امر بھی ہے کہ عبارت میں ثقل کا عیب پیدا
نہیں ہوا اظہار جذبات اور مقصود اظہار کے مد نظر
انتہائی کامیاب جملہ ہے عبارت کو پڑھتے ہی اہلبیت
کرام سے عقیدت و محبت کے جذبات موجیں مارنے
لگتے ہیں اور شمر سے نفرت کے جذبات بل کھاتے
ہیں۔

میدان کربلا میں حسینی قافلہ کی مظلومیت اور یزیدیوں
کا ظلم حسینوں کا مرضی مولا پر شاکر و صابر رہنا معروف ہے
اس عنوان پر اردو کے ادیبوں نے مختلف انداز اور
متعدد زاویوں سے لکھا ہے مگر استاذ زمن یہاں
اپنی انفرادیت برقرار رکھتے ہیں انھوں نے جس اسلوب
اور انداز سے اس عنوان پر لکھا وہ اردو میں کسی دیگر
ادیب کے یہاں نہیں ملتا اہلبیت کے صبر کا اظہار اس
سے بہتر ہو ہی نہیں سکتا تھا استاذ زمن کی نثر سے
لطف اندوز ہونے سے قبل پس منظر کو یاد رکھئے۔
حضرت نافع بن ہلال کو گرفتار کر کے شہید کرنے
کی غرض سے شمر نے شمشیر اٹھائی اس نازک گھڑی میں
حضرت نافع کا صبر و شکر استاذ زمن سے سنئے حضرت
نافع رضی اللہ عنہ شمر کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

اس خدا کے لئے تعریف ہے جس نے
ہماری موت بدتران خلق کے ہاتھ پر
رکھی ع ۳۹

لفظ "تعریف" لکھ کر حضرت نافع بن ہلال کا مرضی مولا پر
صبر و شکر اور شمر کے لئے "بدتران خلق" کا استعمال کر کے
حضرت نافع کا عزم و استقلال کے ساتھ ہی شمر کی مذمت
ظاہر کردی۔ الفاظ کا رکھ رکھاؤ اور محل کے اعتبار سے
مناسبت الفاظ کا نثر میں انتخاب کرنا اہل اردو استاذ زمن
سے سیکھیں ان کی نگارشات کو پیش نظر رکھیں تو صحیح معنی
میں اردو نثر لکھنے کی مہارت حاصل ہو سکتی ہے

شگفتگی و وارفتگی

اہلبیت اطہار کے میدان
کربلا میں شہید ہونے پر اپنے تاثرات عقیدت و محبت
کے آبگینوں میں سجا کر استاذ زمن ناظرین کے سامنے
پیش کرتے تاثرات کے اظہار میں شگفتگی بھی ہے اور
وارفتگی بھی اور یہ کیفیت لطیف اردو کے ادیبوں کے
یہاں عنقا ہے استاذ زمن کا گلزار اس حیثیت سے
بھی سدا بہار ہے استاذ زمن کے گلزار کی سیر کرنے
سے قبل پس منظر یاد رکھیے۔
کمسن شہزادے راہ مولا میں حضرت امام
حسین رضی اللہ تعالے عنہ کی نظروں کے سامنے شہید
کئے جاتے ہیں اس روح ساحادثہ پر استاذ زمن
کے تاثرات وارفتگی سے پر ہیں اور اظہار تاثرات میں
انداز شگفتگی سے جھوم رہا ہے استاذ زمن کے حسین
قلم کی بانکی ادا حقیقت میں ادب اردو کے اسالیب
کی شان ہے، ملاحظہ فرمایئے۔

"کلیجے کے ٹکڑے خون میں نہائے آنکھوں
کے سامنے پڑے ہیں۔ ہری بھری پھلواری
کے سہانے اور نازک پھول پتی پتی ہو
کر خاک میں ملے ہیں اور کچھ پرواہ نہیں
ہوتی تو کیوں ہوتی کہ راہ دوست میں گھر
لٹانے والے اسی دن کے لئے مدینہ
سے چلے تھے" ع ۴۰

خط کشیدہ الفاظ کو ملاحظہ فرمایئے کہ زبان و بیان کی
شگفتگی کے ساتھ جذبات کی وارفتگی اگر حزن و ملال سے

کا ہجوم بن کر دل و دماغ پر چھا جاتی ہے تو حضرت سیدنا امام حسین رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عزم واستقلال کا جلوہ وجدانی کیفیت پیدا کر دیتا ہے ہمارے ناظرین کو یقیناً یہ ہو نے نہیں ہوں گے کہ استاذ زمن کا ادبی و فنی کمال نثر سلیس رنگین میں ظاہر ہو رہا ہے۔

غالب سے لیکر مہدی افادی تک اردو کے ادیبوں نے مختلف انداز اور زاویوں سے رات کے مناظر بیان کیے ہیں مگر جس ندرت وسلاست اور رعنائی کے ساتھ استاذ زمن نے مناظر شب کو بیان کیا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے اور ہونا بھی چاہیئے کیوں کہ ہمارے ادیبوں کو شب بیداری کی نعمت کا لطف کہاں میسّر آ سنجیدہ ہوئے تو بلی تانے خراٹوں کی میوزک سے اپنی شب کو جگائے رہے اور خدانخواستہ رنگین مزاج ہوئے تو ام الخبائث کی صحبت نے مفلوج محض بنا کر کیلاش پربت کی سیر کرائی مگر استاذ زمن اردو کے شاعر ادیب یا مصنف ہی نہیں تھے وہ عالم باعمل عابد شب بیدار بھی تھے ان کی زندگی تقویٰ و ورع سے معمور تھی انھوں نے اپنی عارفانہ نگاہوں سے شب کی کیف آور و سرور کن ادائیں دیکھیں تھی انھوں نے مظاہر قدرت کا مشاہدہ کیا تھا ان کو اپنی زندگی میں سمویا تھا۔ اسی لئے رات کی منظر کشی میں بیان کی پاکیزگی اور انداز کی طہارت استاذ زمن کے یہاں پائی جاتی ہے جس کی مثال ادب اردو میں کسی دوسری جگہ آپ نہ پائیے گا چند مثالیں عرض کرتا ہوں۔

(الف) آفتاب غروب ہوگیا۔ محرم کی دوسری رات کا چاند اپنی ہلکی ہلکی روشنی دکھانے لگا دونوں لشکر علیحدہ علیحدہ ٹھہرے اب مشرقی کناروں سے اندھیرا بڑھتا آتا ہے اور بزم فلک کی شمعیں روشن ہوتی جاتی ہیں۔ فضائے عالم کے سیاح اور خدائی چرند و پرند چھپ کر خاموش ہو گئے۔ زمانے کی رفتار بتانے والی گھڑی اور عمروں کا حساب سمجھانے والی جنتری اسلامی سن کی تقویم جیسے قدرت کے زبردست ہاتھوں نے عرجون القدیم کی حد تک پہونچا دیا ہے کچھ اپنی دل کشی ادائیں دکھا کر روپوش ہو گئی۔ تاریکیوں کا رنگ اب اور بھی گہرا ہو گیا ہے (الخ)

آمد کی شب سبک رفتاری کی منظر کشی اس دوران میں کی گئی ہے جب اردو زبان نشو و نما پا رہی تھی انیویں صدی کے نصف آخر کی اردو نثر کے خلاف یہ فرد جرم لگائی جاتی ہے کہ اس دور کی اردو نثر سلاست ولطافت سے محروم تھی کاش کہ نقاد اردو کے داروغہ اردو نثر پر فرد جرم لگانے سے پہلے استاذ زمن کی تصانیف کا مطالعہ کر لیتے۔ استاذ زمن کی نثر سلاست اور لطافت کا مخزن ہے رنگینی کے ساتھ ہی اثر و تاثیر کا منبع ہے پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ انیویں صدی کے نصف آخر تک "اردو زبان پیر دے سے چلنا نہیں جانتی تھی"۔ ہم اہل انصاف سے درخواست کرتے ہیں کہ استاذ زمن مذکورہ بالا عبارت کو پڑھ کر اردو نثر پر لگائی گئی فرد جرم کو کالعدم قرار دے کر ترقی اردو کا سہرہ استاذ زمن سر باندھیں تاکہ اردو نثر کی صحیح تاریخ مستقبل کا مورخ لکھ سکے استاذ زمن رات کی سبک رفتاری بیان فرمانے کے بعد رات کی کیفیت رقم فرماتے ہیں۔

(ب) "نگاہیں جو تقریباً دو گھنٹے پہلے دنیا کی وسیع آبادی میں دور کی چیزوں کو باطمینان سے تمام دیکھیں اور پرکھ سکتی تھی اب تھوڑے فاصلے پر بھی کام دینے سے الجھتی بلکہ ناکام رہ جاتی ہیں" ص ۴۲

تاریکی شب کا انتہائی تعین بیان کرنے کے بعد حضرت استاذ زمن کی کیفیت رات رقم فرماتے ہیں۔

(ج) "اور اگر کچھ بھی نظر آجاتا تو رات کی سیاہ چلمن اسے صاف معلوم ہونے سے روکتی ہے وقت کے زیادہ گذرنے اور بول چال کے موقوف ہو جانے سے سناٹا پیدا کر دیا ہے رات اور بھیانک ہوگئی ہے

شب بیدار ستاروں کی آنکھیں جھکی پڑتی ہیں
سونے والے بیانی سو رہے ہیں نیند کا
جادو زمانہ پر چل گیا ہے ؎۴۴

خط کشیدہ عبارت کو بار بار پڑھیئے فال حال میں بدل جاتا ہے دل کیف سے دماغ سرور سے چٹخارہ لیتا ہے تأثراتی کیفیت کا بیان اور وہ بھی انتہائی حسین و رنگین پھر سلیس نثر میں اس میدان میں بھی استاد زمن اپنا ثانی نہیں رکھتے ہیں زبان کی سلاست بیان کی لطافت محاورہ کی رنگینی کے ساتھ ہی مقصد اظہار کی مکمل تفسیر استاد زمن نے کردی اس انداز بیان پر زبان جائیے اور اس احسان فراموشی پر سر دھنئے کہ محسنین اردو کی فہرست میں جس کا نام سر فہرست ہونا چاہیئے تھا اس کا نام سرے سے فہرست میں غائب ہے۔

استاد زمن ایک اور زاویہ سے رات کی منظر کشی کرتے ہیں ملاحظہ فرمایئے۔

(۵) شعبان کی چوتھی رات کے تین پہر گذر چکے ہیں اور پچھلے پہر کے نرم نرم جھونکے سونے والے کو تھپک تھپک کر سلا رہے ہیں ستاروں کے سنہرے رنگ میں کچھ کچھ سپیدی ظاہر ہو چلی ہے۔ اندھیری رات کی تاریکی اپنا دامن سمیٹتا جاتی ہے تمام شہر میں سناٹا ہے نہ کسی پتے کے ہلنے کی آواز کان تک پہونچتی ہے نہ کسی چلنے والے کی چاپ سنائی دیتی ہے شہر بھر کے دروازے بند ہیں ہاں خاندانِ نبوت کے مکانوں میں اس وقت جاگ ہو رہی ہے ؎۴۵

کیفیت فطری

خط کشیدہ فقروں کو پڑھیئے فقرے کیا ہیں حقیقت میں معنویت کے حسین مرقع ہیں جن میں ادبیت اپنی پوری آن بان سے جلوہ فرما ہے ان تمام محاسن کے ساتھ ہی انداز بیان فطری ہے آدھی رات گذرنے کے بعد نیند کی جو کیفیت ہوتی ہے اس کا اظہار "نرم نرم جھونکے، اور تھپک تھپک" کے استعمال سے کیفیت فطری کو ظاہر کرتے ہیں یہ کیفیت فطری کا بیان بھی اس دور میں استاد زمن کر رہے ہیں جب اردو کمسن تھی اور ٹھیک ٹھیک طور پر اس کو بولنا نہیں آتا تھا" یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کمسن کی پرورش کس نے کی اسکو ٹھیک ٹھیک بولنا کس نے سکھایا۔ استاد زمن کی نگارشات کو پڑھو تو صحیح جواب خود بخود برآمد ہو جائیگا۔

بہرکیف کیفیت فطری کا بیان انتہائی مشکل ہے اور یہ مشکل اس وقت اور زیادہ بڑھ جاتی ہے جب مصنف اس کو سادہ الفاظ میں ظاہر کرنا چاہتا ہے مگر استاد زمن کی ادبی مہارت اور فنی جلالت کے سامنے مشکلات پانی بھرتی نظر آتی ہے۔ کیفیت فطری کے نفس مضمون کو وہ خوش اسلوبی سے ظاہر کرتے ہیں۔ کہ عبارت کی دلکشی زبان و ادا کی دلفریبی ناظر کے سامنے تاثیر کا سماں باندھ دیتی ہے استاد زمن کی نثر میں وضاحت بھی ہے اور فصاحت و بلاغت بھی صرف و نحو کی خامیاں ان کے یہاں نہیں پائی جاتیں ان کی نثر ادب عالیہ کا بہترین شاہکار ہے افسوس بساط اردو پر "بونوں" نے قبضہ جما کر اپنی شعبدہ بازیوں سے عوام کو بہکا کر قدآور شخصیتوں کی طرف دیکھنے کا موقع ہی نہیں دیا اور بونوں کی سجائی محفل میں قدآور اور سنجیدہ و باوقار شخصیتوں نے قدم رکھنا باعث ننگ و عار سمجھا اس لئے کل بھی تاریخ نثر اردو غیر مکمل تھی اور آج بھی غیر مکمل ہے اور اس وقت تک غیر مکمل رہے گی۔ جب تک اردو نثر کے معماروں محسنوں کو بساط اردو پر ہم صحیح مقام نہیں دیں گے۔

اجمالی جائزہ

آج ادب اردو کی ہتھیلی پر جو لوگ سرسوں جمائے بیٹھے ہیں ان کی نثر کے نمونے پیش کر کے انصاف طلب کرتا ہوں برائے کرم استاد زمن پر میری گذارشات کو یاد رکھیئے اور کلیجہ تھام کر سنئے۔

مولوی عبد الحق

اردو کے معروف قلم کار

مولوی عبدالحق صاحب کو بابائے اردو لکھا جاتا ہے
اور ان کی شان میں لغو بات پر مبالغہ آمیز نثری قصیدے
لکھے جاتے ہیں یہاں ہم مولوی صاحب کے نثری نمونے کو لکھ
کر اہل انصاف کے فیصلے کے طالب ہیں بابائے اردو
عبدالحق ہیں تو پھر ہمیں بتایا جائے داوئے اردو کون ہے
مولوی صاحب مذکور نو آموز اہل قلم پر چوٹ کرتے ہوئے
لکھتے ہیں:

"بعض نوجوان انشاپردازوں کو مصنف بننے کی
اس قدر عجلت ہوتی ہے کہ ان کے کارناموں
میں ایسی قابل افسوس خامیاں رہ جاتی ہیں
جو صرف محنت و غور کرنے سے رفع ہو سکتی
ہیں۔" [۴۴]

مولوی صاحب کی خط کشیدہ عبارت توجہ طلب ہے لفظ
کارنامہ تحسین و تعریف کے لئے استعمال کیا جاتا ہے مگر
"بابائے اردو" کے نزدیک خامیوں سے پر کام بھی کارنامہ
ہوتا ہے۔ افسوس مولوی صاحب مناسب حال لفظ نہ لکھ
سکے مولوی صاحب کو "کارنامہ" کی جگہ کام لکھنا چاہئے تھا
کہ کام غلط بھی ہو سکتا ہے اور صحیح بھی "کام" کا لفظ
صرف تعریف کے مفہوم کو ادا کرنے کے لئے نہیں
بولا جاتا ہے بلکہ کارنامہ تعریف کے مفہوم و مطالب میں
استعمال ہوتا۔ ظاہر ہے کہ بابائے اردو اپنے مطلب و
مقصود کو ظاہر کرنے کے لئے مناسب الفاظ کے انتخاب
کرنے سے معذور ہیں اسی لئے انکی عبارت میں نقص
لفظی و معنوی ہے اور طول کلام کا عیب تو الفاظ کی بھرمار سے
خود ہی ظاہر ہے۔

شبلی

جب "بابائے اردو" اظہار بیان میں
بری طرح مجبور و معذور ثابت ہو چکے
ہیں تو پھر "آل اردو" کا حال کیا ہوگا۔ اور انکی ادبیت کتنی
ناقص ہوگی ہر صاحب عقل قیاس کر سکتا ہے مگر اہل
لاف کی زبان گنگ کرنے کے لئے اردو کی کاشت میں
خود رو پیداوار کی پیدائش شبلی کی "الفاروق" معروف تصنیف
ہے یہ آل اردو شبلی صاحب وہ ہی ہیں جنکو بونے "
عناصر خمسہ [۴۵] شمار کرتے ہیں الفاروق کا ایک جملہ ملاحظہ فرمایئے
اور شبلی کو داد دیجئے یا پھر اہل انصاف سے انصاف کی فریاد
کیجئے۔

"حضرت عمر کو صرف اپنے دست بازو کا بل تھا" [۴۶]

خط کشیدہ الفاظ پر غور کیجئے "دست بازو" کے ساتھ "بل"
کا استعمال انتہائی بوجھل ہے جو ذوق سلیم کو کاٹ کھانے کے
لئے دوڑتا ہے جانے دیجئے ذوق سلیم کو ذوق سلیم
بساط اردو کے بونوں کو بھلا کہاں نصیب "دست بازو"
خلاف محاورہ ہے یہ وہ عیب ہے جو ادبی ذوق رکھنے
والا باسانی سے محسوس کر سکتا ہے اردو میں "قوت بازو"
مستعمل ہے اور یہ ہی صحیح ہے قوت کے مفہوم و مطلب
کو ظاہر کرنے کے لئے شبلی نے "بل" کا استعمال کیا یہاں
بل بھی خلاف رواج ہے لفظ "دست" فقرہ کو مکدر
بنا رہا ہے اور معنوی اعتبار سے بھی دست کا استعمال
حشو ہے۔ شبلی سے یہ غلطی اتفاقیہ سرزد نہیں ہو گئی ہے
وہ تو مبہم عبارت لکھنے میں مشاق تھے پھر بھی اردو کے
عناصر خمسہ میں سے ایک تھے۔ شبلی کی ایک اور معروف
تصنیف "موازنہ انیس و دبیر" ہے نام سے ہی موضوع ظاہر
ہے وجہ تصنیف شبلی صاحب رقم فرماتے ہیں

"مدت سے میں ایسے شاعر پر لکھنا چاہتا تھا جو
اردو شاعری کا بلند مرتبہ ثابت کر سکے" [۴۸]

شبلی جی کا اصلی مقصد کیا ہے؟ مذکورہ عبارت سے بالکل
واضح نہیں ہوتا ہے۔ آیا شاعر سے اردو زبان کا بلند مرتبہ
ثابت کرنا چاہتے ہیں؟ یا کسی شاعر کے متعلق کچھ لکھ کر اس
کا مرتبہ بلند کرنا چاہتے عبارت لاینحل مبہم اور الجھی ہوئی ہے
جس کے باعث عبارت اثر سے بالکل خالی ہو گئی، شبلی
صاحب کا مقصود اصلی کیا ہے اس بات کو شبلی اپنے
الفاظ سے ظاہر کرنے میں معذور ہیں پھر بھی اردو کے
مسلم الثبوت [۴۹] اساتذہ کی قطار میں کھڑے کر دیئے گئے
کیا عبارت کو پڑھ کر برملا نہیں کہا جا سکتا ہے کہ شبلی
زبان و بیان کے ذریعہ اظہار مطلب کی صلاحیت نہیں
رکھتے تھے۔ اب دیکھیئے خیالات کا اظہار، کو بھی اس طرح

کیا جاتا ملاحظہ فرمائیے استاذ زمن کی عبارت شائستگی سے پر تاثرات کے اظہار سے بھرپور

"اللہ اکبر آج مالک کوثر کے گھر میں اتنا پانی بھی نہیں کہ بے ہوش بہن کے منہ پر چھڑکا جائے" ۴۹

استاذ زمن کی عبارت میں کہیں جھول ہے اور نہ سقم وہ جو کچھ کہنا چاہتے ہیں انتہائی سادگی اور سلاست کہہ دیتے ہیں۔ جذبات کے اظہار میں زور اور تاثیر پیدا کرنے کے لئے مالک کوثر کے الفاظ استعمال کئے ہیں۔ خط کشیدہ فقرہ کو نکال دیجئے پھر بھی بات پوری طرح سمجھ میں آجاتی ہے مگر رنگینی ولطافت نہیں پیدا ہوتی۔ اسی لئے استاذ زمن نے خط کشیدہ فقرہ سے اپنے جذبات کے اظہار کا آغاز کیا جس نے عبارت کو اثر و تاثیر سے بھر دیا۔

مہدی افادی

مہدی افادی کے مکتوبات کو ان کا ادبی کارنامہ تصور کیا جاتا ہے ان کے بیان اور انکی زبان کے متعلق لاف وگزاف پر مبنی مبالغہ آرائی کو دربار شاہی کے شیخ چلی سن لیتے تو وہ بھی شرمندہ ہو جاتے۔ مہدی افادی کا ادبی نمونہ ملاحظہ فرمائیے جس سے بونوں کی شعبدہ بازی کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ مہدی افادی اپنی بیوی کو لکھتے ہیں۔

"دیکھو پھر ہوا کا ایک جھونکا آیا اس میں شمیم عطر کی پیٹ معلوم ہوتی ہے جو تمہارے بالوں سے اڑائی گئی ہے" ۵۰

خط کشیدہ الفاظ کو پڑھ کر آپ نے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ مہدی افادی صاحب مہمل عبارت لکھنے کے عادی ہیں ان کو نہ تو تراکیب کے استعمال کا سلیقہ آتا ہے نہ ہی نثر کے عیوب سے واقفیت ہے۔ پھر بھی بقول شیخ چلی جناب اردو کے محسن اعظم اور زبان و بیان کے سکندر ہیں یہ بالکل ایسی ہی بات ہے کہ کسی گونگے کو فصیح البیان کہہ دیا جائے۔ اب افادی صاحب کے حواریوں سے کوئی پوچھے بھائی شمیم عطر کونسی ترکیب ہے اس ترکیب کی کوئی دوسری مثال بھی ہے افادی صاحب کی روح تو جواب دیتی نہیں انکا کوئی نیاز مند ہی بتائے کی شمیم عطر کی غلط و بے ہودہ ترکیب لکھ کر افادی صاحب کیا تاثر قائم کرنا چاہتے ہیں "شمیم عطر کی پیٹ" پڑھ کر تو ابکائی آجاتی ہے۔ عطر کی خوشبو کے لئے پیٹ کا استعمال جتنا مکروہ ہے اتنا ہی ادبی لحاظ سے مہمل بھی ہے خوشبو کے لئے اردو میں "بھبکا" لفظ استعمال کیا جاتا ہے اور یہ بھی صحیح ہے ذہن پر زیادہ زور دیکر افادی صاحب کی عبارت پر غور کیا جاتا ہے تو انکشاف ہوتا ہے کہ بات انتہائی مختصر تھی مگر بے محل الفاظ کی بھرمار نے فقرہ کو بڑوں کا چھتہ بنا دیا جس کے باعث عبارت کی رعنائی جھلس گئی اور تاثیر کی مٹی پلید ہو گئی یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ استاذ زمن کی بھی ایک عبارت نقل کر دی جائے تاکہ جائزہ کا حق پورا ہو سکے استاذ زمن کی نثر کو پڑھنے سے قبل اس کے پس منظر کو ذہن نشین رکھئے۔ نویں ذی الحجہ کی صبح کو خانہ کعبہ کی گرد جلوہ دیدار کے مشتاق والہانہ انداز میں نثار ہو رہے ہیں یعنی مصروف طواف ہیں اس روح پرور سماں کو استاذ زمن نے رقم فرما کر اظہار بیاں پر اپنی دسترس اور مہارت کو ثابت کر دیا ہے ملاحظہ فرمائیے۔

"کعبہ کا دلکش بناؤ کچھ ایسی دل آویز آن کا سامان اپنے ساتھ لئے ہوئے ہے لاکھوں کے جمگھٹ میں جسے دیکھئے شوق بھری نگاہوں سے اسی طرف دیکھ رہا ہے معلوم ہوتا ہے کہ سیاہ پردے کے پیچھے سے کسی محبوب دلنواز کی پیاری پیاری تجلیاں چھن چھن کر نکل رہی ہیں" ۵۱

خط کشیدہ الفاظ کو دیکھئے غلاف کعبہ کے متعلق استاذ زمن کے تاثرات کا حقیقی لطف تو اہل حقیقت و معرفت ہی حاصل کر سکتے ہیں زبان و بیان کی شگفتگی اور اظہار حقیقت کی خوش اسلوبی دیکھ کر کیوں نہ دل سینہ میں مچل جائے بظہار جذبات۔ تاثرات کے اعتبار سے اور زبان و بیان کے ساتھ ہی طرز و اسلوب کے لحاظ سے بھی استاذ زمن کے نثری شاہکار اردو کے ادب عالیہ کی جان ہیں۔

شیرانی

حافظ محمود شیرانی اردو کے معروف ادیب نقاد اور مورخ

ہیں اردو اور پنجابی کے افعال کے متعلق لکھتے ہیں

"اس (افعال) کا قاعدہ اردو اور پنجابی میں بالکل
ایک ہے"۔ ۵۲

شیرانی صاحب نے (بالکل ایک) الفاظ کا استعمال کر کے
مقصد بیان کو الجھا دیا کاش کہ شیرانی صاحب "صرف" "ایک"
کا استعمال کرتے تو ان کا مقصد واضح ہو جاتا اور جو تاثیر
وہ ناظر کو دینا چاہتے ہیں آسانی سے دے سکتے ہیں اور اپنے
اوپر الزام بھی نہ آنے دیتے کہ شیرانی صاحب کو اظہار مقصد
پر دسترس حاصل نہیں پیدا ہو جاتا اور مقصد نہایت روشن
اور اثر دار بن جاتا زبان و بیان پر شیرانی صاحب کی دسترس
کا حال آپ نے ملاحظہ فرمایا شاید اسی لئے شیرانی صاحب
ادب اردو کی ناک ہیں، خیر شیرانی صاحب ناک ہوں
ہمیں کیا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ نکٹی ناک ہیں گستاخی معاف
ہو حقیقت تلخ لگتی ہی ہے۔

تاثیر کی گرمی اور زبان و بیان کی خوش اسلوبی
سے پُر استاد زمن کے چند فقروں کو بھی ملاحظہ فرمایئے
استاد زمن کے فقرہ کا پس منظر یہ ہے کہ حضرت مسلم رضی اللہ
تعالے عنہ کوفہ میں تنہا رہ گئے۔ تو ظالموں نے آپ کو گھیر
لیا لیکن آپ نے داد شجاعت خوب خوب ادا کی کثیر تعداد
شروع کر دی ان ظالموں کی مذمت استاد زمن سے سنئے

"جب ان نامردوں کا اس اکیلے مرد خدا
پر کچھ بس نہ چلا مجبور ہو کر چھتوں پر چڑھ گئے
اور پتھر آپ کی طرف پھینکنے شروع کئے"
۴۳

بزدل۔ کم ہمت۔ وغیرہ الفاظ سے بھی ظالموں کی مذمت
کی جا سکتی تھی مگر استاد زمن نے "نامردوں" کا لفظ
انکی مذمت میں استعمال کر کے انکی تحقیر بھی کی اور عبارت
کو بھی جاندار بنا دیا اور مرد با خدا لکھ کر عبارت کی شان کو
بھی دوبالا کر دیا موقع و محل کے مطابق الفاظ کے استعمال
کا سلیقہ تو استاد زمن نے ہی اہل ادب کو سکھایا ہے ان کو
زبان و بیان پر کامل دسترس حاصل ہے۔

آزاد

دین و مذہب سے آزاد کے ساتھ
ابوالکلام کا سابقہ بھی لگا ہوا ہے

ادب شاہی کے شیخ چلی نے ابوالکلام آزاد صاحب کی اردو
دانی کے منثور قصیدے لکھ دیئے ہیں مگر حقیقت کیا
ہے ابوالکلام کے کلام میں کیا کلام ہے؟ انکی مندرجہ ذیل
عبارت سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ ابوالکلام آزاد
انگریزی حکومت کی پابندیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے

"جمعہ کے دن خطیب ممبر کے سامنے ہمہ تن
انتظار ہو گا کہ شملہ سے تار آ جائے تو خطبہ
پڑھنے کے لئے آمادہ ہو" ۵۳

آزاد صاحب برمحل الفاظ لکھنے سے بھی قاصر ہیں پھر
بھی ابوالکلام ہیں افسوس یہ اردو کی بدقسمتی ہے یا اردو
کی اندھی تقلید پرستی کہ ابوالکلام آزاد نہ صرف مناسب الفاظ
کے استعمال کے ہنر سے بے بہرہ ہیں بلکہ اپنے خیالات
کے اظہار میں بھی گونگے کی مانند الجھ جاتے ہیں۔ خط
کشیدہ فقرے کو بغور دیکھئے عبارت سے یہ بھی تو ظاہر
ہوتا ہے کہ خطیب خطبہ پڑھنے کو تیار بیٹھا ہے ممبر پر بس
اجازت کا انتظار ہے اجازت آ جائے تو خطبہ پڑھنے کا
"آغاز" کرے مگر ابوالکلام آزاد "آغاز" جو اس موقع پر
نہایت مناسب و موزوں تھا۔ کا استعمال نہ کر کے "آمادہ"
لفظ استعمال کرتے ہیں جس کا نہ محل ہے نہ موقع کے اعتبار
سے موزوں ہے اور جملے کے طیور کے اعتبار سے "آمادہ"
سے صحیح مفہوم ظاہر نہیں ہو رہا ہے ابوالکلام تاثر یہ ہی
دینا چاہتے ہیں کہ خطیب اجازت آتے ہی خطبہ پڑھنے
کا آغاز کرے گا۔ مگر زبان و بیان پر دسترس نہ ہونے
کے باعث لولی لنگڑی زبان کو استعمال کرنا ان کی مجبوری
ہے۔

استاد زمن کے نگارشات کو ملاحظہ فرمایئے عبارت
میں جامعیت اور معنویت میں وسعت پائے گا، بیان میں
لطافت کی چاشنی زبان میں وشستگی اسلوب میں
روانگی طرز میں ساختگی انداز میں شگفتگی اور جذبات
میں وارفتگی سلیس و رنگین نثر میں ان سے زیادہ کہیں

نہیں پائیگا مقصد کے اظہار میں تو وہ مہارت کاملہ حاصل ہے کہ خیالات و جذبات کو الفاظ کا پیرہن پہنا کر مرقع نظروں کے سامنے حاضر کر دیتے ہیں۔

استاذ زمن نے اول تا آخر نثر اردو کے ایجاد کی غرض و غایت کو ملحوظ رکھا اور اسکا استعمال تبلیغ اسلام اصلاح اعمال کیلئے کیا انکا قلم ذہنی تفریح یا ذہنی عیاشی کے لئے نہ تھے۔ افسانے یا ناولوں کیلئے نہیں چلا وہ اسی صراط مستقیم کیلئے چلا جس کیلئے اسلاف کرام نے اردو نثر کو جنم دیا تھا انکی تمام نگارشات میں مخاطب عوام ہیں اسلئے انکی نثر سلاست و روانی سے پر ہے انکی نثر صاف سلجھی ہوئی ہے وہ مشکل سے مشکل بات کو بخوبی آسان الفاظ میں لکھتے ہیں۔ یعنی استاذ زمن جدید اردو نثر کے ان بانیوں میں سے ایک ہیں جنکو ہم نے فراموش کر کے نثر کی تاریخ مکمل طور پر نہیں لکھی ہے اب وقت آچکا ہے کہ دیانت کے دامن کو تھام کر نثر اردو کی صحیح تاریخ لکھ کر ادب اردو کیساتھ وفا کریں۔

اشاریہ

(۱) (۲) (۳) سیرت اعلیٰ حضرت ۔ صـ ۶۵ (۵) ماہنامہ اردوئے معلیٰ علی گڑھ جون سنہ ۱۹۱۳ء ۶ ۔ ۷ ۔ ۸ ۔ کلیات محسن مطبوعہ اردو اکادمی لکھنو (۹) (۱۰) (۱۱) (۱۲) (۱۳) (۱۴) (۱۵) تاریخ ادب اردو صفحہ علی الترتیب ۔ ۷۱ ۔ ۷۵ ۔ ۷۸ ۔ ۷۷ ۔ ۸۰ ۔ ۷۴ ۔ ۸۶

(۱۶) (۱۷) (۱۸) (۱۹) (۲۰) سرمایہ بلاغت (علی الترتیب) صفحہ نمبر ۱۵۹ ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۴۰ ۔ ۱۶۱ ۔ ۱۶۱ ۔

(۲۱) آئینہ قیامت ۔ صفحہ ۲ ، ۲۰ (۲۳) آئینہ قیامت صفحہ ۱۵

(۲۴) فسانہ عجائب ۔ صفحہ ۵۲ ۔ (۲۵) انشائے سرور صفحہ ۔ ۴۲

(۲۶) آئینہ قیامت صفحہ ۔ ۱۰ ۔ (۲۷) آئینہ قیامت صفحہ ۔ ۱۰

(۲۸) آئینہ قیامت صفحہ ۔ ۴۸ ۔ (۲۹) آئینہ قیامت ۔ ۲۰ ۔ (۲۹) مضامین رشید صفحہ ۔ ۸۷ ۔ (۳۰) آئینہ قیامت صفحہ ۔ ۱۷

(۳۱) آئینہ قیامت صفحہ ۱۶ ۔ (۳۲) آئینہ قیامت صفحہ ۔ ۳

(۳۳) فسانہ عجائب صفحہ ۔ ۴۳ ۔ (۳۴) آئینہ قیامت صفحہ ۔ ۱۰

(۳۵) آئینہ قیامت صفحہ ۱۴ ۔ (۳۶) آئینہ قیامت صفحہ ۴۰

(۳۷) آئینہ قیامت 〃 ۴۳ (۳۸) آئینہ قیامت 〃 ۴۲

(۳۹) آئینہ قیامت 〃 ۴۴ (۴۰) آئینہ قیامت 〃 ۵۳

(۴۱) آئینہ قیامت 〃 ۲۸ (۴۲) آئینہ قیامت 〃 ۲۸

(۴۳) آئینہ قیامت 〃 ۲۸ (۴۴) آئینہ قیامت 〃 ۲۸

(۴۵) آئینہ قیامت 〃 ۱۵ (۴۶) آئینہ ادب 〃 ۲۱۵

(۴۷) الفاروق 〃 ۳۷ (۴۸) موازنہ 〃 ۳۰

(۴۹) آئینہ قیامت 〃 ۳۵

(۵۰) آئینہ ادب 〃 ۱۵۸

(۵۱) آئینہ قیامت 〃 ۲۰

(۵۲) آئینہ ادب 〃 ۳۲۸

(۵۳) آئینہ قیامت ۱۸

نوٹ: یہ جان کر آپ کو نہایت درجہ افسوس ہوگا کہ مقالہ نگار جناب مرزا عبدالوحید بیگ بریلوی ۲ جولائی ۱۹۹۴ء کو دوپہر بارہ بجکر چالیس منٹ پر انتقال کر گئے، مرحوم راقم السطور پر شفقت فرماتے تھے اور میری کوئی بات ٹالتے نہیں تھے، اسی خصوصی تعلق کی بنا پر باوجود شدت علالت یہ گرانقدر مقالہ قلم بند فرمایا۔ کتابت کے بعد ۲۸ جون ۹۴ء کو علی الصبح کتابت شدہ مقالہ لیکر ملاقات کے لئے حاضر ہوا اور اس کو نظر ثانی کے لئے مرحوم کے سپرد کر دیا۔ کسی کو یہ معلوم نہ تھا کہ یہ عظیم شخصیت، مشہور قانون داں، مفکر انتقال کر جائیگا۔ باوثوق ذرائع سے معلوم ہوا ہے کہ جس روز انتقال ہوا ہے اس دن بستر علالت پر لیٹے لیٹے مضمون مطالعہ فرما رہے تھے مگر بعد انتقال اہل خانہ سے مقالہ کی وصولیابی میں احقر کو بڑی جد و جہد کرنا پڑی، رفیق محترم انجم علی ایڈوکیٹ بریلوی کا ممنون ہوں کہ انہوں نے نمبر کی قریب الختم تیاری کے عین وقت پہونچا دیا ان کے شکریہ کے ساتھ مقالہ شامل اشاعت ہے۔ اللہ تعالیٰ میرے بیگ صاحب کے درجات کو بلند فرمائے۔ آمین

(محمد شہاب الدین رضوی اختری)

جس کی ہیبت سے صنم سہمے ہوئے رہتے تھے ٭ منہ کے بل گر کے ھو اللہ احد کہتے تھے

مولانا حسن رضا خاں صاحب بریلوی کی تصنیف دین حسن کا ایک جائزہ

ڈاکٹر سید عبد اللہ طارق ــــــ نصر اللہ خاں بازار رام پور

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں!

مولانا حسن رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اپنے نعتیہ کلام میں ایک منفرد انداز اور ممتاز مقام کے لئے مشہور ہیں مرحوم کی چند نظمیں نظر سے گزریں۔ عشق کی بے خودی کو محسوس کیا۔ روح وجد میں آئی۔ لیکن سائنس کا طالب علم رہا ہوں۔ ادب کبھی میرا موضوع نہیں رہا اس لئے ادب کے نغمہ آگیں ماحول میں میری لب کشائی بے ادبی ہی ہوگی۔ اپنے احساسات کے اظہار کے لئے شاعر مشرق کے الفاظ مستعار لینے پر مجبور ہوں۔

انوکھی وضع ہے سارے زمانے سے نرالے ہیں
یہ عاشق کونسی بستی کے یارب رہنے والے ہیں

جب تک خطوط پیار کے ہم نے لکھے نہ تھے
تنقید کے اصول نہ تھے ضابطے نہ تھے

شعر و ادب کی رزم گاہ میں اپنی نااہلی کا اعتراف مدیر سنی دنیا (مولانا محمد شہاب الدین رضوی اختری بہرائچی) سے کیا تو موصوف نے مولانا مرحوم کا تصنیف کردہ کتابچہ "دین حسن" برائے تبصرہ تنقیدی و تحقیق" ارسال فرمادیا۔ اب اس ناچیز کا حال یہ ہے کہ "نہ جائے ماندن نہ پائے رفتن"۔ منع کر نہیں سکتا کیونکہ کتابچہ کے موضوع سے اپنی مناسبت کا مجھے انکار نہیں، تعمیل کیسے کروں کہ جو خود ناقد و محقق زمانہ تھے ان پر تنقید و تحقیق سورج کو چراغ دکھلانے کے مترادف ہوگا۔ آخر میں نے ایک درمیانی راستہ نکال ہی لیا۔ مولانا مرحوم کے رسالے کی تشریح و توضیح پر ذیل کی سطور بطور ہدیہ قارئین نذر کر رہا ہوں۔

چشم اقوام یہ نظارہ ابد تک دیکھے
رفعت شان رفعنا لک ذکرک دیکھے

درود و سلام ہو حضرت محمد مصطفےٰ صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم پر جن کی آمد سے قبل تمام آسمانی صحائف آپ کی گواہی دے چکے تھے۔ جن کی بعثت کے انتظار میں یہودیوں نے مدینے عیسائیوں نے نجران اور ہندوستانی اقوام نے یمن میں پڑاؤ ڈالے ہوئے تھے۔ جن کی ولادت سے قبل یہودی کاہنہ فاطمہ خثعمیہ نے آپ کے والد حضرت عبد اللہ کی پیشانی میں نور مبارک دیکھا تھا۔ جن کو بصرہ میں ۱۲ سال کی کم سنی ہی میں دیکھ کر بحیرا راہب "سید العالمین" کہہ کر پکار اٹھا تھا۔ جن کو پہلی وحی کے نزول کے بعد عیسائی عالم ورقہ بن نوفل نے نبوت کا مژدہ سنایا تھا۔ جن کی حقانیت کا اعتراف دشمنان دین کے سرخیل ولید نے ان الفاظ میں کیا تھا۔

"نہیں! بخدا وہ کاہن نہیں ہے۔ وہ پاگل بھی نہیں ہے وہ شاعر بھی نہیں ہے۔ وہ جادوگر بھی نہیں ہے۔ خدا کی قسم اس کی بات شیریں ہے۔ اس کی جڑ پائیدار ہے اور اس کی شاخ پھل دار۔"

اور یہی گواہی دشمنوں کے سردار عتبہ نے سردارانِ قوم کے سامنے ان الفاظ میں دی تھی ______ "میں نے ایک ایسا کلام سنا ہے کہ ویسا کلام واللہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ خدا کی قسم وہ نہ شعر ہے نہ جادو نہ کہانت۔"

وہ دن ہے اور آج کا دن، ہر دور میں ممدوحِ کائنات صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم کو خراج تحسین پیش کرنے والے غیر مسلمین کی ایک بڑی تعداد موجود رہی ہے۔ لیکن افسوس! ہدایت ان میں سے بیشتر کا مقدر نہیں تھی۔

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن
جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا
جس سے دلِ دریا متلاطم نہیں ہوتا!
اے قطرۂ نیساں وہ صدف کیا وہ گہر کیا

۴۸ کتابی صفحات پر مشتمل رسالہ "دینِ حسن" ذاتِ رسالت مآب صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم کی بارگاہ میں غیر مسلم مصنفین کے اعترافاتِ حقیقت کی ایک بیش قیمت تلخیص ہے۔ مولانا نے اس میں عیسائی اور ہندو حضرات کے اعترافات کا ایک ایسا انتخاب یکجا کر دیا ہے جو ایک طرف مومنین کے لئے باعث تقویتِ ایمان ہے تو وہیں دوسری جانب انشاء اللہ تعالٰے مخالفانِ اسلام کے لئے ایک زبردست حجت ثابت ہوگا۔ بشرطیکہ اس رسالے کو ہندی اور انگریزی زبانوں میں ترجمہ کر کے غیر مسلموں تک پہنچانے کی کماحقہٗ کوشش کی جائے، مرحوم نے پیغام پہونچا دیا سننے والوں پر واجب ہے کہ اسے آگے پہونچائیں۔ اور ہدایت قبول کرنے یا نہ کرنے کا فیصلہ غیر مسلم قارئین کی توفیق پر چھوڑ دیں۔ ؎

کہ جن کو ڈوبنا ہے ڈوب جاتے ہیں سفینوں میں

وہیں سے رات کو ظلمت ملی ہے
چمک تارے نے پائی ہے جہاں سے

غیر مسلم دانشوران و مصنفین کے اعترافاتِ حق پر مبنی کثیر تعداد میں کتابیں اور رسالے مختلف زبانوں میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان میں سے متعدد میری نظر سے گزرے ہیں لیکن اس قسم کی بیشتر کتب کو پڑھ کر بجائے خوشی اور طمانیت کے ذہن پر ایک بوجھل پن سا طاری ہو گیا ہے۔ کیونکہ اس میں غیر مسلم حضرات کے اقوال کے حوالے ندارد ہوتے ہیں، مشہور فلسفی جارج برنارڈشا نے اسلام اور قرآن کو خراج تحسین پیش کیا۔ گاندھی جی نے حضور اکرم صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کا اعتراف کیا۔ مجھے معلوم ہے کیا۔ لیکن بغیر حوالوں کے یہی اقوال جب غیر مسلم قارئین کی نظر سے گزریں گے تو بے وزن ہوں گے۔ کہاں کیا؟ کب کیا؟ ثبوت کیا ہے؟ بغیر مستند حوالوں کے اس قسم کے مضامین کی افادیت مسلمانوں کی واہ واہ بٹورنے سے زیادہ کچھ نہ ہوتی۔ اس پس منظر میں "دینِ حسن" ایک خوشگوار تبدیلی دل و دماغ پر چھوڑ گیا۔ کوئی قول، کوئی سطر بنا حوالے کے نہیں ہے۔ ایک صدی قبل تحریر کردہ یہ مختصر رسالہ اپنی اس خوبی کی بنیاد پر اس موضوع پر شائع شدہ دورِ حاضر کی بہت سی ضخیم تصنیفات پر بھاری ہے

عشق کے دردمند کا طرزِ کلام اور ہے

دینِ حسن کے ۴۸ صفحات میں سے ابتدائی ۱۵ اور آخری ۱۰ صفحات میں مولانا مرحوم نے اپنے الفاظ میں غیر مسلمین کے طرزِ عمل اور دینِ اسلام کے محاسن پر ایک سیر حاصل تعارف و تبصرہ تحریر فرمایا ہے۔ (باقی ۲۳ صفحات غیر مسلمین کی تحریروں کے حوالوں پر مشتمل ہیں) یہ ۲۵ صفحات مولانا کے دلکش طرزِ بیان اور جامعیت کا حسین مرقع ہیں۔ استدلال کی بے ساختگی دیکھیے

"افسوس مٹی کے برتن کا خریدار اسے الٹ پلٹ کر دیکھے۔ ٹھونک بجا کر لے اور ہم مذہب جیسی ضروری چیز کو بے سوچے سمجھے اختیار کر بیٹھیں۔" (ص۔ ۵)

سرِ بازار تماشیوں اور بے حیائیوں کی تفصیلات بیان کرنے کے بعد رقمطراز ہیں۔

"... (یہ صورتِ حال) دو حال سے خالی نہیں، یا تو یہ مذہبی احکام ہیں جو عبادت سمجھ کر بے مزاحمتِ احدے و مداخلتِ دیگرے بے دھڑک ادا کیے جاتے ہیں یا مذہب تو روکتا ہے مگر مذہبی پیشوا سوختہ کی ناسس لئے بیٹھے ہیں۔ اگر مذہب ہی نے اجازت دی ہے تو ایسے مہذب اور حیادار مذہب کا کیا کہنا۔ اور اگر

پیشواؤں نے نظارہ بازی کی طمع یا اس سے بھی بڑھ کر
کسی دوسرے شرمناک لالچ سے سکوت اختیار کر
لیا ہے تو ہم اسی قدر کہنا کافی سمجھیں گے کہ مذہبی
احکام کی اشاعت مذہبی پیشواؤں سے ہوتی ہے
جب ان کا یہ حال ہے تو ہدایت کہاں کی۔" (ص ۱۲،۱۳)

کتنی خوب صورتی سے ہندو دیوی دیوتاؤں کے شرمناک قصوں،
جنوبی ہند کے منادر کی دیوداسیوں اور عیسائی پادریوں کی عیاشیوں
پر چوٹ کی ہے۔ گویا دریا کو کوزے میں بند کر دیا ہے۔ اس مختصر
سی تقریر کو بار بار پڑھیے اور دورِ حاضر کے بیشتر واعظین کی طویل
و نام نہاد مرصع تقاریر سے موازنہ کیجیے۔ بے اختیار یہی منہ سے
نکلے گا۔

واعظِ قوم کی وہ پختہ خیالی نہ رہی!
برقِ طبعی نہ رہی شعلہ مقالی نہ رہی
رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

تو میں سمجھا کہ یہ بھی میرے ویرانے کی باتیں ہیں

مولانا کے اندازِ بیان کی ندرت بھی منفرد ہے۔ عیسائیوں
کے کھڑے ہو کر پیشاب کرنے کے لئے کیا الفاظ ادا کئے! ان
میں تازیانہ بھی ہے اور سلیقہ بھی۔

"جس مذہب میں ایسے شیوے، یہ وطیرے
ذلت کی نظر سے دیکھے جائیں، قابلِ نفرت ٹھہریں،
وہ سچائی کی جان اور راستی کی کان ہو سکتا ہے۔
ہمارے مہذب مذہب نے ہم کو بے غیرتی اور بے
حیائی سے بھی باز رکھا۔ نہ مسلمان کھڑے ہو کر دھار
لگائیں۔۔۔" (ص ۱۳)

یہ ہمارے لئے بھی مقامِ عبرت ہے کہ آج اس عیب کو ہم غیر مسلموں
کے لئے مخصوص قرار نہیں دے سکتے۔ اسی قسم کی ایک اور
مثال ملاحظہ ہو۔

"دور کیوں جائیے۔ ذرا اجمیر شریف میں حضرت
سلطان الہند خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالیٰ عنہ،
کے مزار پُر انوار کی زیارت کیجیے۔ جہاں سیکڑوں ہندو
ہاتھ جوڑے گڑگڑاتے سجدے کرتے حاضر ہوتے
ہیں۔۔۔ اس کہنے سے میرا مطلب یہ نہیں کہ ہنود
اپنے تیرتھوں کو نہیں جاتے۔ جاتے ہیں مگر وہاں
سوا منڈنے کے اور کچھ نہیں پاتے۔" (ص ۴۷)

لیکن آج یہی الفاظ ہمیں کچھ سوچنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ بزرگا[نِ]
دین کی زیارت گاہوں پہ کہیں یہ منظر تو نہیں دہرایا جا رہا ہے
پچھلے دنوں درگاہ خواجہ شریف کے خدام کے خاندان کے کچھ
راہرو لفنگے لڑکوں کا جنسی اسکینڈل میں ملوث ہونا تمام ملکی اخبار[ات]
نے چٹخارے لے کر اچھالا۔ ملک کی عدالتوں میں سجادہ نشی[نوں]
اور خدام کے ایک دوسرے کے خلاف پچاس سے زائد مقدمات
اور زائرین کا اسٹیشن پر اترتے ہی دلالوں کے ہاتھ نیلا[م]
وہ خبریں ہیں جن سے ہمارا سر شرم سے جھک جاتا ہے۔ علاوہ
ازیں قبروں پر سجدہ، چاہے وہ سجدہ عبودیت ہو یا سجدہ تعظیمی
اہل سنت والجماعت کے نزدیک مطلقاً حرام ہے۔ ہمارے اعلحضر[ت]
امام احمد رضا خاں صاحب فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا فتویٰ
بھی اسی پر ہے۔ ہم اگر ان ہندو حضرات اور ان کے ساتھ ہی کچھ
گمراہ مسلمانوں کو اس سے منع نہیں کریں گے تو کیا بزرگانِ دین
کی آرام گاہوں کا تقدس پامال نہ ہوگا۔؟

مرے نالے تو ایسے تھے کہ پتھر بھی پگھل جاتے
الٰہی تیری دنیا میں کوئی درد آشنا بھی ہے؟

مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے جابجا عیسائی پادریوں اور ہندو
پنڈتوں کے احوال اس پیرائے میں بیان کئے ہیں کہ علماءِ سوء اور
دین سے بے بہرہ مسلمانوں کے لئے لمحاتِ فکریہ کی دردمند دعوت
دیتے محسوس ہوتے ہیں۔ مثلاً ـــــ

"پادری اور برہمن جو اپنے اپنے مذہب
کے پیشوا تسلیم کئے جاتے ہیں، باوجود مالدار ہونے
کے مذہبی طور پر بالعموم شدت سے طامع اور لالچی
ہوتے ہیں کہ ان کے مقلدوں کی آمدنی کا ایک
معقول ان کی بھینٹ چڑھ جاتا ہے۔ جیسے جی تو

جیتے جی مرنے پر بھی غریبوں کا پیچھا نہیں چھوٹتا، نوچا ناچی چلی جاتی ہے۔ ہر خوشی، ہر غمی میں بے ان کے شریک کئے کام نہیں چلتا گویا مذہبی پیشوائی تمام مال مفت ڈکارنے کی مشین اور ممتاز عہدہ بالجبر بھیک حاصل کرنے کا ایک پاس ہے کہ جیو یا مرو، یاروں کا ٹکا ادھر دھرو۔ اسلام اپنے علماء کو باوصف افلاس طامع ہونے سے منع کرتا ہے نہ ان کے مقلد مذہبی طریقے سے مجبور کئے گئے ہیں کہ بے ان کی شرکت کے یا بغیر کچھ نذر پکڑے کوئی کام انجام نہ پائے بلکہ اسلام نے طمع اور لالچ کے دروازے بہت زور سے بند کر دیئے۔" (ص۔ ۱۲۰)

اب پہلا قرینہ ہے محبت کے قرینوں میں

سرورِ کونین صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم سے محبت، اپنے مال و اولاد اور اپنی جان سے بڑھ کر محبت کرنا ایمان کا جز ہے۔ احترام و ادب اسی محبت کا لازمی تقاضہ ہے۔ مولانا نے مسلموں کے آنحضرت صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم کے لئے بعینہٖ الفاظ نقل کرتے وقت نہ صرف پاس ادب کو بدرجہ اتم ملحوظ رکھا ہے بلکہ ان مقامات پر بھی حد درجہ احتیاط کا دامن تھامے رہے ہیں جہاں بظاہر بے ادبی کا احتمال نظر نہیں آتا۔ عیسائی مورخ گبن کے الفاظ اس طرح نقل کئے ہیں۔

"یہ بات آپ کی صاف باطنی پر خوب دال ہے کہ سب سے پہلے جو لوگ ایمان لائے وہ آپ کے دوست اور اہل خاندان تھے جو آپ کی عادات سے خوب واقف تھے۔ (معاذ اللہ) آپ ..... ہوتے تو یہ لوگ آپ پر ہرگز ایمان نہ لاتے اور ان پر بھی یہ .... ضرور ظاہر ہوتا۔" (ص۔ ۲۵)

احتیاط کی انتہا دیکھیے کہ قوسین میں "معاذ اللہ" کا اضافہ کرنے کے بعد بھی ترجمے سے "جھوٹے" اور "جھوٹ" یہ دو الفاظ حذف کر کے خالی جگہ چھوڑ دی۔ عیسائی نے بھی آنحضور صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم کے صدق کی گواہی میں بطور تردید ان لفظوں کو لکھا تھا لیکن احترامِ رسول کا یہ پاکیزہ نمونہ یقیناً بارگاہِ رب العزت میں گواہی دے گا کہ اس عاشقِ رسول صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم کو بطور تردید بھی ذکر اقدس کے ساتھ منفی صفات کا نقل کرنا گوارا نہ ہوا کیونکہ یہ وہ بارگاہ ہے جہاں سے

خورشید بھی گیا تو وہاں سر کے بل گیا

سکوت تھا پردہ دار جس کا وہ راز اب آشکار ہوگا

مولانا مرحوم کے تحریر کردہ ۱۶ صفحات میں اتنی جامعیت ہے کہ ان صفحات کی ایک باقاعدہ شرح لکھی جانے کی ضرورت ہے چند نمونے نذر قارئین ہیں۔

"جس مذہب میں عابدوں سے معبود زیادہ ہوں یا جس میں تین زاویوں والے مثلث کی پرستش ہو جس کا ایک زاویہ مذہبی طور پر خارج ہو کر مثلث کو ناقص و ناتمام چھوڑ جائے، ان کی جو حالت ہے، انصاف پسند حق جو طبیعت پر بخوبی روشن ہے۔" (ص۔ ۱۲)

عابدوں سے معبود زیادہ ہونے کا اشارہ ہندو مذہب کی طرف ہے جن کے ۳۳ کروڑ دیوی دیوتاؤں کی تعداد خود ہندو مصنفین کی تحریروں میں بکثرت منقول ہے۔

"تین زاویوں والے مثلث کی پرستش۔"

ان الفاظ کو سمجھنے کے لئے یہ جاننا ضروری ہے کہ عیسائیوں کی عظیم اکثریت تین خداؤں کی قائل ہے۔ یہ تین، عیسائی عقیدے کے مطابق اس طرح ہیں۔ (نعوذ باللہ) باپ یعنی خدا، بیٹا یعنی عیسیٰ مسیح (علیہ الصلوٰۃ والسلام) اور روح القدس۔

"ایک زاویہ مذہبی طور پر خارج ہو کر مثلث کو ناقص و ناتمام چھوڑ جائے۔"

یہ جملہ انتہائی ذو معنی اور مشرکانہ عقیدے پر سہ طرفہ چوٹ ہے۔ اول تو یہ کہ "روح القدس" کیا ہے اور کون ہے، اسے عیسائی پادری آج تک واضح نہیں کر سکے۔ ان کی خدائی تثلیث کا یہ وہ زاویہ ہے جو خود ان کے لئے معمہ بنا ہوا ہے اور اس نے الفاظ کی حد تک تو روح القدس کا نام آتا ہے

لیکن عملاً عیسائیوں کی پرستش (نعوذ باللہ) باپ اور بیٹے تک محدود ہے۔ دوم یہ کہ عیسائی عقیدے کے مطابق (نعوذ باللہ) خدا کے اکلوتے بیٹے "مسیح کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔

" ایک زاویے کا مذہبی طور پر خارج ہو کر مثلث کو ناقص و ناتمام چھوڑ جانا۔"

اس عقیدے پر بھی ایک لطیف طنز ہے۔ سوم یہ کہ عیسائی حضرات کہتے ہیں کہ

" یہ تینوں خدا تین ہو کر ایک ہیں اور ایک ہو کر تین۔"

اس ناقابلِ فہم عقیدے کو سمجھانے کے لئے جو طرح طرح کے ناکام جتن وہ کرتے ہیں، ان میں سے ایک یہ ہے کہ " جیسے ایک مثلث △ کی تین لکیریں اور تین زاویے ہوتے ہوئے بھی مثلث ایک رہتا ہے۔ ایسے ہی تین خدا ہوتے ہوئے بھی ایک ہی خدا رہتا ہے۔"

مولانا کا اشارہ اس طرف ہے کہ چاہے عملاً روح القدس کے بے کار رہنے سے یا بیٹے کے سولی چڑھ جانے سے، ہر دو شکلوں میں ایک لکیر یا ایک زاویہ خارج ہو گیا۔ اور اس طرح مثلث والی توجیہ باطل ہوئی۔

کتنے جامع الفاظ میں ایک ہی جملے کے ذریعہ مولانا کتنی لمبی تفصیلات بیان کر گئے ہیں اور سہ آتشہ چوٹ کے ذریعہ عیسائی عقائد کا بطلان بھی کر گئے ہیں! ایک اور مثال دیکھیں۔

" مگر عجب ہے آج کل کے بعض نئی روشنی والوں سے کہ بائبل کو بھی جیوں کا تیوں مان رہے ہیں۔ اس مجموعہ کو کلامِ خدا کہتے ہیں۔" (ص۔ ۳۴ برحاشیہ)

اس جملے کے بعد مولانا نے بائبل کے محرّف ہونے کی خود بائبل کی سیکڑوں اندرونی شہادتوں میں سے چند کا تذکرہ کیا ہے۔ لیکن قارئین کو معلوم ہونا چاہئے کہ آج خود عیسائی پادری و محقق موجودہ بائبل کے محرف ہونے کا اقرار کرتے ہیں۔ خود میرے ذاتی ریکارڈ میں عیسائی پادریوں اور محققین کے بلا مبالغہ ایسے ہزاروں بیانات ہیں۔ ان میں سے صرف دو مثالیں بطور نمونہ پیشِ خدمت ہیں۔ مندرجہ ذیل حوالے جس تحقیقی کتاب سے ترجمہ کئے جا رہے ہیں اس کا نام ہے " بائبل کو کھولتے ہوئے" (Opening The Bible)۔ اس کے مصنف بنگلور کے ایک مشہور فادر ذکریاس میتھم ہیں جو بنگلور میں عیسائیوں کے جیوتی کالج میں " صحائف کے پروفیسر" (Professor of Scripture) ہیں۔ انہوں نے پونا سے عیسائی دینیات (Theology) میں ایم۔ اے کیا تھا اور روم (اٹلی) سے " صحائف" میں ایم۔ اے کی سند لی۔ فاضل مصنف کے بارے میں اتنی تفصیلات میں نے اس لئے درج کیں کہ معزز قارئین یہ جان لیں کہ مصنف کوئی چلتے پھرتے معمولی پادری نہیں ہیں۔ اب ذیل میں ان کی تحقیقات کا اردو ترجمہ پڑھیے۔

" تمام بائبل کو مکمل ہونے میں تقریباً ایک ہزار سال کا عرصہ لگا۔" (ص۔ ۹۰ کتاب مذکور)

" بائبل کے مصنفین ایسے لاتعلق مبصرین نہیں ہیں جن کا مقصد (بائبل میں درج) واقعات کو ٹھیک ٹھیک اسی طرح پیش کرتا ہو جیسے کہ وہ پیش آئے تھے۔ وہ پُرجوش معتقدین ہیں اور جب وہ لکھتے ہیں تو وہ قاری کو عقیدے کی طرف لے جانے کی غرض سے واقعات کی اہمیت بھی (اپنے الفاظ میں) پیش کرتے ہیں۔" (ص۔ ۹۱ کتاب مذکور)

یہ حالت ہے عیسائی پادریوں کی جدید تحقیقات کے مطابق بائبل کے معیارِ صحت کی۔ واقعی! مولانا کی یہ

چشمِ باطن کی نظر بھی کیا سبک رفتار ہے

مولانا کی تحریر کی ایک عجیب و غریب خوبی یہ ہے کہ وہ ایسے پرمعنی الفاظ استعمال کر جاتے ہیں جن میں پوری پوری حکایات پوشیدہ ہیں لیکن پھر بھی ایک ایسے قاری کو، جو ان جامع الفاظ کی حقیقت سے ناواقف ہو اور ان الفاظ کو ان کے عام لغوی معنوں سے تعبیر کرتا ہو، ربطِ کلام ذرا بھی ٹوٹتا محسوس نہیں ہوتا، وہ اس جملے سے اپنا عام فہم مطلب نکال لیتا ہے۔ اس نکتہ کو میں مولانا کی تحریر سے مثال کے ذریعہ واضح کروں گا۔

" تعجب کا مقام اور حیرت انگیز جگہ تو یہ ہے کہ وردفعنالک ذکرک کے زیر دست اثر نے یہاں تک ترقی کی کہ مخالفین سے بھی آن کہی کہلوا چھوڑی، جھوٹ بولنے والی زبانوں سے

اور بداندیش دلوں سے اپنی مدح کے بول
بولے۔" (ص۔ ۱۵)

جس قاری کو مندرجہ بالا جملے میں "اَن کہی" کا اصل مفہوم معلوم نہ ہو وہ اسے عام لغوی معنی میں مراد لے گا اور پورا جملہ سمجھنے میں اسے بھی کوئی دقت پیش نہیں آئے گی لیکن اس جملے میں "اَن کہی" کے استعمال کی خوبی یہ ہے کہ اس کا اصل مفہوم کچھ اور ہی ہے صرف وہ سمجھ اور سراہ سکتے ہیں جنہیں اس کا علم ہے۔

ہندوؤں میں بہت سے ایسے راز سینہ بہ سینہ چلے آرہے ہیں۔ جن کو مسلمانوں سے حتی الامکان پوشیدہ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا ہے۔ "اَن کہی" ان رازوں میں سے ایک راز ہے۔ ہندوؤں میں جاں کنی کے وقت نزع کی تکلیف سے بچانے کے لئے اسے پلنگ سے اٹھا کر زمین پر لٹا دیا جاتا تھا اور اس کے کان میں "اَن کہی" کی سرگوشی کی جاتی تھی۔ "اَن کہی" کے الفاظ یوں ہیں۔

"لاالٰہ ہرنی پاپم الا اللہ پرم پدم
جنم بیکنٹھ پراپت ہوتی تو جپے نام محمدم"

مفہوم اس کا یہ ہے کہ لاالٰہ کہنے سے پاپ مٹ جاتے ہیں الا اللہ کہنے سے پرم پد (مقام امامت) حاصل ہوتا ہے۔ اگر بہشت میں زندگی چاہتے ہو تو محمد (صلے اللہ تعالٰے علیہ وآلہ وسلم) کا نام جپا کرو۔

ان الفاظ کی برکت سے جاں کنی کے مریض کی روح آسانی سے جسم سے جدا ہو جاتی تھی۔ (یہ طریقہ اب بھی کہیں کہیں رائج ہے)

"اَن کہی"، کی اس حقیقت کو سمجھنے کے بعد اب مولانا کے الفاظ دوبارہ ملاحظہ فرما کر لطف اندوز ہوں:

"۔۔۔۔ حیرت انگیز جگہ تو یہ ہے کہ ورفعنالک
ذکرک کے زبردست اثر نے یہاں تک
ترقی کی کہ مخالفین اسلام سے بھی اَن کہی
کہلوا چھوڑی۔۔۔۔"

اساتذہ کے منظوم کلام کی اس خصوصیت سے تو سبھی واقف ہیں کہ ان کے ایک ایک شعر کی کئی کئی شرحیں لکھی جا سکتی ہیں لیکن نثر کا یہ انداز استاذ الاساتذہ ہی کا حصہ ہے۔ قارئین جسنی دنیا کو اب تک کی مثالوں سے بخوبی اندازہ ہو گیا ہوگا کہ میرا یہ دعویٰ کہ۔

"مولانا کے ارشادات کی شرح لکھی جانے کی ضرورت ہے۔"

بے بنیاد اور مبالغہ آمیز نہیں تھا۔ میں اپنے الفاظ کے ثبوت میں ایک مثال اور پیش کر رہا ہوں۔

"اسی مذہب (اسلام) میں نہ خوبصورت
پتلی کمر والی فانی عورتوں کا لالچ دیا جاتا ہے نہ ناپاک
شراب پیش کی جاتی ہے نہ مشاہرہ مقرر ہوتا ہے۔"
(ص۔ ۲)

یہ الفاظ ایک عام قاری کے لئے اس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتے کہ عیسائیوں کے یہاں تبدیلی مذہب کے لئے یہ تمام ہتھکنڈے استعمال کئے جاتے ہیں لیکن ان کی اصل اہمیت کا احساس صرف وہی کر سکتا ہے جسے تفصیل سے ان ہتھکنڈوں کا واقعی علم ہو۔ عیسائیوں کے یہاں ہر شخص کی اس کی اہمیت اور اس کے مذہب کے لحاظ سے ایک قیمت مقرر ہوتی ہے۔ مسلمان کی قیمت دیگر تمام مذاہب کے پیروؤں سے زیادہ ہے۔ یعنی وہ دوسروں کے مقابلے میں عیسائی ہونے کے لئے ایک مسلمان کو سب سے زیادہ رقم دینے کے لئے تیار ہوتے ہیں۔ تبدیلی مذہب کرنے والا باقاعدہ سودے بازی کر سکتا ہے۔ جس میں وہ عارضی یا مستقل شریک حیات کی فرمائش بھی رکھ سکتا ہے رقم کبھی ایک مشت ادا نہیں کی جاتی۔ مثلاً میرے ایک دوست کو (جو الحمدللہ عیسائیت کے خلاف ایک سرگرم مبلغ ہیں) دس لاکھ روپے کی پیش کش کی گئی جس میں سے پانچ لاکھ لازمی بچت (فکسڈ ڈپازٹ) کے کھاتے میں بینک میں جمع ہونے تھے اور اس کا ماہانہ سود خرچ کے لئے ان کو ملتے رہنا تجویز کیا گیا۔ باقی پانچ لاکھ روپے تین سال کے عرصے میں ان کے کام کی ترقی کی رفتار کو دیکھتے ہوئے نقد ادا کئے جانے طے کئے گئے ان کا اسلامی نام بدستور برقرار رہنا تھا اور ان کو دکھاوے کا مسلمان بنا رہ کر مسلمانوں ہی میں اسلام کے خلاف کام کرنا تھا۔ میرے مذکورہ دوست علمائے دین کو باخبر رکھتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کے لئے اسی حد تک جا سکے کیونکہ

تسلیم کر لینے کے بعد تبدیلئ مذہب کرنے والے کو، اگر اس کی فرمائش نہ بھی ہو، تب بھی امتحاناً شراب میں پلائی جاتی ہیں اور لڑکیاں پیش کی جاتی ہیں۔ میں اس بات کا تذکرہ فخریہ نہیں کر رہا ہوں بلکہ تحدیثِ نعمت کے طور پر کر رہا ہوں کہ خود راقم الحروف کے پاس ۲۵ لاکھ روپے کا آفر صرف اس تعاون کی امید میں آچکا ہے کہ میں غیر مسلموں میں تبلیغ دین کا کام چھوڑ کر اس رقم سے مسلمانوں کی فلاح کا کوئی ادارہ کھول لوں اور عیسائی مذہب کی کمزوریوں کو بے نقاب کرنے سے باز رہوں۔ میرے پاس جو صاحب سفارتی مشن لے کر آئے تھے وہ شروع کے دو دن مسلمان بنے رہے اور پنج وقتہ نماز باجماعت کے ساتھ تہجد کا اہتمام بھی فرماتے رہے الحمد للہ۔ اللہ تعالے نے مجھے محفوظ رکھا۔

عیسائی مبلغین کے اداروں میں کثیر تعداد میں ایسی خوب صورت لڑکیاں بظاہر ملازم ہیں جن کی اصل ڈیوٹی ہے غیر عیسائی لڑکوں سے تعلقات بڑھا کر شادی کرنا ہے۔ ایسی کسی لڑکی سے جب کوئی مسلمان اس شرط پر بھی شادی کرتا ہے کہ وہ مسلمان ہو جائیں تو وہ بخوشی کلمہ پڑھ کر اسلام قبول کرنے کا اعلان کر دیتی ہیں کیونکہ اگلے دو تین برس میں یہ شوہر و بیوی دونوں عیسائی ہو جاتے ہیں شوہر کو اس کے بالعوض سے اچھی ملازمت یا کاروباری مواقع فراہم کئے جاتے ہیں۔

اس مختصر تحریر میں یہ گنجائش نہیں ہے کہ میرے علم میں عیسائی مشنریوں (تبلیغی اداروں) کے ہتھکنڈوں کی جو تفصیلات (ان کے خفیہ اداروں کے پتوں کے ساتھ) ہیں، انہیں کھول سکوں۔ یہاں تو چند حقائق بیان کر کے مولانا کی وسیع النظری اور حالات سے باخبری کا اعتراف مقصود تھا۔

وقت فرصت ہے کہاں؟ کام ابھی باقی ہے
نور توحید کا اتمام ابھی باقی ہے

سمندر کو قطرے میں سمو دینے کے بعد مولانا ان غیر مسلمین کی چند مثالیں ۳۰ صفحات میں پیش کرتے ہیں جنہوں نے اسلام یا پیغمبر اسلام صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کا اعتراف کیا ہے۔ لیکن مولانا اتنے کام پر مطمئن نہیں ہیں اور ان حوالوں کو نقل کرنے سے قبل اس ضرورت کا اظہار کرتے ہیں کہ اس کام کو آگے بڑھنا چاہیے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں۔

> "میں اپنے باوقعت اور سچے دعوے کے واسطے مشتے نمونہ از خروارے چند گواہ پیش کرتا ہوں۔ اگر اس قسم کے شواہد جمع کرنے میں تھوڑی سی کوشش کی جاتے تو یقیناً ایک دفتر عظیم تیار ہو۔" (ص۔ ۱۶)

کاش مولانا کی خواہش کو پورا کر سکنے کے اہل حضرات اس جانب کچھ توجہ فرما سکیں۔

یہ کس الجھی ہوئی گتھی کو سلجھانے کی باتیں ہیں؟

مجھے اپنی کم علمی کا اعتراف ہے کہ رسالہ مذکور کے چند جملوں کا مفہوم میں ابھی نہیں سمجھ سکا۔ مثلاً درج ذیل جملہ۔

> "ہمارے مہذب مذہب نے ہم کو بے غیرتی اور بے حیائی سے باز رکھا۔ نہ مسلمان کھڑے ہو کر دھار لگائیں، نہ مذہبی کتاب کے اوراق سے چوتڑ"۔ (ص۔ ۱۳)

عیسائیوں اور ہندوؤں کی رسومات کے خاطر خواہ مطالعے کے بعد بھی میں ان دونوں گروہوں کی کسی ایسی بے احتیاطی سے واقف نہیں ہوں کہ وہ اپنی مذہبی کتابوں کی بے حرمتی کو روا رکھتے ہوں چہ جائے کہ ان کے اوراق اپنے کولہوں سے لگائیں۔

پرونا ایک ہی تسبیح میں ان بکھرے دانوں کا
جو مشکل ہے تو اس مشکل کو آساں کر کے چھوڑونگا

مولانا حسن رضا خاں صاحب بریلوی رحمۃ اللہ تعالے علیہ

کے مصنف کتابچے "دینِ حسن" میں مولانا کے اپنے تحریر کردہ
۱۷ صفحات پر مندرجہ بالا سطور میں میں نے اپنے خیالات کا
اظہار کیا ہے جس سے قارئین سنی دنیا کو یقیناً اس مجلہ کی
افادیت و اہمیت کا کچھ اندازہ ہوا ہوگا لیکن انتہائی دکھ کا مقام
ہے کہ مولانا کا علمیہ جتنا بیش قیمت ہے اتنے ہی ارزاں ملفوف
میں اسے پیش کیا گیا ہے۔ اللہ تعالےٰ کی قدرت ہی ہے کہ
حوادثِ زمانہ کی کارفرمائیوں کے باوجود یہ تلف ہونے سے
محفوظ رہ سکا۔ غالباً ۱۸۸۸ء میں طبع شدہ اس مجلہ کا ایک
ایک جزء اپنی کہن سالی کی فریاد کر رہا ہے۔ مولانا کے نام سے
واقف حضرات کے علاوہ تو کوئی وہ ہمت بچا کر ہی نہیں
سکتا کہ کسی کتب فروش کے اسٹال سے دیدہ زیب کتابوں
و رسالوں کے جھرمٹ سے اسے خرید سکے۔ (ویسے بھی یہ کتب
فروشوں کے یہاں دستیاب نہیں ہوگا)۔ ضرورت اس امر
کی ہے کہ اس قیمتی کتابچہ کو خوب صورت کتابت اور معیاری طباعت
کے ساتھ اردو، ہندی اور انگریزی زبانوں میں اچھے کاغذ
پر اس کے مندرجات کے شایانِ شان انداز میں شائع کیا
جائے۔ اس سلسلے میں چند مشوروں کے ساتھ میں کچھ اغلاط کی
نشاندہی ضروری سمجھتا ہوں۔

کتابچے کو مفید تر بنانے کے لئے مزید حواشی کی سخت ضرورت
ہے۔ مثلاً اس میں ڈاکٹر جی۔ ڈبلیو۔ لائٹنر کا مندرجہ ذیل جملہ
ملاحظہ ہو۔

" لیکن مسلمانوں میں یہ عقیدہ بڑھتے بڑھتے ان
کی مذہبی عمارت کا وہ پتھر بن گیا جو ٹھوکر کھانے
والے کونے پر لشکار رہتا ہے۔" (ص۔ ۱۸)

اس عبارت کے ذیل میں مؤلف کا مختصر سا دو سطری نوٹ
بالکل ناکافی ہے۔ "کونے کے سرے کا پتھر" بائبل کی ایک
مخصوص اصطلاح ہے۔ جو اس میں بہ کثرت استعمال ہوئی ہے
میں طوالت کے خوف سے اس تشریح کو چھوڑتے ہوئے صرف
تشریح کی ضرورت کے اظہار پر ہی اکتفا کر رہا ہوں۔

اشاعتِ جدید میں انگریز مصنفین اور انگریزی کتب
کے ناموں کی اردو کتابت میں فاش غلطیوں کا درست ہونا

انگریزی زبان میں بھی لکھ دیا جائے۔ اس قسم کی غلطیاں
کتابچے میں کثرت سے ہیں۔ مثلاً۔

ص۔ ۲۲ پر سرخی " ریوائزڈ فیتھ آف اسلام " (Revised Faith of Islam) ہونی چاہیے۔

ص۔ ۲۵ پر " سر ولیم " کی جگہ " سر ولیم میور " ہونا چاہیے
اسی صفحہ پر " واشنگٹن ارون " میں " ارون " باریک
کتابت میں تحریر ہے اور نام کا جز نہیں معلوم ہوتا۔ اسے بھی
جلی حروف ہونا چاہیے تھا۔ ص۔ ۲۵ ہی پر " قول گبن مورخ "
کے بجائے اس طرح ہونا چاہیے۔ " (مورخ) گبن "۔

ص۔ ۳۳ پر " تامس کارلائل مصنف لیکچرز ان ہیروز " میں " لیکچرز
آن ہیروز " لکھا جائے گا اور چونکہ یہ کتاب کا نام ہے اس لئے
یہ بھی سرخی میں جلی حروف میں آئے گا۔

سرخیوں کی یہ اغلاط کتاب میں بہ کثرت ہیں جن میں سے
صرف چند کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ان کا درست ہونا ضروری ہے

کتابت نہ صرف جدید معیار کے مطابق انتہائی ناقص ہے
بلکہ کتابت کی غلطیاں بھی بہت ہیں۔ چند کی نشاندہی کر رہا ہوں
ص ۱۵ پر ۱۴ ویں سطر میں " اپنے منہ میاں مٹھو " میں سے
لفظ " منھ " چھوٹ گیا ہے۔ ص۔ ۲۳ پر نیچے سے دوسری
سطر میں " رفع کردوں " کے بجائے " رفع کرد " لکھا ہے۔ نون
غنہ " چھوٹ گیا ہے۔ ص ۲۷ پر ۱۲ ویں سطر میں " خدا کی ہی آواز
ہے " میں سے لفظ " کی " غائب ہے۔ ص ۳۹ پر ۷ ویں
سطر کا آخری لفظ " خیال " کے بجائے " خلاف " ہوگا۔

حضرت کاتب کی ہی ایک اور بے احتیاطی کا تدارک ضروری
ہے۔ نعت کے مصرعوں کو جابجا انہوں نے ایک ہی لائن میں
اس طرح لکھا ہے کہ تین تین مصرعے ایک لائن میں تحریر کر دیئے
ہیں اور اچھی خاصی نظم کو نثر میں بدل دیا ہے۔ ایسی مثالیں
ص۔ ۳۲، ۴۳ اور ۴۴ پر موجود ہیں۔

یہ تیرے بعد بھی دیکھیں گے بہارِ عالم

ماہ و سال گزر گئے۔ مولانا نے جو موتی بکھیرے تھے ان
کی آب و تاب بدستور برقرار ہے لیکن انہیں چننے والوں نے

مولانا حسن اور انکی نثری خدمات
ایک جائزہ

مولانا امجد رضا خاں ڈائرکٹر ادارہ اصحاب قلم پٹنہ

ہندوستان کے ادبی علمی اور ثقافتی افق پر بہت سے نجوم و کواکب بدر درخشاں بن کر چمکے جن کی تابناک کرنوں نے علم و ادب کے ہر گوشے کو منور و تابناک کیا اور جن کی ہستیاں اور عبقری شخصیتیں علم و ادب اور ثقافت کی آج بھی زندہ جاوید علامت ہیں۔

حضرت استاذ زمن علیہ الرحمہ بھی اپنے عہد کے ممتاز عالم دین، صاحب طرز ادیب اور قادر الکلام شاعر تھے۔ آپ نے ادبی اور مذہبی دونوں خدمات انجام دیں۔ لیکن مذہبی خدمات زیادہ غالب رہیں جس کے باعث آپ کی ادبی شخصیت دب کر رہ گئی بحیثیت ادیب آپ نے زبان و بیان اور علم و ادب کی جو نثری خدمات انجام دی ہیں وہ ایک مسلمہ حقیقت ہے۔

آج کی دنیا استاذ زمن حضرت حسن بریلوی کو صرف ایک کہنہ مشق اور ماہر فن شاعر کی حیثیت سے جانتی ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ وہ ایک جید عالم بھی تھے۔ ان کی تحقیقی صلاحیت عالمانہ وقار اور ناقدانہ بصیرت بھی اعلیٰ درجہ کی تھی۔ مگر اب حالات ایسے ہوگئے ہیں کہ ان کی شخصیت پر پردہ خفا اتنی دبیز چادر پڑ گئی ہے جس کی نقاب کشائی اہل علم کے لئے ایک چیلنج ہے۔ حالانکہ انہوں نے اپنی حیات ظاہری میں زبان و ادب اور قوم و ملت کے لئے عظیم لمحات کی قربانیاں دی ہیں۔ عین حیات کبھی اپنے قلم اور اپنی زبان کو زنگ آلود نہ ہونے دیا۔ اور نہ کبھی ان کے ذہن و فکر اور فہم و تدبر پر جمود طاری ہوا۔

ایسے ماحول میں "ماہنامہ سنی دنیا" کے اراکین و متعلقین کا یہ مبارک اقدام لائق صد تحسین و ستائش ہے۔ ہر چند کہ اس تحریک کو آج نہیں برسوں پیشتر ہونا چاہئے تھا۔ مگر دیر سے ہی سہی اس کا جمود تو ٹوٹا۔ اور سمندر کی تہہ میں چھپے موتیوں کے سراغ لگانے والوں کا قافلہ تو چل پڑا۔

فالحمد للہ علی ذالک

مسلسل تگ و دو، دوڑ دھوپ اور مشین کی طرح محنت و مشقت کے بعد حضرت استاذ زمن کے بعض تحقیقی مقالے، تنقیدی مضامین، ادبی آرٹیکلس اور تصنیفی جواہر پارے مختلف مقامات سے حاصل کر سکا۔ مگر بیشتر کتابیں حضرت مولانا مفتی محمود صاحب قبلہ قادری رفاقتی کی ذاتی لائبریری سے دستیاب ہوئیں اور موصوف نے بخوشی اپنی کتابیں مطالعہ کے لئے عنایت کیں۔

(ادام فیوضہ علینا)

آپ کی جملہ تصانیف کا علم تو نہ ہوسکا۔ مگر جناب نظیر لدھیانوی صاحب کی کتاب "شعر حسن" مطبوعہ لاہور کی تقدیم میں حضرت مرید احمد چشتی نے استاذ زمن کی تصنیفات کی اس طرح وضاحت کی ہے۔

تزک مرتضوی، نگارستان لطافت، بے موقع فریاد کا مہذب جواب، آئینہ قیامت، دین حسن، وسائل بخشش مثنوی ذوق نعت، ثمر فصاحت، قند فارسی کلام، صمصام حسن بردابر فتن، ندوہ کی روداد سوم کا نتیجہ،

مگر مجھے حضرت مفتی محمود صاحب کی ذاتی لائبریری میں ایک اور کتاب بنام "سوالات حق نما" دستیاب ہوئی اور علامہ ڈاکٹر حسن رضا خاں پی۔ ایچ۔ ڈی پٹنہ کی مایۂ ناز تصنیف "فقیہ اسلام" میں ایک اور کتاب "ساغر پر کیف" کا تذکرہ ملا۔ جس سے اس امکان کو تقویت ملتی ہے کہ اس کے علاوہ اور بھی تصنیفات ہیں جس سے سب لوگ واقف نہیں ہیں ——— ہو سکتا ہے بعض حضرات نے ایک ہی کتاب کو دو نام سے شمار کر دیا ہو۔ مگر مجھے چونکہ ان کی جملہ تصنیفات دستیاب نہیں ہو سکیں اس لئے یقینی طور پر کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اب جستہ جستہ استاذ زمن کی بعض کتابوں اور ادبی مضامین کے اقتباسات ملاحظہ کریں۔ بعض بعض جگہ میں نے بڑے طویل اقتباسات نقل کر دیئے ہیں۔ جس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ ان کی تحریریں مدفون خزینہ سے کم نہیں جس کا حصول یقیناً نعمت غیر مترقبہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ چند اقتباسات کے ذریعہ اگر ہم اس دفینہ کا پتہ لگا لیتے ہیں تو پھر اس کا حصول جذبۂ صادق کے لئے یقیناً آسان ہو جائے گا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ان کے مضامین میں جملوں کا ارتباط اس حد تک ہے کہ اس کو درمیان سے قطع کرنا گویا اس کی افادیت و اہمیت کو مجروح کرنا ہے۔ جب ان کے کسی اقتباسات سے ان کی نظریات کا سراغ ہی نہ مل سکے تو پھر کاغذ سیاہ کرنے سے فائدہ ہی کیا؟۔ میں نے نقل اقتباسات میں اس امر کا بہر حال خیال رکھا ہے کہ قارئین ان کے نظریات سے آگاہ ہو جائیں۔

① استاذ زمن کا عربی خطبہ

استاذ زمن نے خدمت دین متین اور احقاق مذہب حقہ کے لئے بہت سارے جتن کئے۔ ہزارہا مشکلات در پیش آئیں مگر تمام مشکلات و مصائب کا ہنستے کھیلتے مقابلہ کیا آپ کا ذہن اور آپ کی فہم و تدبر ہمیشہ انہی صالح اور پاکیزہ مشن کے فروغ کے لئے کوشاں رہی۔ انہی صالح جذبات کے تحت آپ نے ایک ماہنامہ رسالہ "قہر الدیان" کا بھی اجرا کیا تھا جس کا پہلا شمارہ جو "ہدایت نوری" کے نام سے موسوم ہے آپ کی اسی ذہنیت کی مشعر اور اسی تحریک کی آئینہ دار ہے۔

آپ نے اس رسالہ میں ایک عربی خطبہ لکھا ہے جس کے مطالعہ سے عربی ادب پر آپ کی گرفت اور صلاحیت و قابلیت کا پتہ چلتا ہے۔ زبان بہت سلیس اور سہل استعمال ہوئی ہے مگر وہ در حقیقت معنویت اور ادبیت کا سرچشمہ ہے۔ جس میں براءت استہلال کی ندرت اپنے جوبن پر نظر آتی ہے۔ تراکیب الفاظ جملوں کا ارتباط اور پھر مقفیٰ عبارتوں کی تزئین کاری نے اسے عربی کا نادر نمونہ بنا دیا ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

الحمد لله وكفى، سمع الله لمن دعا، ليس وراء الله منتهى، ان ربي لطيف لمن يشاء صلوات العلى الاعلى و تسليماته المنزه على الانتها و بركاته التي تنمى و تمنى على خاتم النبيين جميعا فمن تنبأ بعده تاما او ناقصا فقد كفر و غوى الله اكبر على من عات و عتا و مرد و عصى وفى هوة هواه هوى۔ اللهم اجرنا من ان نذل و نخزى او نزل و نشقى۔ ربنا وانصرنا بنصرك على من طغى و بغى و ضل و اضل عن سبيل الاهتدا اصل على المولى و اله و صحبه ابدا ابدا و اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له احدا صمدا و ان محمدا عبده و رسوله بالحق و دين الهدى صلى الله تعالى عليه وسلم و على اله و صحبه دائما سرمدا۔

② ماہنامہ "قہر الدیان" اور استاذ زمن کا اداریہ

ماہنامہ قہر الدیان جس کے خود آپ ہی مدیر تھے۔ ایسے وقت میں جاری ہوا جب کہ قادیانیت اور مرزائیت اپنے بال و پر پھیلا رہی تھی اور اس کے مکروہ و گھنونے افکار و نظریات ہندوستان کے طول و عرض میں پھیل رہے تھے۔ یقیناً آپ کی یہ جراءت

مندانہ اقدام حالات و مقتضیات کے عین مطابق تھا۔
قہر الدیان کا پہلا شمارہ میری نظر دل کے سامنے ہے جس کا اداریہ بھی ان رنگ و روغن سے مملو ہے جو اس کی اشاعت کے محرکات ہیں۔

"مدتے ایں مثنوی تاخیر شد
مہلتے بایست تا خوں شیر شد

اللہ عزوجل اپنے دین کا ناصر اپنے بندوں کا کفیل حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔ رسالہ ماہواری رد قادیانی کی ابتدا الحکمۃ الٰہیہ نے اس وقت رکھی تھی کہ یہاں تو چار جاہلان محض اس کے مرید ہو آئے۔ مسلمانوں نے حسب حکم شرع شریف ان سے میل جول ارتباط سلام کلام اختلاط یکلخت ترک کر دیا۔ دین میں فساد مسلمانوں میں فتنہ پیدا کرنے والوں نے یہ العذاب الادنیٰ دون العذاب الاکبر چکھا۔ مسلمانوں پر حملے میں اپنی چلتی کوئی گتی نہ کی۔ بس نہ چلا تو متواتر عرضیاں دیں کہ ہمارا پانی بند ہے۔ ہم پر زندگی تلخ ہے۔ بیدار مغز حکومت ایسی لغویات کو کب سنتی ہر بار جواب ملا کہ مذہبی امور میں دست اندازی نہ ہوگی۔ سالملاں آپ اپنا انتظام کر لیں۔ آخر بحکم آنکہ ؎

دست بگیرد سر شمشیر تیز

ایک بے قید پرچے رد ہیل کھنڈ گزٹ میں اشتہار چھاپا کہ عمائد شہر اگر علماء سے مناظرہ کرائیں اور وہ بھی اس شرط پر کہ دونوں طرف سے خود ہی منتظم رہیں تو ہمیں اطلاع دیں کہ ہم بھی اپنے مرزائی ملاؤں کو بلالیں۔ اور اس میں علماء اہلسنت کی شان میں کوئی دقیقہ بدزبانی و اکاذیب و بہتانی و کلمات شیطانی کا اٹھا نہ رکھا۔ یہ حرکت نہ فقط ان بے علم بے فہم مرزائیوں بلکہ بعونہ تعالیٰ خود مرزا کے حق میں کا لباعث عن حتفہ بظلفہ سے کم نہ تھی

؎ سست بازو بجہل می فگند
پنجہ با مرد آہنیں چنگالے

مگر از انجا کہ عسیٰ ان تکرھوا شیئاً وھو خیر لکم۔ ؎

خدا شرے برانگیزد کہ خیر ما دراں باشد

یہ ایک غیبی تحریک خیر ہو گئی جس نے اس ارادہ رسالہ کی سلسلہ جنبانی فرما دی۔ اشتہار کا جواب اشتہاروں میں دیا گیا۔ مناظرہ کے لئے اسکے افکار مرزا قادیانی کو پیام دیا اس کے ہولناک اقوال، ادعائے رسالت و نبوت و افضلیت من الانبیاء وغیرہا کفر و ضلال کا خاکہ اڑایا۔ گالیوں کے جواب میں گالیوں سے قطعاً احتراز کیا۔ صرف اتنا دکھایا کہ تمہاری گالی آج کے نرالی نہیں قادیانی تو ہمیشہ سے اللہ و رسول انبیاء سابقین و ائمہ دین سب کو گالیاں سنا چکا ہے۔ ہر عبارت اس کی کتابوں سے بحوالہ صفحہ مذکور ہوئی۔ مضمون کثیر تھا متعدد پرچوں میں اشاعت منظور ہوئی "ہدایت نوری بجواب اطلاع ضروری"، نام رکھا گیا۔ اس میں دعوت مناظرہ، شرائط مناظرہ طریق مناظرہ، مبادی مناظرہ سب کچھ موجود ہیں۔

اس مختصر تحریر نے اپنی مسلک نیز متعدد سائل لئے۔
سلسلہ دشنامہائے قادیانی بر حضرت ربانی و رسولان رحمانی و محبوبان یزدانی سلسلہ کفریات و ضلالات قادیانی، سلسلہ تناقضات و تہافتات قادیانی، سلسلہ دجالی و تلبیسات قادیانی، سلسلہ جہالات و بطالات قادیانی سلسلہ اصیلات سلسلہ سوالات۔ اور واقعی وقتی ضرورات مختلف مضامین پر کلام مقتضی ہوتی ہے اور اس کے اکثر رسائل الٹ پھیر

کرا نہیں ڈھاک تین پات کی حامل۔ لہذا ہر رسالہ کے جدا گانہ رد سے انہیں سلاسل کا انتظام احسن و اولی ہے۔
اب بعونہ تعالے اسی "ہدایت نوری" سے ابتدائے رسالہ ہے اور مولے تعالے رحم فرمانے والا ہے۔

۴ ندوہ کی روداد سوم اور استاد زمن کی تنقید

اردو ادب میں نقد و نظر کا بڑا اہم مقام ہے۔ مگر یہ کام ایک متبحر اور علم دوست شخصیت کا ہے چوں کہ یہ ایک الگ فن ہے جو سبھوں کے بس کی بات نہیں۔ بلکہ ایک باریک بیں، نازک خیال، نکتہ رس اور نکتہ داں شخصیت ہی کا حصہ ہے۔

بعض نقاد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کی تخریب میں نمایاں پہلو ہوتا ہے۔ اور وہ اردو کی تعمیر اور خدمت کے بجائے ذاتی مخاصمت پر پوری قوت صرف کر دیتے ہیں ——
مگر آئیے استاد زمن کی تنقید کا بھی مطالعہ کریں جن کے ہر ہر جملے میں تعمیری تنقید کی جھلک نمایاں ہے۔ اور ہر ہر سطر میں علم کا بحر ناپیدا کنار موجزن ہے —— "ندوہ کی مختصر روداد سوم" جو غالباً ۱۳۱۴ھ میں شائع ہوئی تھی آپ نے اس کے بعض جملے پر بڑے حسین اور مؤثر انداز میں تنقید کی ہے۔ جس کی ایک جھلک ہم قارئین کی نذر کر رہے ہیں۔

قولہ: یہی وہ تعلیم ہے جس کی اشاعت ندوہ چاہتی ہے۔

اقول: کچھ حیا بھی ہے کیا معاذ اللہ رسول اللہ صلے اللہ تعالے علیہ وآلہ وسلم کی یہی تعلیم تھی کہ رافضیوں کی تعظیم کرو، وہابیوں کے غلام بنو، نیچریوں کی لوسہ لیسی کرو، انہیں سب کو دینی پیشوا بنا کر مسند واعظ پر جلوہ دو، ان کے کفریات وضلالات پر سکوت محض کرو بلکہ تحسین کر کے خود چھاپو، اشاعتیں دو، ان کا رد قطعاً حرام کرو، سنیوں سے عداوت، سنیوں پر تبرا اپنا دینی تمغہ جانو۔ خدارا انصاف کیا یہی تعلیم محمدی ہے۔ ماشاء اللہ ان کی تعلیم پاک بالکل اس کے خلاف ہے ولکن المنافقین لا یعلمون

قولہ: ندوہ کی پکار کوئی معمولی پکار نہیں۔

اقول: یہ سچ ہے ایک پہلے ہوئی تھی جس کا اثر اجتماع احزاب تھا۔ دوسرے تیرہ سو برس کے بعد اب ہوئی جس کا اثر مذاہب نامطلوب ہے مگر انشاء اللہ تعالے سیھزم الجمع ویولون الدبر

قولہ: علماء ربانیین کی پکار ہے۔

اقول: ضرور غیر مقلد، نیچری، رافضی اور وہابی اگر علماء ربانیین نہ ہوں گے تو کیا اہلسنت ہوں گے۔

قولہ: ندوہ نے نعرہ کیا اور ہر طرف سے لبیک کی صدائیں آنے لگیں۔

اقول: کیا احزاب سے بھی زیادہ

قولہ: جلسے کا اعلان ہوا اور عالم میں ہلچل پڑ گئی۔

اقول: اور ہلچل بھی کیسی تزول منہ الجبال

قولہ: اہل اسلام کے طبقہ میں جوش پھیل گیا۔

اقول: سچ ہے مگر اہل باطل میں یوں کہ یمیلون علیکم میلۃ واحدۃ سب مل کر ایک ساتھ اہل حق پر نرغہ کریں اور اہل حق میں یوں کہ الذین قالو الہم الناس ان الناس قد جمعوا لکم فاخشوھم فزادھم ایمانا وقالوا حسبنا اللہ ونعم الوکیل۔

قولہ: الحق یعلو ولا یعلی۔

اقول: ضرور حق ہے جب تو اہلسنت کے ستر سوالات اور ان کے بعد بے شمار ارشادات کا جواب ندوہ بھر کی پارٹی سے آج تک نہ ہو سکا اور قیامت تک نہ ہو سکے گا۔

قولہ:۔ جس وقت ندوہ نے اپنا قدم بریلی میں رکھا
مخالفت کا اثر ایسا کافور ہونے لگا جیسے
آفتاب کے آگے ظلمت۔

اقول:۔ آپ نے بھی کیا پامال مثال دی، یوں کہئے
جیسے حضرت تاج الفحول، محب الرسول مدظلہ
العالی کے مقابلے سے مسجد جامع میں صدر
ندوہ آپ کے ساتھ ایک شہادت بھی نہیں
اور ہمارے صدق پر ہزاروں مسلمانوں کی
شہادتیں موجود۔ سرگزشت و ماجرائے
ندوہ میں امر چہار دہم ملاحظہ ہو شرم شرم شرما

قولہ:۔ ندوۃ العلماء ایک اجنبی نام لفظ ہے جس کو
اکثروں نے آج ہی سنا ہوگا۔

اقول:۔ ندوہ تو پرانا لفظ ہے تیرہ سو برس سے سنتے
آتے۔ ہاں ندوۃ الکفر تھا۔ علماء کا قائم مقام
ہونا ضرور نیا ہے کہ اس سے پہلے نہ سنا۔

قولہ:۔ بعض حضرات کو اغراض ندوہ پر شبہے ہوئے
ہیں لیکن وہ شبہے بالکل غلط ہیں۔ ندوہ
کا مقصد نہ شیعہ سنی نہ مقلد و غیر مقلد کو
ایک بنانا ہے نہ کوئی دوسرا مذہب معجون مرکب
ایجاد کرنا ہے۔

اقول:۔ بریلی کے سنی بھی عجیب حضرات ہیں۔ دندمچا
رکھا ہے کہ ہمارے ایک سوال کا بھی جواب
ندوی علماء سے نہ ہو سکا۔ آئیں اور تمام
دینی مذہبی کتابوں دفتروں کا بس ایک جامع مانع
جملہ ہے (لیکن وہ شبہے بالکل غلط ہیں)
مسکت جواب لیں۔ چلئے قصہ تمام ہوا۔
حضرات آپ کہتے ہیں کہ ندوہ کا مقصد
سنی، شیعہ، مقلد غیر مقلد کو ایک بنانا وغیرہ
نہیں ہے۔ ندوہ کا ارشاد ہے کہ سب بانٹ
کر کھاؤ، شیر و شکر ہو کر رہو ورنہ ایمان
ندارد، نماز بے کار، روزہ اکارت۔ یہ
الفاظ یہ کلمات یہ جملے یہ اعلانات ندویوں
کی کتابوں روادوں میں چھپے ہیں
چھپے نہیں۔

قولہ:۔ نیچریت اور الحادیت ترقی پا رہی ہیں چلے
مولوی شبلی صاحب برامائیں۔

اقول:۔ جزاک اللہ عمر بھر میں یہ ایک کہی ہے
کیوں کہ مولوی شبلی صاحب کچھ بچے تو نہ
ہوتے ہوں گے۔ غیرت ہو تو ندوہ بھر کو ڈوب
جانا چاہئے۔

(۴) استاذ زمن کے اردو ادب کی چند جھلکیاں

آپ کی حق پسندی اور احقاق حق کی زندہ و جاوید مثال آپ
کی ایک کتاب "ندوہ کا تیجہ" بھی ہے۔ آپ نے اس تصنیف
میں بے خوف و خطر یہ بات ثابت کر دی ہے کہ ندوہ کا اصل مقصد
کیا ہے اور اس ندوہ اخیرہ کا دار الندوہ سے کتنا علاقہ ہے۔
بانیان ندوہ اپنے آپ کو حنفی اور اہل سنت سے تعبیر کرتے تھے۔
مگر استاذ زمن کی اس تصنیف سے ان کی پوری قلعی کھل گئی۔
"ندوہ کا تیجہ" کے ص ۸ پر آپ نے ظہور اسلام سے
پہلے کے حالات کو نہایت ہی شستہ الفاظ جدت تراکیب اور
مقفیٰ عبارتوں کے ساتھ بڑے حسین پیرایہ میں بیان فرمایا ہے
ذیل کا اقتباس اسی حقیقت کا ترجمان ہے۔

"اسلام کے ظہور سراپا نور سے پہلے
کفر کی تاریک گھٹا زمانہ پر چھائی ہوئی تھی۔ سچے
خدا کے مخلوق جھوٹے خدا کے فدائی تھے
جہالت کا زور، بے دینی کا شور ـــــ بات
بات پر قتال، فضولیات پر جدال ـــــ غضب
فساد، اقیات عناد ـــــ شب و روز
جھگڑے، آئے دن بکھیڑے ـــــ دو
میں لڑائی، ہزاروں کی صفائی ـــــ
جنگ محبوب، صلح معیوب ـــــ انسان
جاموں میں نہ تلوار نیاموں میں ـــــ صلح
پر لڑائی، لڑائی پر صفائی ـــــ مذہب خراب،

مشرب شراب ــــ زنانے میں، تمار باتیں ہاتھ کا کھیل ــــ انانیت کا جوش، نفسانیت کا غرور ششش ــــ صراط مستقیم ویران منزل حق سنسان ــــ مخالف ہوا زوروں پر، جاں گزا ظلم شور پر ــــ مریض جاں بلب، چارہ گر مایوس نہ تاب ــــ میٹھی نیند سونے والے میٹھی نیند سو رہے تھے، خفتہ بختوں کے نصیب اپنی تقدیر کو رو رہے تھے ــــ کہ دفعتاً ہوا کا رخ پھرا، خزاں کا عمل اٹھا، فصل بہار کا سکہ بیٹھا ــــ رات تک پژمردگی کا دور تھا، صبح ہوتے ہی کچھ اور تھا ــــ نور کی گھٹائیں چھائیں، ٹھنڈی ہوائیں آئیں ــــ رحمت کے بادل گھرے، افسردہ خاطروں کے دن پھرے ــــ کلیاں چٹکنے لگیں، گلیاں مہکنے لگیں ــــ کیوں نہ ہو کہ تہامہ کے مطلع حرم کے افق فاراں کی چوٹیوں سے آفتاب ہاشمی نے طلوع فرمایا ــــ"

کتاب مذکورہ کا ابتدائی حصہ بھی اسی رنگ و آہنگ میں ڈھلا ہوا ہے۔ مگر وہاں ان کے قلم کی جولانیت مرکز کائنات کے حضور سجود نیاز لٹاتی ہوئی نظر آتی ہے۔ اور یوں معلوم ہوتا ہے جیسے عشق کا بانکپن سلک تحریر میں پرو دیا گیا ہو ــــ آپ فرماتے ہیں۔

حمد و نعت کچھ ایسے پیارے اور دلچسپ کام ہے جس کا انصرام بشری طاقت بلکہ ملکی قوت سے بھی باہر۔ پھر بھی جسے دیکھئے وہ اپنی تحریروں اپنی تقریروں کے عنوان کو انہی سے عزت دینے میں سعی کرتا ہے۔ لہذا اثر کا میں بھی اس مبارک دولت سے حصہ لینا اور سرنامہ کو اس نام سے عزت دینا چاہتا ہوں۔

خدا، خدا ہے۔ محمد، مصطفےٰ ہے جل شانہ و صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔ اول کے سجود کو سرنیاز موجود، خاتم پر بے شمار سلام بے نہایت درود، وہ ایسا خدا ہے جس کے ہاتھ میں ایسے کی جان ہے۔ یہ ایسا محبوب ہے کہ جس کے اختیار میں سارا جہان ہے جس طرح اللہ محمد کے وصل میں فصل نہیں اسی طرح حمد و نعت میں فراق کو دخل نہیں جو مسلمان حمد لکھے گا نعت نہ چھوڑے گا۔ کعبہ جائے گا مدینہ سے منہ نہ موڑے گا جہاں اللہ ہے وہاں محمد رسول اللہ ہے۔ جہاں محمد رسول اللہ ہے وہاں اللہ ہی اللہ ہے فرش سے عرش تک دھوم ہے۔ ذرہ ذرہ کو معلوم ہے۔ وہ خدا ہے برتر، یہ ہمارا پیغمبر۔ نہ اس کا کوئی مثل نہ اس کا کوئی ہمسر۔ محبین محبوب کے نام کو درد دل کا تعویذ بناتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ درد و دل سے پاک ہے۔ اس نے اپنے محبوب کے نام سے اپنے فرشتوں کی آنکھوں کے سینوں، مسلمانوں کے دلوں، عرش و کرسی بلکہ تمام مقدس مقاموں کو زینت بخشی۔

ملائکہ کی محفل میں جائیے تو انھیں کا چرچا، حوروں کی انجمن میں دیکھئے تو انہیں کا غلغلہ۔ پیارے محبوب کی دونوں جہان میں دہائی پھر رہی ہے۔ ایک خدائی ہے کہ ان کے قدموں پر گر رہی ہے۔ حل سے حرم تک عرب سے عجم تک مختلف زبانوں پر ان کی یاد جاری، شرق سے غرب تک جنوب سے شمال تک ان کی یادگاری۔ زبان والے تو زبان والے بے زبانوں میں بھی انہی کی پکار ہے۔ غرض خدا کے

خدائی ہے ان پر نثار ہے۔

حضرت سلیمان نے شیر دیکھا ان کا نام لیا کتے کی طرح دم ہلاتا حفاظت کو ساتھ ہو لیا۔ اونٹ محنت سے عاجز آیا ان کے آستانہ پر فریاد لایا۔ پانی کی مچھلیاں انہی کی یاد میں موجیں کر رہی ہیں۔ ہوا کی چڑیاں ان ہی کی محبت کا دم بھر رہی ہیں۔ شام کے بسیرا لینے والے انہیں کا کھاتے ہیں، صبح کے چہچہانے والے انہیں کا گاتے ہیں۔ ؎

جس کا کھاتے ہیں انہیں کا گاتے ہیں

یہ تو ذی روح ہیں۔ اپنے مالک کو جانتے ہیں آقائے نعمت کو پہچانتے ہیں — ستون حنانہ ایک خشک لکڑی تھی۔ دل نہ زبان، نفس نہ جان — حضور نے منبر نو ساختہ پر خطبہ فرمایا، فراق محبوب نے ایسے خون رلایا۔ جس طرح دودھ پیتا بچہ ماں سے چھوٹ کر پھوٹ پھوٹ کر روتا جان کھوتا ہو۔ یہی حالت اس چوب خشک پر طاری تھی۔ فریاد و بکا کا ابر جاری تھی۔ یہاں تک کہ اس دلوں کے چین، جانوں کے آرام نے اسے سینہ مبارک سے لگایا تسکین پائی قرار آیا۔ خدا جانے وہ تسلی بخش ادا تھی یا کوئی تسکین دہ قرار، جس نے اس رونے والے کو دفعتہً خاموش کر دیا۔ دلہائے بے قرار میں صبر کوٹ کوٹ کر بھر دیا۔

اس محبوب کے واسطے آسمان سے رحمت برستی ہے۔ زمین سے امداد اگتی ہے سنگریزے باتیں کرتے ہیں، پیڑ سجدے میں قدموں پر سر دھرتے ہیں۔ قربان جاؤں کیا پیارا محبوب ہے۔ ؎

چاند شق ہو پیڑ بولیں جانور سجدہ کریں

بارک اللہ

مرجع عالم یہی سرکار ہے

⑤ استاذ زمن اور ندوۃ العلماء سے ستر سوالات

آپ کی ایک تالیف "سوالات حق نما بر رؤس ندوۃ العلماء" ہے جو انکشاف حق اور ادراکات باطل کے اصول پر مرتب کی گئی ہے اس کی تالیف کے محرکات کیا ہیں۔ علماء ندوہ سے ستر سوالات کیوں کئے گئے اور ان سوالات کو پردہ خفا سے منظر عام پر کیوں لایا گیا۔ استاذ زمن نے خود ان محرکات اور بنیادی وجوہات کو بیان کیا ہے۔ سوالات کئی صفحات میں ہیں جس کا بیان یہاں مناسب نہیں، یہاں ان کا ابتدائیہ پیش خدمت ہے۔ جس کا مطالعہ یقیناً آپ کے افادہ کا ضامن ہوگا۔

"اللہ اکبر! اس زمانۂ پر آشوب میں کہ بلائے مذہبی محیط و بلائے آزادی عالمگیر ہے ندوۃ العلماء سے علماء اہل سنت کو زیادہ کیا چیز خوشی کی ہوتی کہ اور تائید سنن کی طاقت متفقہ سے دفع فتن اب منہ اچاہے تو حرف انتباہ ہوا۔ امید تھی کہ براہ ہو۔ مگر مطالعہ اہل حق کی دینی حالت رو زوائد فاسدہ اور کتب ندوہ نے بعض نیرنگ زمانہ و محالات مفاسد زائدہ سے بتایا کہ اسے بھی سیر در بوزنت مذہب بیگانہ نے تحریرات میں بہت سینہ کر دکھایا۔ مضامین و باتیں صریح مخالف و مصنف مذہب اہلسنت در ہم ہوئیں۔ دعوئ اتحاد و اتفاق کی وسعتیں دائرہ بندی سنت و جماعت سے بے حد پار نکل گئیں۔ از انجا کہ خیر خواہی مسلمین ہر مسلمان پر لازم۔

رودادِ ندوہ

حصہ اول ص ۵۷ میں خود منصفانہ ارشاد ہوا ہے کہ "اس کی اصلاح ہر مسلمان پر فرض ہے جو غلطی ہو زبانی یا تحریرا اطلاع دیں، ہم منون ہوں گے"۔ عذر روش ندوہ کی کارروائیوں پر مذہبی راہ پر جوش کو کب

وخدشات ظاہر ہوتے محض خالصاً لوجہ اللہ
بلکہ خیر خواہی دین وخود باجازت واستعلائے
ندوہ بپیرایہ سوالات میں حاضر کیے گئے۔ جو
شخص کچھ بھی علم رکھتا اور عقائد ومسائل
اہل سنت سے واقف ہوگا ان سوالات کو کتب
ندوہ سے ملاتے ہی ان میں مذہب اہلسنت
سے جدائیوں کا وقوع اس پر صاف منکشف
ہوگا۔

۲۸ر شعبان ۱۳۱۳ھ کو بصیغہ رجسٹری اراکین
ندوہ میں حاضر کئے گئے۔ ۳۰ر شعبان کا لکھا
ہوا جواب ۲ر رمضان مبارک کو آیا کہ آپ
نے یہ زحمت ناحق اٹھائی۔ یہ امور تحریروں
سے حل نہیں ہوسکتے اس واسطے جواب
کی ضرورت نہیں ـــــ ۵ر رمضان المبارک
کو پھر ایک عریضہ مفصلہ مرسل ہوا اور اس
میں رب العزت جل وعلا کا نام پاک اور
حق اسلام وحق عظیم صاحب لولاک صلی
اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم یاد دلاکر التماس
کیا کہ سوالات وکتب ندوہ ملاکر ملاحظہ ہوں
ـــــ دیکھئے تو مذہب سنت سے کس
قدر صریح بیگانگیاں ہوئیں ـــــ پھر
بنظر تخفیف سوالات کو ۷۰ سے صرف ۸ر
پر مقصود کرکے قرآن عظیم کی دو آیتیں اخفا
علم اور کتمان شہادت کی تحریم میں تلاوت
کیں۔ اس بار ظن غالب تھا کہ ضرور
پاسخ راسخ عطا ہوگا۔

۱۱ر ماہ مبارک کا عنایت نامہ ۱۳ر کو آیا
اور وہی سکوت کی خبر لایا بارے بحمد اللہ
پھر بھی چند مفید وکار آمد باتوں نے شگاف
خامہ سے جلوہ دکھایا۔

اول۔ اشاروں اشاروں میں بعض تحریرات
ندوہ کا غلط ہونا قبول فرمالیا۔

دوم۔ تسلیم فرمایا کہ یہ باتیں جو ہم کر رہے ہیں شرعاً
حرام وممنوع ہیں۔

سوم۔ صاف صاف اقرار فرمایا کہ ہم نے ان کاروائیوں
میں تقیہ کیا ہے۔

چہارم۔ مان لیا کہ حضرت شیخ مجدد الف ثانی کا
یہ ارشاد بہت بجا ہے کہ بدمذہبوں کی صحبت
کافروں کی صحبت سے زیادہ مضر وفتنہ زا ہے۔"

⑨ مسئلہ حب وبغض اور استاد زمن کا نظریہ

الحب للہ والبغض للہ بھی بڑی نعمت ہے مگر وہ ماحول اور
وہ فضا جو ابن الوقتی، موقع شناسی، مطلب پرستی اور خود پسندی
سے متاثر ہو اس ماحول میں عظمت کردار کا مظاہرہ اور حب وبغض
میں رضائے الٰہی کا جذبہ گرانمایہ کا اظہار ایک ناقابل قبول
حقیقت ہے تاہم دنیا ایسے مردان پاکباز اور وسیع الظرف
انسانوں سے کبھی خالی نہیں رہی۔ یہ الگ بات ہے کہ ایسے افراد
انگلیوں پر گنے جانے کے مترادف ہیں ـــــ استاد زمن
علامہ حسن رضا خاں بریلوی بھی حب وبغض میں للٰہیت کے پیکر
تھے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے جو آپ کی نثری یادگاروں سے ظاہر
وباہر ہے۔

انہوں نے "سوالات حق نما" میں "مسئلہ حب وبغض پر
ضروری کلام" کی سرخی کے ساتھ اس موضوع پر نفیس گفتگو
کی ہے جو قابل قبول بھی ہے اور لائق عمل بھی ـــــ یہ اقتباس
ذرا طویل پیرایہ میں ہے مگر آپ اس کی طوالت سے مرعوب ہونے
کے بجائے اسے پڑھ کر دیکھیں ان کے فکری اور ادبی مضمون
میں خلوص وللٰہیت کا عنصر صاف طور پر نظر آجائے گا۔

"اے شجر بشر کی بے شمار شاخو آخر تم
ایک اصل ایک زمین ایک پانی ایک ہوا
سے ہو۔ ایک باپ کے بیٹے ایک ماں کی
اولاد، آپس میں حقیقی بھائی، ؎

در اصل خلقت یک جوہر یک

تم سب میں وہی اتحاد کا دور تھا جو سگے بھائیوں

میں ہوتا۔ پھر تم میں شقاق و خلاف نے کدھر
سے راہ پائی ـــــ مجانین تو بحث سے
خارج ہیں جن کی الفت یا نفرت کسی کے
لئے سبب درکار نہیں، میں تم عقلاء سے
پوچھتا ہوں کہ جب تم ایسا عظیم رشتہ یکجہتی
قائم ہے تو تمہارا باہم بلاوجہ خلاف یعنی
چہ ہاں وجوہ ضرور ہیں اور زر زمین و مال
پر ملک و جاہ و عرض وغیرہ بہت موفور ہیں
مگر ان سب میں نازک تر، سب سے سخت تر
تخالف مذہبی کہ چیز جتنی زیادہ عزیز اسی قدر اس
کے باعث نزع قوی ـــــ ہر پابند مذہب
کو اگرچہ کیسا ہی باطل ہو اپنے مذہب سے زیادہ
کوئی شئی پیاری نہیں۔ ہم دیکھتے ہیں بہت
سے لوگ مال و جاہ میں درگزر کر جاتے ہیں
چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ صلح پر آتے ہیں مگر اہل
مذہب، مذہب کا کوئی حصہ نہیں چھوڑتے
ترک درکنار بعض پر مصالحت کی گنجائش
نہیں رکھتے تو مخالف مذہب قدرتی طور
پر اعلیٰ ذریعہ بغض و منافرت ہے جس کا مٹا
دینا اٹھا دینا خارج از طوق بشریت ہے تو
ایسے امر میں کوشش فضول، علت تخالف
جب تک باقی تخلف معلول کیونکر معقول

چند سطور بعد

کوئی نزع مٹا کر فریقین میں سچا اتحاد
قائم کرنے کی تین صورتیں ہیں، ایک فریق دوسرے
فریق کا قول تسلیم کرے یا دونوں اپنے بعض
قول سے گزر کر کسی متوسط حد پر راضی ہو
جائے یا مابہ النزاع سے غرض ہی نہ رہے
کہ وجہ تنافس و تنافر باعث تدابر و تہاجر
ہو ـــــ اور جب فریقین متنازعہ فیہ
سے غرض بھی نہ چھوڑیں اور اپنے دعووں سے
تنزل بھی نہ کریں تو ارتفاع نزاع و قطع
انقطاع ہرگز معقول نہیں۔ دنیوی نزاعوں
میں یہ سب صورتیں میسر ـــــ ایک زمین
پر زید و عمر کا تنازع ہے۔ ان میں ایک مان
لے کہ واقعی یہ دوسرے کی ہے، یا نصف نصف
پر تصفیہ کرلیں یا ایک یا دونوں چھوڑ کر چلتے ہوں
کہ بلا سے کوئی لے ہم باز آئے مذہبی
نزاع میں ایسی کون سی صورت حضرات کے
عالی خیالات میں ہے۔ کیا سنی معاذ اللہ!
مذہب چھوڑ کر وہابی، رافضی، ناصبی ہو جائیں
یا یہ امید کہ باقی سب فرقے اپنے مذہب سے
تائب ہو کر مذہب حق پر ایمان لے آئیں۔ یا
یہ کچھ حصہ چھوڑ دیں کچھ پارہ مذہب سے منہ
موڑ لیں۔ آدھوں آدھ پر فیصلہ ٹھہرائیں
یا جھگڑے کے گھر بکھیڑے کے مکان، خلاف
کی جڑ، نزاع کی کان یعنی دین و مذہب
کو آگ لگائیں۔ خاصے دہریے پورے آزاد
بے لگام دہار ممنون الحاد ہو کر یکرنگی و اتحاد
کے رنگ رچائیں۔ یعنی ؎

وہ سر ہی ہم نہیں رکھتے جسے سودا ہو ساماں کا

؎ بارقیباں جدل فزوں می شد
یار را گشتہ از جدل و ستیم

اگلی تینوں صورتیں ہونے سے رہیں اور ندوہ
کے خود اقرارات ہیں کہ وہ مقصود نہیں
ہاں شکل اخیر منظور ہو تو کوشش ٹھیک ہے۔
آزادی دائمی کی ہوا چل رہی ہے تو کوئی
ہمدردی ہزاروں درد کے ساماں
بدل رہے ہیں۔ امراء سے چل کر غرباء تک
آئی جہلاء سے ابل کر علماء پر چڑھائی دین
پر قیام آگ پر صبر ہے۔ قائم علی الدین
کالقابض علی الجمر ہے۔ خلط ملط،
اتحاد و اتفاق کو اس وقت سے بہتر کیا پاؤ گے
گھل مل جاؤ، سب ایک ہو جاؤ، ہوا دار

سڑکوں پر بجھیاں اڑاؤ، گوشۂ عافیت
میں گھٹ کر رہ جاؤ گے اور اگر یہی منظور
نہیں تو جان برادر یہ کیوں کر بنے، مختلف
گروہ مذہب نہ چھوڑیں، پھر مذہبی حیثیت سے
ایک ہو جائیں یا ناشدنی مذہبی حیثیت عقائد
کی مخالفت جب تک باقی تنافر باقی، تنافر
باقی تو وہی ناچاقی ہے

تو یدین کسا تضمد بنی حنا لدا
وھل یجمع السیفان ویحک فی غمد

یہ ظاہری وفاق، باطنی شقاق، کھلا نفاق، اور
نام اتفاق کچھ دن چلا بھی تو اس گھال میل کے
نتائج دیکھئے وہ شرمناک، واقعی ہولناک
حادثے جنھیں مٹانے کے بہلنے، یہ اتفاق
کے ولولے، اتحاد کے وسوسے آخر کیوں ہے
ہیں. مخالف مذہب سے جب مذہب باقی تو الگ
رہنے پر ایک ہوتے ہیں مخلط ہونے پر دس دیکھے
ہیں. آخر تحریرات ندوہ میں خود اقرار ہے
کہ طبائع سے اس کا زوال نہ ہوگا تو آگ بارود
میں جدائی ہی بہتر کہ دور رہنے پر اشتعال نہ ہوگا۔
دیکھئے دو مذہبوں کے رسمی میلے جب
ایک زمانہ میں آتے ہیں تو اپنا پرایا حاکم
رعایا سب پر وہ ان فکر میں گزر جاتے ہیں۔
شریف بے چارے گردش کے مارے اپنی
عزت کی خیر مناتے ہیں۔ زید نے آگ سلگائی
بارود بنائی ہر ایک کی جگہ جدا ٹھہرائی۔ عاقل
تو سمجھے کہ سبب کیا ہے غافل حیران کہ عجب کیا
ہے ــــ اے آگ اے بارود! تم
دونوں کا خدا ایک نبی ایک ہر شئی حضور پُر
نور کے دائرۂ رسالت میں آئی ہے ــــ
مالک ایک مکان ایک کہ زید کے گھر زید کے
ہاتھ پر خالق سے نعمت وجود پائی۔ پھر تم
دونوں میں سو اختلاف طبیع ہو جب
اتنا اتحاد ہے ایک ہی رہو۔ اب عقلا رے
داد انصاف طلب کہ وہ جدائی جس کی
تاکید حدیث میں آئی جیسے دین میں نافع تھی
کہ صحبت خلاف سے تاثیر نہ ہو یوں ہی دنیا
میں نافع کہ اشتعال بے محل سے تفرقہ
نہ ہو بخلاف اس دعوی اتفاق کے کہ دین
و دنیا دونوں کا زیاں۔ وہاں مذہب پہ
اندیشہ، یہاں امن و امان کا دشمن جاں۔
اور واقعی مخالف شرع سے شر ہی پیدا۔
شرع سے بڑھ کر کون مصلحت کا داتا،
اس اتفاق و اتحاد میں بھلائی ہوتی تو شرع
میں کیوں تاکید جدائی ہوتی۔ ہاں یہ
اتفاق دین میں مخل دنیا میں امن و عافیت
کا مخل اور وہ بغض شرعی بر وجہ شرعی
دین کا رامی امن کا داعی صلاح و فلاح
دارین میں ساعی ــــ مولے تعالے
شرع مطہر پر استقامت بخشے عافیت
دے سلامت بخشے۔ فتن دعون کی ہوا سے
بچائے۔"

۷ آئینہ قیامت کے تحقیقی معیار پر اعلیٰ حضرت کی توثیق

استاد زمن حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالے علیہ کی ایک مایۂ ناز اور محققانہ تصنیف "آئینہ قیامت" بھی ہے۔ جس میں آپ نے واقعات کربلا کو دلائل و براہین کے ساتھ نہایت ہی موثر اور دلکش انداز میں بیان فرمایا ہے۔ جس کے ذریعہ قارئین پر واقعات کربلا کی حقیقت آشکارا ہو جاتی ہے۔

ایک مرتبہ کسی صاحب نے حضور اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالے عنہ سے عرض کیا کہ محرم کی مجالس میں جو مرثیہ خوانی وغیرہ ہوتی ہے سننا چاہیے یا نہیں؟ تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ "مولانا شاہ عبد العزیز صاحب کی کتاب جو عربی میں ہے وہ یا حسن میاں مرحوم میرے بھائی کی کتاب "آئینۂ

قیامت" میں صحیح روایات ہیں انھیں سننا چاہتے۔

(الملفوظ حصہ دوم ص ۱۰۰)

امام اہل سنت کے اس ارشاد سے آئینۂ قیامت کے تحقیقی معیار اور اس کی صحت واقعات پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ آیئے اب آخر میں "آئینۂ قیامت" کا بھی ایک اقتباس ملاحظہ کریں جس کی ایک ایک سطر میں شہیدان کربلا کے جذبۂ عشق کی قندیلیں روشن ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔

"حسن و عشق کے باہمی تعلقات سے جو آگاہ ہیں وہ جانتے ہیں کہ اصل دوست جسے چاہنے والے اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتے ہیں بغیر مصیبتیں اٹھائے اور بلائیں جھیلے حاصل نہیں ہوتا ـــ دل میں نشتر چبھو کر توڑ دیتے اور کلیجے میں چھریاں مار کر چھوڑ دیتے ہیں اور پھر تاکید ہوتی ہے کہ اُف کی تو عاشقوں کے دفتر سے نام کاٹ دیا جائے گا۔ غرض پہلے ہر طرح اطمینان کر لیتے ہیں اور امتحان فرما لیتے ہیں جب کہیں چلمن سے ایک جھلک دکھانے کی نوبت آتی ہے۔ اور یہ امتحان کچھ حسینان زمانہ ہی کا دستور نہیں۔ حسن ازل کی دل کش تجلیوں اور عجیب جلوؤں کا بھی معمول ہے فرمایا جاتا ہے۔

ولنبلونكم بشيئ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات

اور ضرور ہم تمہارا امتحان لیں گے کچھ خوف کچھ بھوک اور مال گھٹا کر اور جانوں اور پھلوں سے ـــــ جب ان کڑیوں کو جھیل لیا جاتا ہے اور ان تکلیفوں کو برداشت کر لیا جاتا ہے تو پھر کیا پوچھنا سراپادہ جمال ترستی ہوئی آنکھوں کے سامنے اٹھا دیا جاتا ہے اور مدت کے بے قرار دل کو راحت و آرام کا پتلا بنا دیا جاتا ہے۔

اسی بنیاد پر تو امام مظلوم کو وطن سے چھڑا کر پردیسی بنا کر لاتے ہیں۔ اور آج صبح سے ہمراہیوں، رفیقوں بلکہ گود کے پالوں کو ایک ایک کر کے جدا کر لیا گیا ہے۔ کلیجے کے ٹکڑے خون میں نہائے ہوئے آنکھوں کے سامنے پڑے ہیں ـــ کہاں ہیں وہ ملائکہ جو حضرت انسان کی پیدائش پر چون و چرا کرتے تھے۔ اپنی جانمازوں اور تسبیح و تقدیس کے مصلوں سے اٹھ کر آج کربلا کے میدان کی سیر کریں۔ اور

انی اعلم مالا تعلمون

کی شاندار تفصیل حیرت کی آنکھوں سے ملاحظہ فرمائیں۔"

بقیہ ص ۴۵

جس ڈبیہ میں بند کیا تھا وہ وقت کے تھپیڑوں کی متحمل نہ ہو سکی، ماہ و سال پھر گزریں گے۔ ان موتیوں کی آب تو کبھی ماند نہ ہوگی لیکن ڈبیہ اگر وقت کے ساتھ ساتھ جلدی جلدی تبدیل نہ ہوتی رہی تو یہ موتی منتشر ہو جائیں گے۔ وقت کی سفاک لہروں میں دفن ہو کر کھو جائیں گے اور کوئی ان کی چمک سے فیضیاب نہ ہو سکے گا کیونکہ وقت کبھی کسی کا دوست نہ ہوا۔

آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے

اللہ تعالیٰ اپنی رحمتیں اور برکتیں مرحوم پر نازل فرمائے۔ ان کی خطاؤں سے درگزر فرمائے اور ان کی خوبیوں کو ان کے لئے صدقۂ جاریہ بنا دے۔ (آمین بجاہ سید المرسلین)

مولانا حسن رضا بریلویؒ کی دینی خدمات

علامہ عبد المبین نعمانی صاحب صدر المدرسین دار العلوم قادریہ چریا کوٹ ضلع مئو۔

خاندان نقی کی اپنی خدمات

برادر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا حضرت مولینا حسن رضا حسن بریلوی علیہما الرحمۃ (متوفی ۲۲ رمضان ۱۳۲۶ھ) ایک ایسے علمی و دینی خانوادے سے تعلق رکھتے ہیں جو عرصہ دراز سے ملکی قومی اور دینی خدمات میں نمایاں کردار ادا کر رہا ہے جس میں علم و فضل کے ایک سے ایک آفتاب و ماہتاب پیدا ہوئے اور پورے عالم اسلام کو اپنی جلوہ ریزیوں سے فیضیاب کیا اور جس کا سلسلہ ہنوز جاری ہے، چند نمایاں شخصیتوں کے نام یہ ہیں۔

- رئیس العلماء حضرت مولانا رضا علی بریلوی نقشبندی (متوفی ۱۲۸۶ھ) • عمدۃ المحققین حضرت مولانا نقی علی خاں بریلوی قادری برکاتی (متوفی ۱۲۹۷ھ) • اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی قادری برکاتی (متوفی ۲۵ صفر ۱۳۴۰ھ) • حجۃ الاسلام حضرت علامہ حامد رضا خاں قادری برکاتی (متوفی ۱۳۶۲ھ) • تاجدار اہلسنت مفتی اعظم حضرت علامہ شاہ مصطفےٰ رضا قادری برکاتی نوری (متوفی ۱۴ محرم ۱۴۰۲ھ)
- تلمیذ داغ حضرت مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی علیہ الرحمۃ بھی اسی گلستان علم و فضل کے ایک مہکتے پھول اور روشن چراغ ہیں جنہوں نے بلبل ہند مرزا داغ دہلوی کے تلامذہ میں ایک نمایاں مقام حاصل کیا۔ دوسری طرف دینی و علمی خدمات میں اعلیحضرت مجدد دین و ملت امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہٗ کی تربیت و صحبت میں رہ کر بھی ایسے ایسے کارہائے نمایاں انجام دئے جن کو بھلایا نہیں جا سکتا شروع میں تو آپ پر ادب اور غزل غلبہ رہا لیکن جب برادر بزرگ امام احمد رضا نے توجہ خاص فرمائی اور آپ بھی ان کی جانب ملتفت ہوئے تو پھر رنگ ہی بدل گیا، گھریلو ماحول امام احمد رضا کی تربیت اور مرزا داغ دہلوی کے تلمذ سب نے مل کر آپ کے اندر نثر و نظم اور مذہبیت کا ایسا آمیزہ پیدا کر دیا تھا کہ آپ کے رنگ کا دوسرا ملنا مشکل ہے۔ "ثمر فصاحت" آپ کی غزلوں کا ایسا سدا بہار گلدستہ ہے کہ تلامذہ داغ میں اس کی نظیر نہیں پیش کی جا سکتی اور "ذوق نعت" آپ کی نعتوں کا ایک حسین گلدستہ جس کے اندر رنگ تغزل بھی ہے مذہبی شاعری کی بھرپور رعایت بھی جس میں داغ اور امام احمد رضا دونوں کا عکس صاف نظر آتا ہے۔ سر دست میں آپ کی بعض مذہبی خدمات کا جائزہ پیش کرونگا۔

حضرت استاذ زمن مولانا حسن بریلوی علیہ الرحمہ کی مذہبی و دینی خدمات کا دائرہ بڑا وسیع ہے اور ضرورت ہے کہ کوئی فاضل بھرپور وقت نکال کر تفصیلی روشنی ڈالے آپ کی تصانیف حیات اعلیٰ حضرت اور دیگر مطبوعہ تصانیف اعلیٰ حضرت کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آپ نے اپنے کو برادر بزرگ امام احمد رضا قدس سرہٗ کی اصلاحی و تجدیدی تحریک سے مکمل طور پر وابستہ کر لیا تھا، حضور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی کتابوں کی اشاعت پر بھرپور توجہ فرماتے اور خود بھی مسلک اہلسنت و جماعت کی ترویج و اشاعت میں کتابیں تصنیف فرماتے، آپ نے بہت سے اہم دیگر موضوعات پر بھی نہایت عمدہ تصانیف چھوڑی ہیں۔ ذیل میں کچھ کتابوں پر تبصرہ کیا جا رہا ہے۔

آئینہ قیامت

یہ امام حسین شہید کربلا رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے فضائل و مناقب اور واقعات شہادت پر مشتمل نہایت ہی دقیع اور جاندار شہادت نامہ ہے اور مستند روایات پر مبنی ہے

جو روافض کے پھیلائے غلو آمیز اور نوحہ خیز شہادت ناموں کا
بہترین جواب ہے۔ زبان نہایت سادہ اور عام فہم ہوتے
ہوئے بھی ادب کی بھرپور چاشنی کی حامل ہے۔ محرم الحرام
میں چونکہ سنیوں کے وہاں بھی شہادت امام حسین کی محافل
منعقد ہوا کرتی ہیں اور عوام و خواص اس میں دلچسپی لیتے ہیں
اس لئے اسکی سخت ضرورت تھی ایک صحیح و مستند شہادت
نامہ منظر عام لایا جائے یہ کتاب اس کمی کو بجا طور پر پورا کرتی
ہے ضرورت ہے کہ آج بھی اس کو گھر گھر پہنچایا جائے۔ اور
فروغ دیا جائے۔ افسوس کہ اس کتاب میں بعض ناشرین نے
اپنی طرف سے کافی مضامین بڑھا کر محرف اور غیر ثقہ بنا دیا ہے
کسی سنی ادارے کو چاہیئے کہ اس کی اصل کاپی (قدیم نسخہ)
تلاش کر کے پوری صحت کے ساتھ شائع کرے تاکہ صحیح حالت
میں کتاب دستیاب ہو کر فروغ پائے اور کتاب کا اصل
مقصد بھی پورا ہو۔

یہ تذکرہ میلاد شریف میں
نہایت ہی ایمان افروز

نگارستان لطافت

رسالہ ہے جو اپنے طرز کے میلاد شریف کے بیان پر مشتمل
ہے پہلے ایک منظوم حمد ہے پھر حمد یہ نثر اور پھر سرکار ابد قرار
صلے اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے ذکر میلاد کے ساتھ متعدد نعتیں جگہ
بہ جگہ درج ہیں، تمام نعتیں حضرت استاذ زمن ہی کی ہیں صرف
آخر میں سرکار اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا قصیدہ معراجیہ درج ہے
جس کا مطلع ہے ۔

وہ سرور کشور رسالت جو عرش پر جلوہ گر ہوئے تھے
نئے نرالے طرب کے ساماں عرب کے مہمان کیلئے تھے

عام کتابی سائز کے ۵۶ صفحات کا یہ میلاد نامہ اپنی نظیر آپ ہے
سنی مسلمانوں میں عرصہ دراز سے مختلف مواقع پر چاہے خوشی
کا موقع ہو یا غمی کا سرکار اقدس نور مجسم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم
کے تذکرہ جمیل کا پاکیزہ رواج چلا آرہا ہے، مگر چونکہ یہ رواج
زیادہ تر عام خواندہ لوگوں میں مروج ہے جو تحقیقی علم نہیں رکھتے
اس لئے بہت سی میلاد شریف کی وہ کتابیں جو غیر مستند روایات
پر مشتمل ہیں عوام میں رواج پا گئی ہیں ایسے ماحول میں اس
کی سخت ضرورت تھی کہ ایک صحیح و مستند روایات پر
مشتمل میلاد نامہ پیش کیا جائے جسے آنکھ بند کر کے عام
سنی مسلمان میلاد کی محافل میں پڑھ سکیں حضرت استاذ زمن
نے "نگارستان لطافت" لکھ کر اس اہم ضرورت کی تکمیل
فرمائی ہے۔ ضرورت ہے کہ اس میلاد نامے کو بھی گھر گھر
پہنچایا جائے، اس میلاد نامے کی زبان اس قدر پاکیزہ اور شستہ
ہے کہ بلا شبہ اس کو کوثر و تسنیم کی دھلی ہوئی زبان کہا جا
سکتا ہے۔ اور پورے میلاد نامے میں جو والہانہ پن اور
عاشقانہ انداز اختیار کیا گیا ہے وہ بس پڑھنے ہی سے تعلق
رکھتا ہے۔ ایک ایک سطر سے عشق رسالت پھوٹا پڑتا ہے
چند سطریں بطور نمونہ ملاحظہ ہوں ۔

حمد کی جان اس نخلبند چمنستان کونین پر قربان
جس نے گلشن عالم کو گلہائے رنگارنگ عنایت فرما کر چمن
چمن سیراب و شاداب کیا۔ سرو آزاد اسی کی محبت میں
گرفتار گل کا اسی کی جدائی میں گریبان تار تار۔ بلبل اسی
کی جستجو میں شاخ شاخ ڈالی ڈالی متوالی پھرتی ہے، قمری
نے اسی کی محبت کا طوق اپنے گلے میں ڈالا، فاختہ اسی کی
یاد میں کوبکو، کو کو کرتی ہے۔ ماہ رو، کے عشق کی کہاں دھوم
نہیں، پروانہ و شمع کا معاملہ کسے معلوم نہیں، بیماروں کی شفا
اسیروں کی رہائی ہماری لاج اسی کے ہاتھ۔ مالک ہے
مختار ہے جسے جو چاہے دے جس سے جو چاہے چھین لے
کسی کو اس کی سرکار میں مجال دم زدن نہیں جس نے جو
پایا یہیں سے پایا جسے جو ملا یہیں سے ملا، گوہر کو آب، آفتاب
کو تاب، شاخ کو گل گل کو رنگ و بو، آسمان کو مہر و ماہ، مہر
و ماہ کو روشنی اور انسان ضعیف البنیان کو خلعت لَقَدْ
كَرَّمْنَا بَنِي آدَمَ اور تشریف لَقَدْ خَلَقْنَا الْإِنسَانَ
فِي أَحْسَنِ تَقْوِيمٍ اسی سرکار کا عطیہ ہے۔
خضر و الیاس علیہما السلام کو عمر جاوید بخشی۔ نار
نمرود اپنے خلیل پر گلزار کی۔ کلیم کو ید بیضا دیا۔ مسیح کو لب
جاں بخش عنایت ہوا، یوسف کو وہ حسن جانفزا ملا کر جس کا
بیان تاب تحریر و یارائے تقریر سے باہر ہے اور ہم بیکسوں
گناہگاروں معصیت کوشوں خطا کاروں عصیاں پناہوں
پریشان روزگاروں کو وہ نبی رحمۃ للعالمین خاتم النبیین

باعث ایجاد عالم، شافع محشر، ساقی کوثر، رہبر رہبراں، ہادی گمرہاں، جان کی جان، ایمان کا ایمان، ٹوٹے دلوں کا سہارا، ناامیدوں کی امید، بے یاروں کا یار، بے مددگاروں کا مددگار، بے مونسوں کا مونس، یتیموں کا وارث، غریبوں کا جائے پناہ، کونین کا بادشاہ، اسیروں کا آسرا، بے ٹھکانوں کا ٹھکانا، ہر درد کا درماں، ہر دکھ کا علاج، زندگیوں کا عقدہ کشا، محتاجوں کا حاجت روا، بے کلوں کی کل، بے قراروں کا چین، بے چینوں کا قرار، مظلوم کا فریاد رس، بے کس کا بس، گمراہوں کا راہنما، راہنماؤں کا پیشوا، داد کا دینے والا، فریاد کا سننے والا عطا کیا۔

(نگارستان لطافت ص ۳-۴ رضوی کتب خانہ بریلی)

غرض پوری کتاب اسی سجیلی البیلی الفاظ و معانی سے مرصع و مزین زبان میں تحریر ہے جسے پڑھئے تو پڑھتے چلے جائیے سنئے تو سنتے چلے جائیے، نہ کہیں اکتاہٹ کا نام نہ گھبراہٹ کا نشان، فی الحقیقت یہ مختصر سی کتاب ایک عظیم دینی خدمت ہے کیوں کہ عامۃ المسلمین میں قرآن کے بعد سب سے زیادہ میلاد نامے اور نعتیہ کلام ہی کے پڑھے پڑھائے جاتے ہیں۔

دین حسن کا تعارف

حضرت استاذ زمن کی ایک اور اہم دینی خدمت کتاب "دین حسن" کی تصنیف و تالیف ہے، جس میں ہنود و نصاریٰ کی تحریرات سے اسلام کی حقانیت کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے، گویا یہ کتاب الفضلُ مَا شَہِدَتْ بِہِ الاَعْدَاءُ کی منہ بولتی تصویر اور اسلام کے دین حسن و مذہب حق ہونے پر روشن دلیل ہے۔ بڑے سائز کے صرف ۳۲ صفحات ہیں لیکن دریا کو کوزے میں بند کر دینے کا مصداق ہیں۔

شروع میں ایک تمہید ہے جس میں مذہب کو انسان کی بنیادی ضرورت قرار دیا گیا ہے اور یہ کہ ہر انسان اپنی عقل بلکہ ہر گراں بہا سے گراں بہا شے پر مذہب ہی کو ترجیح دیتا ہے، لہٰذا ضروری ہوا کہ مذہب سب سے عمدہ ہو، لیکن چونکہ ہر مذہب والے کی پکار یہی ہے کہ ہمارا مذہب سب سے افضل، تو ضرورت اس کی بھی ہے کہ کسوٹی پر دیکھا جائے کہ کون واقعی افضل اور قابل اعتنا ہے اور کون لائق ترک و قابل نظر انداز۔

بس یہی بنیادی ضرورت ہے جس کے لئے یہ کتاب تحریر کی گئی ہے، جس کے لئے مصنف پوری مسلم امت کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں کہ اس اہم موضوع پر آپ نے بڑی ہی سنجیدہ موثر اور مفید تحریر پیش کر دی ہے، جس میں نہ صرف یہ کہ اسلامی دلائل سے اسلام کو حق ہونا ثابت کیا گیا ہے، بلکہ غیروں کی تحریروں سے بھی اس بات کا ثبوت فراہم کیا گیا ہے کہ اسلام ہی سب سے افضل ہے، اسلام ہی حق ہے، اسلام ہی باعث نجات ہے حتیٰ کہ اسلام ہی دنیوی زندگی میں بھی سب سے زیادہ مفید اور سکون بخش ہے۔ اسلام سے دور ہو کر قرار اور چین کہیں نہیں نصیب ہو سکتا۔

زبان و بیان کا وہی انداز اس کتاب میں بھی جلوہ گر ہے جو آپ کی دیگر نثری تحریروں کا طرہ امتیاز ہے۔ تمہید کی ایک تلخیص ملاحظہ ہو:

"خدائے پاک نے انسان کو اشرف المخلوقات و بہترین کائنات خلق کیا اور جوہر عقل سے معزز و ممتاز فرمایا کہ وہ اپنی دینی و دنیوی ضرورتوں میں اس پاک جوہر سے کام لے، یہ وہ کسوٹی ہے جو کھوٹے کھرے میں تمیز بتاتی اور دودھ کا دودھ پانی کا پانی کر دکھاتی ہے۔ یہ وہ دولت ہے جو خرچ کرنے سے بڑھتی ہے، یہ وہ آفتاب ہے جس کی روشنی دن رات یکساں رہتی ہے، نہ وہ آفتاب جو صبح کو مشرقی کناروں سے نمودار ہو کر شام مغربی گوشوں میں جا چھپے۔ اور اپنی تابش کے خریداروں کو چار پہر انتظار کرنے کے لئے شب دیجور کی بھیانک تیرگی میں چھوڑ دے، سفر میں، حضر میں، رفتار و گفتار میں، دشت و گلزار میں، روز روشن و شب تار میں، کوچہ و بازار میں اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے تکلیف و آرام میں غرض ہر بات ہر کام میں انسان کو اس کی

طرف احتیاج ہے جو جتنا خوش نصیب ہے اسی قدر اس کا محتاج ہے۔ جب ہم اس چمکیلے جوہر یعنی عقل کی دور رس نگاہوں کو اپنی ضرورتوں کے وسیع بازار میں آزادی کے ساتھ سیر کرنے کی اجازت دے کر دیکھتے ہیں کہ یہ مبصر گراں بہا متاعوں بیش قیمت چیزوں سے کسی شئے کی عزت کرتا اور کسے وقعت کی نظر سے دیکھتا ہے تو میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ اگر دین کو ہم نے دنیا کے سر صدقے نہیں کیا ہے اور دنیا طلبی کی بدنما زنگ سے ہمارے آئینے کا چھوٹے سے چھوٹا حصہ بھی خالی بچ رہا ہے تو اس میں اسی معشوق دلربا، محبوب مہ لقا کی چمکتی اور دلکش تجلیوں کا عکس ہے جسے زمانہ مذہب کے مقدس لفظ سے یاد کرتا ہے اور فی الحقیقت دنیا کی وسیع آبادی میں اگر نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہی ایک چیز ہے جو تمام نعمتوں سب دولتوں سے زیادہ وقعت کرنے کے قابل ہو..... (دین حسن ص ۲-۳ مطبع اہلسنت وجماعت بریلی)

آگے مذہب کی ضرورت واہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے مزید تحریر فرماتے ہیں،

"ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان کی جان پر بنتی ہے مال خرچ کر ڈالتا ہے آبرو پر بات آتی ہے تو جان و مال اس کے صدقے دے دیتا ہے مگر جب پیارے مذہب پر وار ہوتا ہے تو جان مال عزت آبرو سب بنا لیتا ہے ان حالتوں پر خیال کرنے سے بھی دوسری زندگی کا بہت زور کے ساتھ یقین ہوتا ہے جب مذہب ایسی کام آمد اور ضروری چیز ہے جس کی خوبیوں کا بڑا حصہ دوسری زندگی میں ہم کو نفع پہنچانے کے لئے اٹھا رکھا گیا ہو تو ہم کو واجب ہے کہ اپنے مقدور بھر اس میں غور کرنے کی کوشش کریں اور جانچ پڑتال میں کوئی دقیقہ اٹھا نہ رکھیں کہ مذہبی بازار سے اس طریقہ کی خریداری کریں جس میں ناموزوں ہچیدگیاں یا کھوٹے پن کی آمیزش نہ ہو مٹی کے برتن کا خریدار اسے الٹ پلٹ کر دیکھے ٹھونک بجا کر لے، اور ہم مذہب جیسی ضروری چیز کو بے سوچے سمجھے اختیار کر بیٹھیں اگر پرلے درجے کی نادانی اور انتہا درجے کی حماقت نہیں تو کیا ہے۔" (دین حسن ص ۳)

اسلام ہی کیوں حق ہے اور یہی کیوں اختیار کرنے کے لائق ہے۔ اور اس کے علاوہ سب مذاہب کیوں باطل محض ہیں، اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے رقام فرماتے ہیں۔

"آج دنیا میں بہت سے مذہب ہیں اور سب کے اصول میں باہمی اختلاف مگر ہر مذہب والا اسی کو حق اور درست سمجھے ہوئے ہے جس سے اسے دلچسپی حاصل ہے ع

کس نگوید کہ دوغ من ترش است

(کوئی نہیں کہتا کہ ہمارا دہی کھٹا ہے) مگر خوب سمجھ لینا چاہیے کہ عقل سلیم اسے ہرگز گوارہ نہ کرے گی کہ زیادہ تو زیادہ، مختلف الاصول مذہب بھی حق ہوں لہذا ضروری ہوا کہ ایک ہی مذہب حق ہو اور اس کی مخالفت کرنے والے مذاہب باطل، اب طرفداری اور ہٹ دھرمی کے خیال سے بچ کر غصے اور عداوت کو بالائے طاق رکھ کر آزادانہ روش سے اگر نظر کیجیے تو ایسا مذہب جس نے پاکیزگی کی گود میں نشو نما حاصل کی ہو، تہذیب کے دودھ سے پرورش پائی ہو جس نے نفسانی خواہشات لہو و لعب خرافات سے باز رکھا ہو جس نے عبادت پر طہارت کو مقدم مانا ہو۔ جس کے پیرو کا پہلا قدم پاکی کے دل کشا راستے میں پڑے جس کے متبع کا پچھلا دم خدا کی یاد میں اکھڑے اسلام ہی دکھائی دے گا۔ جس خوش نصیب کے دل میں اس کی دل چھین لینے والی ادائیں گھر کر گئیں اس سے پوچھنا چاہیے کہ تو نے ایسا کیا مزہ پایا جو زن و فرزند، یار و دیار چھوڑ بیٹھا، ایسا کیا لطف اٹھایا کہ دفعۃً سب سے منہ موڑ بیٹھا۔ ایسے واقعات سے تاریخی دنیا کا ایک بڑا حصہ آباد ہے اور اب بھی رات دن یہ دلچسپ معاملات نگاہوں کے سامنے

تے رہتے ہیں اس مذہب میں نہ خوبصورت تتلی کمر
والی عورتوں کا لالچ دیا جاتا ہے نہ ناپاک شراب پیش
کی جاتی ہے، نہ مشاعرہ مقرر ہوتا ہے بلکہ یہاں تو پکار
پکار کر کہہ دیتے ہیں کہ آزادی چھوڑ کر پابندی اختیار
کرنی ہو، دنیوی آسائش سے منہ موڑ کر تکلیف اٹھانی
ہو تو ہماری طرف قدم اٹھانا، چھوٹے دوستوں کو دشمن
اجنبی، یگانوں کو بیگانہ بنانا ہو تو ہماری جانب آنا۔

اگر ابتدائے اسلام کی حالتوں کو مشاہدہ
کیا جائے گا تو میرے بیان کی تصدیق وتائید بہت
اچھی طرح سے ہو جائے گی اور ایک ایسا عبرت ناک
منظر نظر آئے گا جس کا دردناک نظارہ ہمدردی کی
آنکھوں کو بے خون رلائے نہ چھوڑے گا۔

کفار نے حضرت بلال کی مقدس گردن میں
رسی باندھ کر لڑکوں کے حوالے کیا ہے وہ انھیں
مکہ کی گلیوں میں گھسیٹتے پھرتے ہیں، پھندا یہاں تک
سخت ہو گیا • کہ گردن میں زخم پڑ گیا ہے۔
• ایک کو لوہے کی زرہ پہنا کر گرم دھوپ میں بٹھایا
گیا ہے۔ • دوسرے کو گرم ریت پر لٹا کر جلتا پتھر
سینے پر رکھ دیا گیا ہے۔ • حضرت یاسر مع اپنی زوجہ
کے اسی وجہ سے شہید کئے جارہے ہیں کہ اسلام لے آئے
• جناب عمار اسی سبب سے آگ میں ڈالے گئے ہیں
کہ مسلمان ہو گئے۔ • نمازیوں پر نجاست پھینکی جارہی
ہے راستہ چلتے گالیوں کی بوچھاڑ اور پتھروں کی بھرمار
ہے — غرض غربائے اسلام ہیں اور بیر اندوہناک
تکلیفیں اور ناقابل برداشت مصیبتیں۔ ؎

زدر اغیار واز دیوار سنگ باری آید
بلائے دردمنداں از در و دیوار می آید

(دشمنوں کا تو زور ہے ہی بس دیوار سے دوست
بھی سنگ باری کر رہے ہیں گویا درد کے مارو کے
لئے ہر طرف سے بلائیں ٹوٹی پڑ رہی ہیں) انصاف
پسند طبیعت اور حق جو نگاہیں اگر ان حالات کو دیکھیں
اور خیال کریں تو اسلام کی حقانیت روز روشن کی
طرح انھیں نظر آجائے گی کہ اگر ان مقدس حضرات نے
اسلام کا حق ہونا آنکھوں سے ملاحظہ نہ فرمالیا تو زن و
فرزند سے منہ موڑنا وطن جیسی محبوب چیز چھوڑنی تکلیفیں
جھیلنی مصیبتیں بھر عیش وآرام سے درگذرنا، سخت
سخت بلائیں خوشی سے اختیار کرنا یہاں تک کہ
جانیں دے دینا کیوں کر گوارہ کیا اگر مذہب کی ابتدائے
اشاعت میں ایسی جانگزا آفتیں یہ حوصلہ فرسا زحمتیں (جو
مشتے نمونہ بیان کی گئیں) سد راہ ہوتیں اور اس کے
مقلدوں کے استقلال مذہبی کا لفافہ نہ کھل جاتا اور
ایسی پرجوش روک ٹوک پر ایسی کامل ترقی پاتا تو
ہم سمجھتے کہ فدائیان بطلان ہم استقلالے دارند۔ ایسی
نظیر اگر کوئی مذہب اپنی تاریخ میں رکھتا ہو تو پیش کرے
(ص ۵ تا ص ۶ دین حسن)

حضرت علامہ حسن بریلوی علیہ الرحمہ نے
مذکورہ سطور میں اسلام کی حقانیت پر جو زوردار
دلائل دئے ہیں وہ ایسے نہیں کہ جن کا مسلمان تو
مسلمان کوئی کٹر دشمن بھی جو تاریخ کا ذرا سا بھی
مطالعہ رکھتا ہو انکار کر سکے۔

اس کے بعد مصنف نے سرخی لگائی ہے۔

"اسلام کی اشاعت اور اس پر جوشیلی مخالفت"

اس عنوان کے تحت عرب کے تاریک ترین دور کا نقشہ
کھینچتے ہوئے بے سروسامانی اور غربت کے عالم میں
سرکار کی تشریف آوری اور مذہب اسلام کی اشاعت
اور کفار کی شدید مخالفت پھر بھی اسلام کی ترقی اور
اس کے ماننے والوں کی کثرت کو پیش کرتے ہوئے
اسلام وپیغمبر اسلام علیہ السلام کی صداقت کا ثبوت
فراہم کیا گیا ہے، یہاں بھی زبان کا وہی انداز اور
بیان کا وہی زور جو آپ کی تحریروں کا نمایاں وصف
ہے پورے طمطراق کے ساتھ باقی ہے۔ اس کے
بعد اسلام کی کتاب قرآن حکیم کے کلام الٰہی اور کتاب
حق ہونے پر دلائل دئے ہیں اور اسلام کے بتائے
طریقہ عبادت کی انفرادیت وخصوصیت پر روشنی

ڈالی ہے۔ اور دوسرے مذاہب میں عریانیت و فحاشی کی جو کھلی چھوٹ دی گئی یا ان کے پیشواؤں کی طرف سے مکمل سکوت بلکہ حوصلہ افزائی برتی جا رہی ہے اس پر بھی تنقید کی گئی ہے۔ جس سے اسلام کا سونا نکھر کر سامنے آجاتا ہے کہ اس گئے گذرے زمانے میں بھی کوئی مسلمان پیشوا یا عالم کسی ایسے طریقۂ عبادت کی اجازت ہرگز نہیں دیتا کہ اس میں کسی قسم کی بے پردگی یا فحاشی کی نوبت آئے، ہاں عوام الناس باوجود علماء کی سخت ممانعت و مخالفت کے اپنے طور پر جو کریں اس کے وہ خود ذمہ دار ہیں اسلام اور پیشوایان اسلام کے دامن الحمدللہ اس سے داغدار نہیں۔ اور یہ بھی اسلام کی حقانیت کی ایک بہت بڑی دلیل ہے۔ جس کا مقابلہ دنیا کا کوئی مذہب نہیں کر سکتا۔

اسلام کی حقانیت پر ایک روشن و مضبوط دلیل

اس عنوان کے تحت مصنف نے رفعت ذکرِ مصطفےٰ کا تذکرہ کرتے ہوئے وہ وہ گل بوٹے کھلائے ہیں اور اسلام کی حقانیت و عظمت کا ایسا پاکیزہ و روشن بیان رقم فرمایا ہے کہ ذوق عش عش کرنے لگتا ہے اور وجدان جھوم جھوم جاتا ہے اور عظمت مصطفےٰ کا چراغ دلوں کو منور و مجلیٰ کرتا چلا جاتا ہے بیجے حضرت حسن ہی کے الفاظ میں ان کا حسن بیان ملاحظہ کیجیے۔

"قرآن مجید و فرقان حمید میں ہمارا خدا اپنے محبوب صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے فرماتا ہے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ، "ہم نے تمہارے لئے تمہارا ذکر بلند کر دیا۔ اب دیکھنے والے ٹوپیاں تھام کر رفعت ذکر کے علو جاہ کو دیکھیں تمام ملأ اعلیٰ میں انھیں کا ذکر ہے، عالم بالا میں انھیں کی فکر ہے، خود دل کی انجمن میں انھیں کی یاد ہے ملائکہ کی محفل اسی یاد سے آباد ہے، معظم اماکن، مقدس مقامات میں ان کے اوصاف کی دھوم ہے کل کائنات سب مخلوق کو ان کی وجاہت معلوم ہے یہ امر کچھ بھی تعجب نہیں کہ مسلمان ان کے ثنا خواں ہیں۔ یہ بات بھی حیرت انگیز نہیں کہ ملائکہ ان کی صفت میں تر زباں ہیں۔ سدرہ کے شاخوں پر بسنے والے ان کی تعریف کیا ہی چاہیں، طوبیٰ کی ڈالیوں پر بیٹھنے والے ان کا دم بھرا ہی چاہیں، گلشن والے اگر ان کی یاد میں یا جنگل والوں نے ان کے گیت گائے تو اس کا بھی اچنبھا نہیں۔ کہ یہ مقدس ذکر ان کی جان اور یہ مبارک فکر ان کی روح رواں ــــ تعجب کا مقام اور حیرت کی جگہ تو یہ ہے کہ وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کے زبردست اثر نے یہاں تک ترقی کی مخالفین سے بھی ان کی کہلوا چھوڑی، جھوٹ والی زبانوں اور بداندیش دلوں سے اپنی مدح کے بول بلوائے ــــ اے میرے سچے خدا کے رسول کے ظاہر کئے ہوئے سچے اسلام ع

بول بالا رہے عالم میں ہمیشہ تیرا

قاعدے کی بات ہے کہ زمانے میں ہر دین کا آدمی مذہب تو مذہب اپنی ہر چیز کو اچھا سمجھتا ہے اور اسکی تعریف کرتا ہے مگر حقیقت میں وہ اچھی ہے جسے دشمن بھی اچھا کہیں۔ ع

وَالْفَضْلُ مَا شَهِدَتْ بِهِ الْأَعْدَاءُ (اصل خوبی تو وہ ہے کہ دشمن بھی جس کی گواہی دے)

میں بڑے دھوم دھامی دعوے سے ڈنکے کی چوٹ کہتا ہوں کہ دنیا بھر کے مذہبوں میں یہ دولت صرف میرے پیارے مذہب اسلام کے ساتھ خصوصیت رکھتی ہے۔ اس کی آفتاب سے زیادہ روشن حقانیت نے دوسرے مذاہب کی طرح اپنے منہ میاں مٹھو بننا پسند نہ کر کے اپنے بیگانوں سے بھی اپنی مدح و ثنا کہہ ڈالی پھر وہ بھی کھلے کھلے الفاظ میں ایسی تفصیل کے ساتھ کہ بایں ہمہ وشاید اسلام کی تعریفیں اس کی عبادات اس کے

ملات اس کے پیشواؤں اس کے پیروؤں وغیرہ
غیرہ کی مدح سرائیاں، غرض اللہ تعالیٰ کی قدرت
آئی اور حقانیت اسلام کی زبردست شوکت اپنی
کش تجلیاں دکھاتی ہے میں اپنے باوقعت اور
سچے دعوے کے واسطے، "مشتے نمونہ از خروارے"
گواہ پیش کرتا ہوں اگر اس قسم کے شواہد جمع
نے میں تھوڑی سی کوشش کی جائے تو یقیناً ایک دفتر
ظیم تیار ہو۔ وباللہ التوفیق وھو خیر رفیق
(ص ۱۰-۱۱، دین حسن)

مصنف نے اس کے بعد چند پادریوں پنڈتوں
اور دیگر سرکردہ غیر مسلموں کے تاثرات حوالے کے
ساتھ پیش کئے ہیں جن سے اسلام کی تعریف پیغمبر اسلام
کی مدح اور "اِنَّ الدِّیْنَ عِنْدَ اللّٰہِ الْاِسْلَامُ"
(دین خدا کے نزدیک صرف اسلام ہی ہے) کی
حقانیت روز روشن کی طرح عیاں ہے۔ یہ تاثرات
کتاب کے ص ۱۲ سے ص ۳۲ تک بیس صفحات پر مشتمل
اور قابل دید و لائق عبرت ہیں، افسوس کہ آج خود
مسلمان اس گھر کی دولت کی ناقدری برتتے ہوئے
اس کی پاکیزہ تعلیمات سے منہ موڑتے جا رہے
ہیں جب کہ بہت سے کفار اس کی مدح سرائی میں
رطب اللسان نظر آتے ہیں۔ ؎

آہ اسلام ترے چاہنے والے نہ رہے
جس کا تو چاند تھا افسوس وہ ہالے نہ رہے

چند تاثرات اختصار کے ساتھ ہدیہ ناظرین ہیں

(۱) پادری ایزک ٹیلر ـــ جو شخص مذہب اسلام
قبول کرتا ہے وہ ہمیشہ کے لئے اسی مذہب کا ہو رہتا
ہے اور اس کی گرفت بڑی مستحکم ہوتی ہے۔ عیسائی
مذہب کی گرفت ایسی مستحکم نہیں ہے (چند سطر بعد)
عیسائی مذہب کا نمبر حد سے چڑھا اور بہت بڑھا
ہوا ہے۔ لیکن اسلام نے دنیا کے مہذب بنانے
میں عیسائی مذہب سے زیادہ کام کیا ہے"
اسلام لانے کی وجہ سے جو اوصاف مسلمانوں
میں پیدا ہو جاتے ہیں ان کا ذکر کرتے ہوئے پادری
مذکور کہتا ہے۔

"بے حجابی (بے پردگی) کے ساتھ ناچنے کودنے
اور علانیہ زن و مرد کے ہم صحبت ہونے کی عادتیں
چھوٹ جاتی ہیں، عورتوں کی عفت کا ایک وصف
خاص کے طور پر خیال رکھتے ہیں"

• اسلام میں عملی طور پر اخوت کا برتاؤ ہوتا ہے
کہ تمام مسلمان ہر صحبت (مجلس) میں یکساں سمجھے
جاتے ہیں، یہ اسلام میں ایک ایسی چاشنی ہے جس
کو دیکھ کر منہ میں پانی چھوٹنے لگتا ہے۔

• اسلام نے شراب خوری، قمار بازی، اور زنا
کاری ان تینوں برائیوں کو جنھوں نے عیسائی ملکوں
کو بالکل ذلیل و خوار کر رکھا ہے۔ یک قلم موقوف کر دیا۔
(لکچر پادری ایزک ٹیلر مطبوعہ مطبع اسلامیہ
لاہور ص ۱۷-۱۸-۱۹-۲۱)

• ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر ـــ "اپنے عیسوی اور
موسوی مذاہب کی پوری واقفیت سے کہہ سکتا ہوں کہ
حضرت محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) نے اپنے مذہب
کی بنیاد صرف دوسرے مذہبوں کی نقل کرنے یا
ان کے عمدہ مسائل چن لینے ہی پر نہیں قائم کی بلکہ اگر
خداوند کریم کے پاس سے الہام آنا برحق ہے تو آپ
کا مذہب الہامی بھی ضرور تھا"

• "شراب، خنزیر، غیر ذبیحہ گوشت کی ممانعت
اور ان اشیاء کے (جسم سے) جدا کر دینے کے احکام
جن کا رہ جانا باعث نقصان ہے، مسلمانوں پر تکلیف
دہی کی غرض سے نافذ نہیں کئے گئے ہیں بلکہ جسمانی
و روحانی فائدہ رسانی کے لئے جاری ہوتے ہیں"

ہندو اور عیسائیوں کی شادیوں کا طریقہ
اصطباغی ہونے کی وجہ سے نکاح کا تقدس اس قدر
معلوم نہیں ہوتا جتنا کہ مسلمانوں کے یہاں معلوم ہوتا ہے۔

• خوش قسمتی سے ہم کوئی قصہ کہانی نہیں لکھتے
ہیں۔ بلکہ تاریخ کی رو سے ایسے شخص کے حالات قلمبند

کر رہے ہیں جس کا ہر قول و فعل حدیث میں موجود ہے
جو قرآن کے بعد مسلمانوں کا ہدایت نامہ ہے۔ ان احادیث
کی صحت کی کامل تحقیقات کی جاتی ہے اور اگر یہ ثابت
نہیں ہوتا کہ فلاں حدیث آپ کے کسی خاص صحابی کی زبانی
سنی تو وہ مجموعہ احادیث سے خارج کر دی جاتی ہے اور
پھر یہ بحث ہوتی ہے کہ محدثین نے اس کو کہاں سے
پایا ہمارے خداوند یسوع مسیح کے قول و فعل کی تحقیقات
کے واسطے اس طرح کا کوئی طریقہ مقرر نہیں ہے۔
(لیکچر ڈاکٹر جی ڈبلیو لائٹنر مطبوعہ رحمانی پریس
لاہور، بحوالہ انگلش مین اخبار ۲۹ جولائی ۱۸۷۹ء)

• مسٹر جون ڈیون پورٹ۔ اپنی کتاب مؤید
الاسلام کے بارے میں تحریر کرتے ہیں۔
"اس کتاب کی تصنیف سے میری غرض یہ ہے
کہ آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کے وقائع عمری پر
جو جھوٹے الزامات اور بے انصافانہ بہتان ہوئے ہیں،
ان کو میں رفع کروں اور یہ ثابت کروں کہ آپ فی
الحقیقت خلق اللہ کے بڑے مربی اور نفع رساں تھے۔
(مزید لکھتے ہیں) آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کو ایک
شارع مذہب اور مقنن ملت خیال کرنا چاہیے۔" (ص ۱،
کتاب مؤید الاسلام، مصنفہ جون ڈیون پورٹ مطبوعہ
مطبع بدر الدجیٰ، دہلی)

• اس میں کچھ شبہ نہیں کہ تمام مقنن اور فتح
کرنے والوں میں ایک کا بھی نام اس طرح نہیں لیا
جا سکتا جن کے وقائع عمری آنحضرت (صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم) کے وقائع عمری سے زیادہ تر مفصل اور
صداقت سے لکھے گئے ہوں۔

• مسٹر ولیم میور۔ احکم الحاکمین یعنی ذات باری
کے وجود ثابت کرنے کے لئے اور انسان کو مطیع اور
شکر گذار بنانے کے لئے اس کی بادشاہت کا دعویٰ
قائم کرنے کی غرض سے قرآن میں دلائل بھرے پڑے
ہیں، جن کو اس کی شان رزاقی اور قدرت سے
مستخرج کیا ہے آنے والی دنیا میں برائی اور بھلائی
کا عوض ملے گا اور نیکی کرنے اور بدی سے بچنے کی ضرورت
اور مخلوق کی خوشی اور فرض یہی ہے کہ خالق کی
اطاعت اور پرستش کرے اور اس قسم کے اور مضامین
قرآن میں خوبصورتی اور زور و شور سے بیان ہوتے
ہیں۔ (ص ۴۷، کتاب مذکور)

• گبن مؤرخ۔ بحر اٹلانٹک سے دریائے
گنگا تک قرآن قانون کی اصل مانا گیا ہے صرف
مذہب کا ہی نہیں بلکہ دیوانی اور فوجداری مقدمات بھی
اسی سے فیصل ہوتے ہیں اور انسان کے افعال اور
مال کے معاملات خدا کی غیر مبدل منظوری سے انتظام
پاتے ہیں۔ (ص ۴۷ کتاب مذکور)

• اپالوجی۔ اس بات کا خیال کرنا جیسا کہ
بعضوں نے کہا ہے، بہت بڑی غلطی ہے کہ قرآن میں
جس عقیدے کی تلقین کی گئی ہے اس کی اشاعت
صرف بزور شمشیر ہوئی تھی، کیونکہ جن لوگوں کی طبیعتیں
تعصب سے مبرا ہیں وہ سب بلا تامل اس بات کو تسلیم
کریں گے کہ حضرت محمد (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کا دین
مشرقی دنیا کے لئے ایک حقیقی برکت تھا...... ایس
ایسے اعلیٰ وسیلے کی نسبت جس کو قدرت نے بنی نوع
انسان کے خیالات اور مسائل پر مدت دراز تک
اثر ڈالنے کو پیدا کیا ہے گستاخانہ پیش آنا اور جاہلانہ
مذمت کرنا کیسی لغو اور بیہودہ بات ہے (۱) اسلام انسان
کے حق میں رحمت ہے۔" اسلامیہ پریس لاہور، بحوالہ ص
محمد اینڈ قرآن مصنفہ جان ڈیون پورٹ)

• طامس کارلائل۔ جب تم ایک دفعہ اچھی طرح
سے قرآن کو پڑھ لو گے تو اصلی صورت اس کی خود بخود
تم کو نظر آنے لگے گی، اور یہ خوبی اس میں ایسی ہے کہ عالم
تصانیف میں نہیں آ سکتی، (.....) اس کے آگے
مصنفین کے تمام صنائع بدائع ہیچ ہیں اصلی خوبی قرآن
کی اس کا جیوں کا تیوں ہونا ہے جیسی یہ کتاب صاحب
کتاب کے منہ سے نکلی تھی ویسی ہے۔ قرآن کے تمام
مطالب بلا تصنع ہیں اس کو میں کتاب کی خوبی جانتا

ہوں ۔ اور صرف یہی خوبی کتاب کے لئے کافی ہے اور
اس ایک خوبی سے سب قسم کی خوبیاں پیدا ہو سکتی
ہیں ۔ (روائنز ڈیفینیٹ آف اسلام مصنفہ ڈبلیو ایچ ،
مسٹر عبداللہ کوئیلیم مطبوعہ مطبع اسلام آگرہ ط ۱۸۹۶ء)
مسٹر ٹامس کارلائل کے مزید اعترافات
ملاحظہ ہوں ۔ خاص طور سے قرآن مجید کے بارے میں
ان کا قول ہے "قرآن شریف مسلمانوں کا مجموعہ قوانین
عامہ ہے اس میں قوانین مذہبی اور سلوک باہمی
اور فوجداری اور دیوانی اور تجارتی اور فوجی اور ملکی
اور سزا دہی سب موجود ہے، اور مذہبی رسموں سے
لے کر معاملات دنیوی تک ہر ایک چیز کا مفصل بیان
ہے اور قرآن نجات روح ہے اور صحت جسمانی اور
حقوق عامہ اور حقوق شخصی اور نفع رسانی خلائق
اور نیکی اور بدی اور سزائے دینی و دنیوی سب چیز
پر حاوی ہے ۔ لہذا قرآن شریف اصل میں انجیل
سے بالکل مختلف ہے جس میں آج کہ وہ کون صاحب" کی
رائے کے موافق مسائل مذہبی نہیں ہیں بلکہ عمدہ عمدہ
حکایات اور تذکرے اور ایسی باتیں کہ جس سے خدا کی
یاد اور تہذیب نفسی ہو موجود ہیں ۔ مگر ان حکایات میں
کچھ ربط ظاہری نہیں معلوم ہوتا ۔ قرآن شریف اور
کتب آسمانی کی مانند صرف امور مذہبی اور عبادت
ہی پر حاوی نہیں بلکہ اس میں نظم و نسق ملکی کا بھی بیان
ہے، اسی بنیاد پر سلطنتیں قائم ہیں، اسی میں سے ہر
ایک قانون ملکی اخذ کیا جاتا ہے اور اس کے موافق ہر
ایک تکرار مالی و ملکی فیصل ہوتی ہے ۔ (ص ۳، ۴، ۷
کتاب مؤید الاسلام مصنفہ جون ڈیون پورٹ مطبع
بدر الدجی دہلی)

• قتل اطفال (بچوں کو قتل کرنا) جو اس زمانے
میں قرب و جوار کے ملکوں میں رائج تھا اسلام کے سبب
سے بالکل معدوم ہو گیا (ص ۸۴ کتاب مذکور)

• آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم، کے مذہب
کی صداقت اس بات سے اور بھی معلوم ہوتی ہے کہ
اگرچہ اس مذہب کو نکلے ہوئے ایک عرصہ دراز منقضی
ہوا (یعنی گذرا) مگر اس میں اور مذہبوں کی مانند خالق
کی جائے مخلوق کی پرستش وغیرہ نہ ہوئی اور اہل اسلام
نے اپنے وہم اور قیاس کی متابعت نہیں کی اور خدائے
تعالیٰ کی پرستش پر قائم رہے اور اس کی جائے بتوں
کو نہ پوجنے لگے ۔ (۹۰-۹۱ کتاب مذکور)

یہاں تک ان اقوال کی تلخیص پیش کی گئی
ہے جو پادریوں اور عیسائیوں کے ہیں، اب سرکار ابد
قرار حضور احمد مختار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس
وارفع میں مشرکین ہند کے مدحیہ اقوال و اشعار ملاحظہ
ہوں کہ یہ بھی اسلام و پیغمبر اسلام کی حقانیت کی دلیل
ہے ۔

• منشی مول چند منشی دہلوی، حضور اقدس صلی
اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی نعت اور دین اسلام کی تعریف
و توصیف رقم کرتے ہیں ۔

پر از مشک و عنبر نہ کیوں ہو دہاں
ثنائے محمد ہے ورد زباں (صلی اللہ علیہ وسلم)

وہ ختم رسل سرور نامور!
فلک جس کے آگے جھکاتا ہے سر

سر سروراں ہے وہ عالی جناب
سپہر نبوت کا ہے آفتاب

جہاں جس کے دیں سے ہے روشن تمام
سراج الورٰی اس کا ہے داغی غلام

سر سروراں احمد مجتبیٰ
رسول خدا سید انبیاء

وہ مہر جہاں تاب اوج جلال
وہ سرو سرافراز باغ کمال

شفیع گنہگاراں بروز جزا
کشائندۂ عقدۂ مدعا

فرازندۂ رایت سروری
درخشندۂ خورشید پیغمبری

وہ ہے خاص خاصان پروردگار

کہ جس نے کیا دین کو استوار!
قدم اس نے معراج پر جب رکھا
تو پایہ بڑھا اور معراج کا!
شبِ ہجر بریں کے نہ ہے خوش نصیب
ہوا جلوہ گرداں خدا کا حبیب
میسر ہوا جبکہ قربِ حضور!!
نظر اس کو آیا وہ تا بندہ نور
تجلی کہیں جس کو اہلِ یقیں
منور ہے جس سے زمان و زمیں
یہ بخشا اسے پایۂ گاہ رفیع!
ہوئے جس کے شاہانِ عالم مطیع
گرامی و اشرف ہے انسان میں
غرض اس کی لولاک ہے شان میں
گنہگار ہوں میں بروزِ حساب
مری کیجیو تم شفاعت شتاب
یہ منشی تمہارا ہے کمتر غلام
کرم اس پہ اپنا رکھو صبح و شام

(شاہنامہ اردو مصنفہ منشی مول چند دہلوی)

اب صرف ان شعراء و ادبائے ہنود کے نام اختصاراً درج کئے جاتے ہیں جنھوں نے اپنی کتابوں میں یا بعض دیگر اسلامی کتابوں کی تقریظ میں درود شریف، نعت سرورِ کائنات نثر یا نظم میں پیش کئے ہیں۔

• منشی بخت سنگھ، کتاب عجیب القصص معروف بہ شبستان عشرت مطبع نولکشور • منشی رام سہائے عزیز، تقریظ کتاب گلستان مسرت ملقب بہ حدائق المعانی مطبع مصطفائی • لونڈھو رائے کتاب دستور الصبیان • منشی گوہر پال رائے تفتہ۔ از دیوان تفتہ • رتن سنگھ زخمی لکھنوی ثم بریلوی، کتاب حدائق انجوم • منشی کالکا پرشاد موجد تاریخ کتاب احیار العلوم و تقریظ تاریخ فرشتہ مطبع نولکشور • لالہ کانجی کاستھ کتاب خزانۃ العلوم • ہیرا لال کتاب مجربات الحکمۃ مطبع گلزار ابراہیم دہلی • لالہ سیوارام جوہر کتاب جواہر الترکیب مطبع مصطفائی • لالہ کامتا پرشاد انشائے بے نقط، مطبع نولکشور • دیبی شنکر نسیم لکھنوی کتاب گلزار نسیم • منشی نولکشور آنجہانی۔ تمہید کتاب مثنوی مولانا روم مطبع نولکشور • بنواری لال شعلہ، کلیات بنواری، مطبع کالستھ پرکاش علی گڑھ • موجی رام موجی لکھنوی، سراپا سخن، مطبع نولکشور، • بانکے لال رازؔ بدایونی تقریظ انشائے صنعت معروف بہ ارمغان ہند، مطبع انوار احمدی بریلی۔

پادریوں انگریزوں اور ہنود کے اسلام و پیغمبر اسلام کے بارے میں تعریفی کلمات و اقوال کے بعد مصنف علیہ الرحمہ کے طور پر ہنود کی عملی کارکردگیوں پر روشنی ڈالتے ہیں، مختصراً قارئین اسے بھی ملاحظ فرمالیں'

"ان مشتے نمونہ اقوال کے بعد اب مخالفین کی عملی کارروائیوں پر بھی نظر کرلینی چاہئے جو بہت زور کے ساتھ ثابت کردیں گی کہ اسلام اور اس کے پیروؤں اور اس کے مقدس معابد (عبادت گاہوں) کو وہ لوگ محض اسلامی نسبت کے سبب سے متبرک جانتے اور برگزیدہ مانتے ہیں اگرچہ مسلمانوں سے ہنود سخت پرہیز و اجتناب رکھتے ہیں اور چھوت چھات کے عجیب و غریب مسئلے پر بہت شدت کے ساتھ کاربند ہیں، مگر یہ پابندی اسی وقت تک محدود ہے جب تک وہ کسی بلا میں مبتلا نہ ہوں — آفتاب سے زیادہ روشن امر ہے کہ ہنود جب ان کے یہاں کسی بھوت پلید وغیرہ کا (جن کی خوش آمد بلکہ پوجا میں وہ رات دن سرگرم ہیں) خلل ہوجاتا ہے تو تعویذ مسلمانوں ہی سے لے جاتے ہیں — اپنے معابد شیوالوں کو چھوڑ کر بچوں کو مساجد کے دروازوں پر نمازیوں سے دم ڈلوانے لاتے ہیں۔

رنجیت سنگھ جو لاہور کا با اختیار راجہ تھا ایسے سخت تعصب پر کہ مسلمانوں کو اذان دینے سے روکتا اور گائے کا گوشت نہ کھانے دیتا تھا وہ سیدنا و مولانا حضرت غوث اعظم رضی اللہ تعالٰی عنہ کی گیارہویں شریف بڑی دھوم دھام سے کرتا۔ گوالیار کے راج میں بھی یہ نیاز

مبارک اور عشرۂ محرم شریف میں شربت وغیرہ کی سبیل ہوتی ہے۔ بڑودے کا گذشتہ راجہ جس سچی عقیدت کے ساتھ گیارہویں شریف کرتا ظاہر و مشہور ہے، یہ نیاز ہندوستان میں بھی اکثر ہنود کرتے ہیں مگر اس کی کیفیت دکن والوں سے کوئی پوچھے کہ ہمارے حضور پر نور رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی سرکار میں وہاں ہنود کیسا اعتقاد رکھتے اور کس دھوم سے یہ پاک نیاز کرتے ہیں اور کیسی کیسی کرامتیں ان پر ظاہر ہوتی اور کس کس قسم کی دنیوی حاجتیں (جو دنیا میں کسی سے پوری نہ ہوں) عطا فرمائی جاتی ہیں ـــ دور کیوں جائیے، ذرا اجمیر شریف میں حضرت سلطان الہند خواجہ غریب نواز رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے مزار پر انوار کی زیارت کیجئے جہاں سیکڑوں ہندو ہاتھ جوڑے گڑگڑاتے سجدے کرتے حاضر ہوتے ہیں اور اپنی منہ مانگی مرادیں بارگاہ سلطانی سے پاتے ہیں۔ میں نے جو کچھ لکھا یہ اجمیر شریف ہی کے ہنود کی حالت نہیں بلکہ دور دراز مقامات کے رہنے والے ہندو صرف اس سرکار میں حاضری کی عزت حاصل کرنے کو مال صرف کرتے اور سفر کی تکلیفیں اٹھاتے ہیں۔ اس کہنے سے میرا یہ مطلب نہیں کہ ہنود اپنی تیرتھوں کو نہیں جاتے، جاتے ہیں مگر وہاں سوا منڈنے کے اور کچھ نتیجہ نہیں پاتے، غرض اس قسم کی بے شمار مثالیں ہیں جن سے محض بوجہ طوالت قطع نظر کی جاتی ہے۔ بالجملہ بحمد اللہ تعالےٰ اس دین متین کی خوبیاں بے حد و پایاں ایسی روشن و نمایاں ہیں کہ مخالفین تک (جنھیں ذرا بھی عقل و انصاف سے تعلق ہے) اس کے مدح و ثنا خواں ہیں۔ الخ (ص ۳۲ دین حسن)

مذکورہ اقتباسات و اقوال سے ناظرین نے مصنف گرامی حضرت علامہ حسن رضا خاں حسنؔ بریلوی علیہ الرحمہ کی اس مبارک تصنیف دین حسن کی اہمیت کا بخوبی اندازہ لگا لیا ہوگا۔ ضرورت ہے کہ اس کتاب کو ہندی انگریزی اور دیگر علاقائی زبانوں میں بھی چھاپ کر ہنود و انگریز تک پہنچایا جائے تاکہ اسلام کی حقانیت کو مزید آشکارا کرنے اور اس کے جلوؤں سے غیروں کی آنکھیں [illegible] ممکن ہے اس سے بہت سے متعصبین کے تعصب کی پٹی کھل جائے اور بعض کو دامن اسلام میں پناہ لینے کی توفیق ملے۔ اور خود اردو میں بھی اس کو زیادہ سے زیادہ شائع کرنے کی سخت ضرورت ہے۔ اہل خیر حضرات کو چاہئے کہ اس کے نسخے طبع کرا کے مفت تقسیم کریں تاکہ بآسانی ہر کوئی کو دستیاب ہو سکے۔

میرے اس مضمون کا اصل عمومی مقصد حضرت مولانا حسن بریلوی علیہ الرحمہ کے دینی خدمات کا تذکرہ تھا اور خصوصی مقصد ان کی مؤثر تصنیف "دین حسن" کا تعارف۔ موضوع کے بھی بہت سے گوشے تشنہ ہیں، اور صفحات حد اعتدال سے متجاوز، اس لئے اب آخر میں حضرت علامہ حسن علیہ الرحمہ کے ایک اشتہار کو نقل کر کے رخصت لے رہا ہوں۔

یہ میں پہلے ہی لکھ آیا کہ حضرت علامہ حسن بریلوی علیہ الرحمہ کی دینی خدمات کا ایک روشن پہلو یہ ہے کہ آپ نے اپنے برادر گرامی امام اہلسنت حضور سیدی اعلیحضرت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کی دینی خدمات کو پھیلانے میں انکی تصانیف کی اشاعت میں بھرپور حصہ لیا۔ [illegible]ھ میں جب آپ نے اعلیٰ حضرت کی تصنیف "النیرۃ الوضیۃ شرح الجوہرۃ المضیۃ" کی اشاعت کی تو اس کے آخر میں ایک اشتہار دیا جس کو افادۂ عام اور معلومات کی غرض سے یہاں نقل کیا جاتا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

اشتہار واجب الاظہار قابل ملاحظہ اخیار

الحمد للہ کہ حج و زیارت و عمرہ کے بیان میں یہ نفیس رسائل حاوی مسائل مصداق اجل ما قل و دل ہیں ان میں حنفیہ و شافعیہ دونوں مذہب پر جدا جدا مسائل مذکور ہوئے، نظم عربی میں متن متین "جوہرۂ مضیۂ" جناب مستطاب مولانا سیدی حسین بن صالح جمل اللیل مکی شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے کہ مکہ معظمہ کے بڑے فاضل و کامل اور مقام ابراہیم کے امام عادل تھے، مذہب شافعیہ پر تالیف فرمایا ـــ اور سلیس اردو میں حسب فرمائش

ناظم ممدوح، فاضل مکرم اخی معظم حضرت مولانا احمد رضا خاں صاحب مدظلہ و دام فضلہ نے اس کی نفیس شرح منیرۃ وضیۃ ہیں مذہب حنفیہ سے راجح و منقح پر اقتصار فرماکر کوزے میں دریا کا لطف دکھایا۔ پھر زیادت فوائد کے لئے "طرۃ رضیۃ" نامی نہایت نافع و متین حاشیہ چڑھایا۔۔۔ اللہ عزوجل سے امید ہے کہ جو صاحب ان مختصر رسائل کو سمجھ لیں گے حرین محترمین میں مطوف و مزور کی حاجت نہ رکھیں گے حضرت مصنف دام ظلہ العالی نے حق تصنیف اس عبد ضعیف کو ہبہ فرمایا اور فقیر نے نفع عام مسلمین کے لئے اپنے صرف خاص سے مطبع انوار محمدی میں چھپوایا بار اول صرف چھ سو جلدیں چھپی ہیں کہ ذی المجد والمناقب مولوی فتح محمد صاحب تائب سلمہ الواہب کے پاس مطبع ہی میں اشاعت کیلئے امانت رکھے ہیں آسانی کے لئے اس گوہر بے بہا کی قیمت صرف ۲ر علاوہ محصول ڈاک مقرر کی۔ پچاس جلد یا زائد کے خریدار کو فی جلد ۲ر کی تخفیف دی جائے گی جو صاحب خریدنا چاہیں قیمت پیشگی یا درخواست ویلو پی ایبل اس فقیر کے پاس شہر بانس بریلی محلہ سوداگران میں خواہ لکھنؤ مطبع انوار محمدی مولوی فتح محمد صاحب تائب کے پاس روانہ فرمائیں، جس قدر نسخے چاہیں گے انشاء اللہ تعالیٰ فوراً روانہ خدمت ہوں گے۔ اہل مطالعہ بے اجازت فقیر قصد طبع سے ہمیشہ باز رہیں نفع کے عوض نقصان نہ اٹھائیں۔

بشارت۔ اَیُّھَا الْمُسْلِمُوْنَ فقیر کو قیمت کتاب سے کوئی نفع ذاتی مقصود نہیں بلکہ مراد یہ ہے کہ انشاء اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے حضرت اخی المعظم مصنف علام مدظلہ کے رسائل نافعہ جلیلہ جن کا شمار علوم دینیہ میں سَو سے متجاوز ہو چکا کے بعد دیگرے طبع ہوتے جائیں اور اس زمانہ غربت اسلام میں باذن اللہ تعالیٰ اہل اسلام کو نفع تام پہنچائیں تو ان کی خریداری میں نہ صرف ایک نفیس کتاب ہاتھ آنا بلکہ اشاعت دین میں اعانت فرمانا بھی ہے۔ حَسْبُنَا اللّٰہُ وَنِعْمَ الْوَکِیْلُ وصلی اللہ تعالیٰ علی الحبیب الجمیل محمد والہ وصحبہ بالتبجیل آمین۔

المشتہر۔ محمد حسن رضا خاں حسن بریلوی قادری برکاتی۔ غفر اللہ تعالیٰ لہٗ، بتاریخ ۱۳ر جمادی الآخرہ

بقیہ ص ۱۳۰

ہو مگر معنی میں تضاد ہو۔ مثلاً استاذ زمن فرماتے ہیں۔

نمازیں سب ادا ہو جاتیں اس ایک سجدہ میں
نیاز عشق سر اٹھنے نہ پاتے پائے جاناں سے

اس شعر میں استاذ زمن نے "پاتے" کا استعمال دو بار فرمایا ہے۔ مگر ہر ایک یہاں الگ الگ معنی میں ہے۔

اب اگر آپ مضامین کی آفرینی، جمال کی دلفریبی، تخیل کا بانکپن، جذبۂ عشق کی بے ساختگی، تغزل کی رعنائی حسن سراپا کی تصویر کشی، جذبات کا تلاطم اور محبت کا والہانہ پن دیکھنا ہو تو ان اشعار کو پڑھئے اور آپ بھی عشق کے ساگر میں نہائیے، تیریے اور ڈوبیے۔ فرماتے ہیں۔

بزم محشر میں بھی پیارے تیرے رونق نہیں
انجمن آرا ہوا اب اے انجمن آرائے عشق
بزم جاناں میں ہوئی ذلت تو کیا شکوہ حسن
آبرو سے کچھ غرض رکھتا نہیں رسوائے عشق

وہ چہرۂ پر نور کی وہ بھیک تھی جس نے
مہر و انجم کو پر انوار بنایا
دی تھی جو عالم کے حسینوں کو ملاحت
تھوڑا سا نمک ان کے نمکداں سے نکالا
کیا مہک ہے کہ معطر ہے دماغ عالم
تختۂ گلشن فردوس ہے روضہ تیرا

مضامین کی بلندی اور فصاحت و بلاغت کی رعنائی ہر لمحہ قاری کو اپنی طرف لبھاتی نظر آرہی ہے۔ ہر ہر شعر سے عشق کا چشمہ ابل رہا ہے۔ کوثر و تسنیم میں دھلی ہوئی سی زبان، نغمہ و ترنم اور موسیقیت میں ڈوبا ہوا عارفانہ کلام پڑھنے اور سننے والوں کے تار دل کو چھیڑ کر مست و بے خود بنا رہا ہے
ع خدا رحمت کند ایں عاشقان پاک طینت را۔

آئینۂ قیامت کے سرقہ کی پراسرار داستان

از: امین شریعت علامہ سبطین رضا خاں بریلوی

"آئینۂ قیامت" جو ہمارے پر دادا استاذ زمن
حضرت مولانا حسن رضا خاں صاحب حسن بریلوی کی واقعۂ
شہادت پر ایک مستند اور دل ہلا دینے والی کتاب ہے۔ اس
سلسلہ میں ایک دلچسپ انکشاف یہ ہے کہ اب سے تقریباً
بیس سال قبل دہلی کے ایک نام نہاد مفتی شوکت علی فہمی ایڈیٹر
"ماہنامہ دین دنیا" نے آئینۂ قیامت کے سارے مضامین
سرقہ کر کے کتاب کا نام "داستان کربلا" رکھا۔ اور اس میں
اپنی جانب سے کچھ مضامین کا اضافہ کیا۔ جس میں حضرت امیر
معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ذات اقدس پر کیچڑ اچھالی اور
سخت نازیبا کلمات لکھے۔ حالانکہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہ وہ ہیں۔ جن کے بارے میں حضرت علامہ شہاب الدین
خفاجی علیہ الرحمہ نے شرح شفاء شریف امام قاضی عیاض میں
فرمایا کہ ومن یطعن فی معاویۃ فذالک کلب
من کلاب الھاویہ یعنی ایسا شخص جہنم کے کتوں میں
سے ایک کتا ہے جو حضرت امیر معاویہ پر طعن کرتا ہے۔
(بحوالہ فتاویٰ رضویہ)

معلوم ہوا کہ یہ بات جمہور اہل سنت کے مسلک کے بھی قطعاً
خلاف ہے نہ کہ حضرت حسن بریلوی جن کا کہنا ہے کہ ؎

حسن سنی ہے پھر افراط و تفریط اس سے کیونکر ہو
ادب کے ساتھ رہتی ہے روش ارباب سنت کی

مفتی مذکور نے مزید ظلم یہ کیا کہ کتاب "داستان کربلا"
کے ٹائیٹل پر یہ لکھ کر کہ مولانا حسن رضا خاں بریلوی اور
مفتی شوکت علی فہمی نے اسے ترتیب دیا ہے۔ گویا اپنے
عقیدۂ بد میں حضرت حسن بریلوی علیہ الرحمہ کو بھی شامل کر لیا
جب کہ آئینۂ قیامت کی ترتیب اور حضرت حسن بریلوی
کے وصال کے وقت شاید مفتی کا جنم بھی نہ ہوا ہوگا

عجب دزدے کہ بکف چراغ دارد

چنانچہ اب سے چند سال قبل میرے والد حضرت علامہ مولانا
سبطین رضا خاں صاحب قبلہ کی نظر سے جب داستان کربلا
کا اشتہار "دین دنیا" میں گزرا اور انھوں نے اسے منگا کر
پڑھا اور حقیقت حال سے باخبر ہوئے تو انھوں نے اس سارق
کا قلمی تعاقب کیا جو ایک طویل مضمون کی شکل میں ماہنامہ
"اعلیٰ حضرت" بابت ستمبر اکتوبر ۱۹۷۵ء میں شائع ہوا تھا۔ جس
کو قارئین کی معلومات اور دلچسپی کے لئے یہاں بھی شائع
کیا جا رہا ہے۔

توضیحی نوٹ :- مولانا محمد جنید رضا خاں سلمان بریلوی

مفتی فہمی بزعم خود مورخ اسلام

مفتی شوکت علی فہمی ایڈیٹر ماہنامہ "دین و دنیا" دہلی جو بقلم خود
مورخ اسلام مفسر قرآن ہندوستان کے سب سے بڑے

مصنف اہل قلم بلند پایہ صحافی اور نہ جانے کیا کیا ہیں۔ بزعم خود "ان کی بے نظیر تاریخی کتابوں کے سارے ملک میں دھوم ہے اور ان کے مضامین کی ہر دل عزیزی کا یہ عالم ہے کہ اگر کسی اخبار یا رسالہ میں ان کا ایک مضمون بھی شائع ہو جاتا ہے تو اسے بہت بڑی اہمیت دی جاتی ہے۔

اور بقول ان کے " فی الحقیقت دین دنیا ایک ایسا جریدہ ہے۔ جس کا ہم پلہ ہند اور پاکستان میں ایک بھی رسالہ نہیں ہے۔" (حوالہ کے لئے دین دنیا ستمبر ۱۹۵۴ء ملاحظہ ہو جو اس وقت ہمارے ہاتھ میں آگیا ہے)

دین کے ساتھ دنیا بھی

ظاہر ہے کہ اس جریدہ کا ہم پلہ ہند اور پاکستان میں دوسرا رسالہ کیونکر ہو سکتا ہے۔ جب کہ دین کے ساتھ دنیا کو بھی پوری طرح اس میں سمو دیا گیا ہو۔ اس رسالہ کی سب سے بڑی خوبی تو یہ ہے کہ از اول تا آخر تقریباً تمام صفحات پر جگہ جگہ مذہبی وغیر مذہبی رہنماؤں مسلم و غیر مسلم ملکی و غیر ملکی سیاسی لیڈروں زمانہ ماضی و حال کے سلاطین بادشاہوں مردوں عورتوں اور بچوں کے تصویریں فوٹو اور فرضی خاکے نظر آئیں گے۔ اور کون مسلمان نہیں جانتا کہ تصویر کشی اسلام میں حرام و گناہِ کبیرہ ہے۔ اور یہ بات قرین عقل بھی ہے کہ اسلام جو تصویر پرستی کو مٹانے آیا ہے وہ تصویر کشی کی اجازت کیونکر دے سکتا ہے۔ اسی لئے اللہ کے پیارے رسول صلے اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ۔

" ان اصحاب ھٰذہ الصور یعذبون یوم القیامۃ ویقال لھم احیوا ما خلقتم"

یعنی ان تصویر بنانے والوں کو قیامت کے دن ضرور سزا دی جائے گی اور ان سے کہا جائے گا کہ جو تصویریں تم نے بنائی ہیں انہیں زندہ کرو۔

جب شرعاً تصویر کھینچنے کی اجازت نہیں ہے تو کیا اس کی اشاعت پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ مگر یہ جریدہ جو مفتی مذکور کے الفاظ میں جہاں مسلمانوں کی بہت اہم اور بہت بڑی خدمات انجام دے رہا ہے۔" وہاں برسہا برس سے ایک یہ بہت بڑی خدمت انجام دے رہا ہے کہ جن بادشاہوں کو کسی نے خواب میں نہ دیکھا ہوگا وہ سیکڑوں برس گزر جانے کے بعد آج بھی دین دنیا کے صفحات پر کھلی آنکھوں سے دیکھے جا سکتے ہیں

دین دنیا کے ممبران رحمت سے محروم

علاوہ ازیں سرکار دوعالم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم نے اسی مذکورہ حدیث پاک کے آخر میں فرمایا ہے کہ جس گھر میں تصویریں ہوں اس میں رحمت کے فرشتے نہیں آتے اور دین دنیا کے ایڈیٹر نے گھر بیٹھے ان لوگوں کے گھروں میں جو ان کے رسالہ کے خریدار ہیں تصویروں کے انبار لگا دیئے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ ان سب کو اللہ کی رحمت سے دور کر دیا۔ اور رسالے کے متعلق یہ لکھ کر کہ "جس کا ہر مسلمان کے گھر میں رہنا اشد ضروری ہے۔" اپنے ارادہ کا بھی اظہار فرمایا کہ وہ تمام ہی مسلمانوں کو اللہ کی رحمتوں سے دور کر دینا چاہتے ہیں پناہ بخدا جہلا تابیٰ توسہی کہ جب اپنے وقت کا اتنا بڑا مفتی ایک مسئلہ شرعیہ کے بارے میں اتنی آزاد روشش اختیار کر سکتا ہے اور فوٹو کی لعنت کو لعنت ہی نہیں سمجھتا تو پھر عوام اگر تصویر کشی فوٹو کھینچنے کھچوانے اور اسے گھروں کی زینت بنانے کی دلدادہ ہوں تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے۔

مفتی یا مفت کے مفتی

نہیں معلوم کہ آنجناب واقعتاً کسی دارالافتاء کے مفتی ہیں یا مفتیوں کے خاندان سے تعلق رکھتے ہیں یا پھر مفت کے مفتی ہیں جس کی غمازی ان کا یہ عمل بخوبی کر رہا ہے۔ اس موقر جریدے کی دوسری بڑی خوبی یہ ہے کہ جس میں فہمی صاحب کی فہم و فراست کی ناظرین مضمون ہذا کو بھی داد دینا پڑے گی۔ اور وہ یہ ہے کہ رسالہ کو از اول تا آخر پڑھ جایئے لیکن خیر سے آپ کو یہ نہ معلوم ہو سکے گا کہ اس کا ایڈیٹر کس عقیدہ اور مسلک کا حامی ہے۔

یہ کس عقیدہ و مسلک کے ہیں؟

ہم رسالہ دین و دنیا کے خریدار تو نہیں ہیں لیکن ہمارے بعض احباب جو فہمی صاحب کے رسالے کے متعلق خوش فہمی میں مبتلا ہیں اور لے منگاتے ہیں ان سے لے کر پڑھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے ہماری نظر سے اب تک نہیں گزرا کہ آپ نے اپنے عقیدہ کا کہیں کھل کر اظہار کیا ہو۔ اور اگر ایسا کسی کے نظر سے گزرا ہے تو مہربانی کر کے بتایئے ہم اپنے الفاظ واپس لے لیں گے۔ ہم نے تو یہی دیکھا ہے کہ آنجناب لفظ مسلمان سے کہیں آگے نہیں بڑھتے اور یہ سب جانتے ہیں کہ قادیانی بھی اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ رافضی بھی مسلمان کہاتے ہیں، نیچری و غیر مقلد بھی مسلمان ہونے کے دعویدار ہیں اور وہ بھی جو اپنے آپ کو سب سے بڑا موحد جانتے اور اپنے علاوہ کسی کو مسلمان ہی نہیں گردانتے اور جو اتفاق سے آپ کے دہلی کے قریب و بریلی سے دور اس رسوائے زمانہ بستی میں آباد نہیں بلکہ قید و بند ہیں۔ جسے بریلی کی ضد کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔ بالکل اس طرح جیسے دن کی ضد رات، نور کی ضد ظلمت اور اجالے کی ضد اندھیرا اور پھر ان ضدیوں کا طریقہ کار ہمیشہ سے تقیہ بازی رہا ہے۔

یہ کیسی پالیسی تھی

جس کا سبق ان کے حکیم الامت دوران قیام کانپور بہت پہلے پڑھا گئے ہیں اصل عبارت ملاحظہ ہو۔ میں نے (یعنی اشرف علی نے) دیکھا کہ وہاں (یعنی کانپور میں) بدون شرکت ان مجالس میلاد کے کسی طرح قیام ممکن نہیں ذرا انکار کرنے سے وہابی کہہ دیا دیتے تو ہین و تذلیل ہو گئے (پھر کچھ آگے بڑھ کر لکھتے ہیں) بہر حال میں نے وہاں بدون شرکت "میلاد" قیام کرنا قریب محال دیکھا اور منظور تھا وہاں رہنا کیونکہ منفعت بھی ہے کہ مدرسے سے تنخواہ ملتی ہے۔"

(سیف یمانی مرتبہ مولوی منظور سنبھلی دیوبندی ص ۴۳)

روپیہ کی لالچ نے سنیوں کو فریب دیا

ناظرین نے مطلب سمجھ ہی لیا ہو گا کہ حکیم الامت تنخواہ کے چند ٹکوں کی لالچ میں اگر کافی عرصہ تک سنی بن کر سنیوں کو فریب دیتے اور اپنے عقائد باطلہ پر پردہ ڈال کر اپنے جاننے والوں کو تقیہ بازی کا گر سکھاتے رہے۔ تو کہیں فہمی صاحب پر بھی ان کا چھاپا تو نہیں پڑ گیا جو عقیدہ کی بات ہی نہیں کرتے کہ اندیشہ کا عقیدہ ظاہر ہو گیا تو آج جو سیکڑوں سنی مسلمان جو آپ کا رسالہ پڑھتے ہیں وہ پڑھنا چھوڑ دیں گے پھر تجارت نہ چمکے گی اسے فروغ حاصل نہ ہو سکے گا۔ دوکانداری ٹھپ ہو جائے گی۔ یہ ہے فہمی صاحب کی فہم و فراست کا شاہکار اس مناسبت سے تو آنجناب کو ملک التجار کہنا بہت مناسب ہو گا۔ بہر حال یہ تو ان کی باتیں ہیں وہ جانیں۔ آمدم بر سر مطلب۔



ہمیں تو اس بقلم خود بلند پایہ صحافی، اہل قلم، مورخ اسلام، مفسر قرآن و مفتی ذی احترام کے خدمت والا شان میں کسی شاعر کی زبان میں اس وقت یہ عرض کرنا ہے۔

بڑے صاف باطن بڑے پاکباز
ریاض آپ کو کچھ ہمیں جانتے ہیں

کون نہیں جانتا کہ کسی مصنف کی کتاب کو اگر کوئی دوسرا شخص چھاپنا چاہتا ہے تو اسے پہلے مصنف سے باقاعدہ اجازت لینا ہوتی ہے یا حق طباعت خریدنا پڑتا ہے۔ اور اگر مصنف راہی دار بقا ہو چکا ہے تو اس کے ورثا میں اگر کوئی موجود ہے تو اس سے دریافت کرنا پڑتا ہے اور اگر بغیر اجازت کسی کی کتاب چھاپ دی جائے تو اسے ایک مجرمانہ حرکت اخلاقی و قانونی جرم خیانت۔ بددیانتی و سرقہ کہا جاتا ہے اور ایسے شخص پر قانوناً مقدمہ قائم ہو سکتا ہے۔ نہ معلوم اس بے گانۂ روزگار صحافی کو بیٹھے بٹھائے کیا سوجھی کہ ہمارے جد امجد عاشق رسول استاد زمن حضرت مولانا حسن رضا

خاں صاحب حسن بریلوی علیہ الرحمہ کی موضوع شہادت پر ایک
بلند پایہ اور دل ہلا دینے والی تصنیف "آئینۂ قیامت" جو جو
کم و بیش پون صدی قبل لکھی گئی اور کئی بار چھپی ہے۔ نومبر
۱۹۷۵ء میں ہم لوگوں کی اطلاع کے بغیر شائع کر دیا۔ یہ ضرور
ہے کہ مصنف علیہ الرحمہ کو دنیا سے تشریف لے گئے ہوئے
ایک زمانہ گزر چکا ہے۔ لیکن بفضلہ تعالیٰ ابھی تو ان کے
بہترین یادگار میرے والد ماجد حضرت علامہ حسنین رضا خاں
صاحب مدظلہٗ ان کے برادر زادہ عمی المحترم شاہزادۂ اعلیٰحضرت
امام اہل سنت علامہ شاہ مصطفیٰ رضا خاں صاحب مفتی اعظم ہند
دامت برکاتہم القدسیہ موجود ہیں۔ مولائے کریم ان بزرگوں کے
سایۂ عاطفت کو تادیر قائم رکھے۔ آمین (اس وقت یہ ہر دو بزرگ
حیات تھے جو اللہ کو پیارے ہو چکے ہیں۔) ان میں سے کسی سے
تو اس کی طباعت کے لئے تو اجازت طلب کی ہوتی۔ لیکن
آنجناب نے اس کی ضرورت ہی محسوس نہ کی اور کتاب چھاپنے
کے لئے مصنف کی شان میں چند تعریفی کلمات لکھنے ہی کو کافی
سمجھا۔ بھلا کہو کہ وہ عاشق رسول جو عشق رسول کے صدقہ میں دنیا
بھر سے داد و تحسین حاصل کر چکا ہے۔ اس کی شان اقدس
میں آپ کے چند تعریفی کلمات نے کون سے چار چاند لگا دیئے
مگر اس نازیبا اور رکیک حرکت پر پردہ ڈالنے کے آخر کچھ تو
ہونا ہی چاہئے تھا۔ یہ تو ایسا ہی ہوا جیسے کوئی بیوقوف
گندگی کو چھپانے کے لئے اس پر پھولوں کی چادر ڈال دے۔

آئینۂ قیامت کا دوسرا نام داستان کربلا

دوسرا سنگین جرم یہ کیا کہ کتاب کا نام بدل کر داستان کربلا
رکھ دیا نہ جانے اس کی کیا ضرورت پیش آ گئی۔ جب کہ لفظی و
معنوی کی حیثیت سے بھی وہ خوب صورتی اس نام میں نہیں ہے
جو اس کے اصلی نام (آئینۂ قیامت میں) ہے

فہمی کی امیر معاویہ کی شان میں گستاخی

اور ستم بالائے ستم سب سے تکلیف دہ اور روح فرسا بات جس
نے ہمیں قلم اٹھانے پر مجبور کر دیا وہ یہ کہ آنجناب نے کتاب کے
شروع میں اپنی قلم کاری کا جو نمونہ دکھایا ہے۔ اس مضمون
کے اختتام اور کتاب کے ص ۲۲ پر حضرت امیر معاویہ رضی
اللہ تعالیٰ عنہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "مذہب کے
نام پر عوام کے جذبات کو بھڑکانے میں انھیں کمال حاصل تھا
وہ حکومت کی خاطر ہر عیاری و مکاری کو اختیار کر لینا کوئی
گناہ نہیں سمجھتے تھے۔" معاذ اللہ ایک جلیل القدر صحابی
رسول اور زبردست فقیہ و مجتہد کی شان اقدس میں اس
قسم کے نازیبا الفاظ کا استعمال گستاخی ہی نہیں ہے۔
تبرا بازی اور کھلی گمراہی ہے۔ اگر میں یوں کہوں کہ کاش اس
مفت کے مفتی نے حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے
ذات اقدس پر کیچڑ اچھالنے اور آپ پر عیاری و مکاری کا
الزام رکھنے سے پہلے اپنی عیاریوں اور مکاریوں پر نگاہ
ڈالی ہوتی ؎

چوری اور سینہ زوری

جس کے نمونے ناظرین اس مضمون میں شروع سے
دیکھتے چلے آ رہے ہیں۔ اور ملاحظہ ہو، عیاری و مکاری
بلکہ چوری اور سینہ زوری کی اس سے بہتر مثال اور کیا ہو
سکتی ہے کہ خود تو بلا اجازت ہماری کتاب شائع کر دی۔
اور اسی کتاب کے صفحہ اول پر "جملہ حقوق محفوظ" کی سرخی
قائم کر کے لکھ مارا کہ "اس کتاب کی اشاعت اور نقل و اخذ
کے جملہ حقوق انڈین کاپی رائٹ ایکٹ کے ماتحت مفتی
شوکت علی فہمی پروپرائیٹر دین دنیا پبلشنگ دہلی محفوظ ہیں۔"
یہ لکھ کر گویا یک قلم ہمیں بھی اس کی طباعت کے حق سے محروم
کر دیا گیا۔ جب کہ حق طباعت ہمارے سوا کسی اور کو نہیں ہے
اس سے بڑھ کر دھاندلی اور کیا ہوگی۔ شاید ایسے ہی موقع کے
لئے کسی نے کہا تھا کہ "چہ دلاور است دزدے کہ بکف
چراغ دارد۔" واہ رے مفتی جس نے تقویٰ و دیانت داری
کا دیوالہ ہی نکال دیا کہ "حصول زر کی خاطر عیاری و مکاری کو
اختیار کر لینا کوئی گناہ ہی نہیں سمجھا۔" تو اگر چہ میں یہ کہنے میں

حق بجانب ہوگا لیکن میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ مفتی موصوف ذرا اپنے کلیجہ پر ہاتھ رکھ بتائیں کہ میرے یہ جملے اُن کی طبع نازک پر گراں نہ گزریں گے۔ اور یقیناً گراں گزریں گے۔

امیر معاویہ کا تقدس

تو پھر ایک صاحب ایمان دنیائے اسلام کی ایک مقتدر شخصیت کاتب وحی حضرت امیر معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کے متعلق یہ گھنونا جملہ کیونکر برداشت کر سکتا ہے کہ "وہ حکومت کی خاطر عیاری ومکاری کو اختیار کر لینا کوئی گناہ نہیں سمجھتے تھے"۔ حالانکہ ان کے تقدس و پارسائی کا عالم تو یہ ہے کہ ایک موقع پر جب کسی سائل نے حضرت امیر المؤمنین فی الحدیث عبد اللہ ابن مبارک سے سوال کیا کہ امیر معاویہ اور عمر ابن عبد العزیز رضی اللہ تعالےٰ عنہما ان دونوں میں کون بہتر ہے۔ تو عبد اللہ ابن مبارک نے فرمایا تھا کہ معاویہ کے گھوڑے کی ناک کا غبار جو حضور کے ساتھ جہاد کے موقعہ پہ واقع ہوا وہ عمر ابن عبد العزیز سے ہزار گنا اچھا ہے۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ حضرت عمر ابن عبد العزیز متقی و پرہیزگار ہی نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری کا پیکر تھے۔ تو جب حضرت امیر معاویہ کے گھوڑے کی ناک کا غبار اُن سے بہتر ہوا تو خود امیر معاویہ رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کا کیا رتبہ ہوگا۔ حضور تو فرمائیں کہ اصحابی کالنجوم الخ کہ میرا ہر صحابی اپنی جگہ آسمان ہدایت کا ایک درخشندہ تارا ہے۔ کہ جس کا دامن پکڑ لوگے ہدایت کی راہ پالوگے۔ اور آپ انہیں عیار و مکار ٹھہرائیں۔ یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور کیسی بدعقلی ہے کہ جس کے متعلق یہ کہتے بن پڑتا ہے کہ بر ایں عقل و دانش بباید گریست۔

اہل سنت کے لئے لمحۂ فکریہ

یہ ایک ایسی مردود و مکروہ بات اور سخن ناگفتنی ہے جو جمہور اہل سنت اور خود مصنف علیہ الرحمہ کے مسلک کے بھی قطعاً خلاف ہے۔ جیسے اگرچہ مفتی شوکت علی فہمی نے لکھا ہے لیکن اس امر کا قوی امکان ہے کہ ناخواندہ لوگ جو محرم کی مجالس میں دوسروں سے اس قسم کے مضامین پڑھوا کر سنتے ہیں یا کم پڑھے لکھے لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا ہو جائیں کہ چونکہ حضرت مولانا حسن رضا خاں صاحب بریلوی علیہ الرحمہ کی یہ کتاب ہے انھوں نے یہ بھی لکھا ہوگا۔

لہٰذا ہم عوام کی آگاہی کے لئے اعلان کرتے ہیں کہ اس عبارت کا اصل کتاب سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ ایڈیٹر دین دنیا کی یاوہ گوئی اختراع و من گڑھت ہے۔ نیز ایڈیٹر سے پرزور مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ جلد از جلد کتاب سے اس گندی اور گھنونی عبارت کو قلمزد کریں اور اپنے رسالہ میں شائع کریں کہ یہ عبارت حضرت مولانا حسن بریلوی کی نہیں ہے۔ ورنہ ہمارے کسی اگلے اقدام کے لئے انھیں تیار رہنا چاہئے کہ جس کی ذمہ داری یہاں سے لے کر میدان قیامت تک ان پہ اور صرف ان پہ ہوگی۔

بقیہ ص ۱۴

رہی گی۔ آپ نے یا ان کے نعتیہ دیوان سے متعدد اشعار کو ملاحظہ فرمایا۔ آپ نے خود محسوس کر لیا ہوگا کہ استاد زمن حضرت حسن بریلوی کی فکر ی تگ و تاز عروج و ارتقاء کی کس منزل پر گامزن ہے۔ ایک سے ایک نازک مقام سے اتنی چابک دستی کے ساتھ گزر گئے ہیں کہ عقل حیران رہ جاتی ہے مگر ان نازک مراحل کے طے کرنے میں آپ کی قوت فکر کا بہت بڑا دخل ہے

مولانا حسن بریلوی فن اور شخصیت

از: ادیب شہیر مولانا شمشاد حسین رضوی پرنسپل شمس العلوم بدایوں

ماہنامہ سنی دنیا بریلی شریف علمی، فنی، ادبی اور مذہبی جریدہ ہے۔ جو عزیز گرامی مولانا محمد شہاب الدین رضوی اختری کے زیر ادارت ہر ماہ پابندی سے شائع ہو رہا ہے۔ مولانا موصوف ابھرتے ہوئے نوجوان ادیب ہیں۔ ان کے مضامین نہایت درجہ تحقیقاتی اور معلوماتی ہوتے ہیں۔ اور مذہبی رنگ و بو میں رچے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کے قلمی نگارشات میں روح عصر کی تازگی اور رعنائی بھی مسکراتی ہے۔ وہ کئی ایک کتابوں کے مصنف بھی ہیں۔ مثلاً

(۱) مفتی اعظم ہند اور ان کے خلفاء
(۲) مفتی اعظم کے ماہ و سال
(۳) شمع فروزاں (۴) دنیا سے عدم کی تلاش میں

اول الذکر کتاب نہایت ہی معرکۃ الآرا اور ضخیم تصنیف ہے جسے اہل علم و فن نے مقبولیت کی نگاہ سے دیکھا ہے ان کی ان خوبیوں اور کمالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ مستقبل قریب میں اپنی قلمی توانائیوں سے قوم و ملت کو فیضیاب کریں اور ان کی شیرازہ بندی میں اہم رول ادا کریں گے۔

ماہنامہ سنی دنیا کی عظمت کا اندازہ صرف اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ یہ رسالہ حضرت علامہ مولانا اختر رضا خاں ازہری مدظلہ العالی کی سرپرستی میں نکلتا ہے۔ علامہ موصوف علم و فن میں وحید عصر اور نادر روزگار ہیں۔ ان کی نظر بہت زیادہ وسیع اور دقیع ہے۔ فتویٰ و تقویٰ ان کا زیور ہے۔ اور سادگی ان کے مزاج کا حسن و بانکپن ہے۔ عالم اسلام میں ان کا جو علمی، ادبی اور فکری و فنی مقام ہے کسی سے پوشیدہ نہیں۔ عربی، فارسی، اردو اور انگلش چاروں زبانوں پر وہ کمانڈ رکھتے ہیں۔ اور ان میں سے ہر ایک زبان میں ان کی تصانیف پائی جاتی ہیں۔ وہ اعلیٰ پایہ کے قادر الکلام شاعر بھی ہیں۔ جس سرعت و تیزی سے انھوں نے اپنے ہمعصر علماء کے درمیان اپنا مقام بنایا۔ اس کو کسی برگزیدہ بندہ کی عنایت ہی کہا جا سکتا ہے۔ اس میں کیا شک ہے کہ علامہ موصوف اپنے برگزیدہ بزرگوں کا مجسمہ فیض اور سراپا کرامت ہیں۔ ماہنامہ سنی دنیا شمارہ ستمبر ۱۹۹۱ء میں یہ اعلان شائع ہوا کہ۔ " امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہٗ کے برادر اصغر استاد زمن علامہ حسن رضا خاں حسن بریلوی کی ادبی اور شعری خدمات پر ماہنامہ سنی دنیا ایک تاریخی نمبر نکال رہا ہے۔"

یہ اعلان ہر قلم دوست اور دانشوری کی روایت کو زندہ رکھنے والوں کے لئے یقینی طور پر مسرت افزا اور نشاط انگیز ہے۔ ناچیز اگرچہ اپنے پاس قلم کی توانائی اور معلومات کا ذخیرہ نہیں رکھتا ہے تاہم لکھنے اور پڑھنے کا تھوڑا بہت ذوق ضرور رکھتا ہے۔ اس لئے یہ اعلان ہمارے لئے خوشی کا باعث ہوا۔ مولانا محمد شہاب الدین قابل مبارکباد ہیں کہ انھوں نے اپنے عزم و حوصلہ اور نئی امنگوں کا اظہار کیا ہے۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ مولانا حسن بریلوی کی ادبی، فنی شخصیت اس قدر متنوع ہے کہ ان کی اس حیثیت کو اجاگر کرنا اور ان کی شعری خدمات پر کوئی عظیم نمبر نکالنا صرف ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ وہ اکیلے کیا کریں۔؟ ہماری جماعت کے دانشوروں، مفکروں، مدبروں اور اہل قلم حضرات کو چاہئے کہ ان کی اس آواز پر لبیک کہیں۔ اور مولانا حسن بریلوی کی ادبی شخصیت پر کچھ نہ کچھ لکھیں۔ ہماری جماعت میں جو سرد مہری پائی جاتی ہے اور جس طرح انجماد کی کیفیت طاری ہے۔ ہمیں اس کا بھی شدید احساس ہے۔ لیکن خدائے وحدہٗ لاشریک کے نزدیک یہ بات کوئی بعید نہیں

ہے کہ اس طرف اہلِ قلم حضرات رخ کریں۔ اور مدیر موصوف کا اس سلسلے میں پورا پورا تعاون کریں۔ اسی جذبہ کے تحت میں نے بھی قلم اٹھایا اور اس بات کا مصمم ارادہ کرلیا کہ مولانا حسن بریلوی کی شخصیت اور ان کی ادبی وشعری خدمات پر ایک مقالہ تحریر کیا جائے۔ اس سلسلے میں جب میں نے مواد کی تلاش وجستجو کے لئے بھاگ دوڑ شروع کی تو مجھے اس بات سے مایوسی ہوئی کہ مولانا موصوف کے بارے میں ان کی شایانِ شان کچھ بھی کام نہیں ہوا ہے۔ اور نہ ہی ان کی تمام تصنیفات دستیاب ہیں۔ اس طرح ان کی شخصیت اور ان کے خدمات تاریک گوشوں میں محصور ہوکر رہ گئیں۔

ایک طرف مقالہ کے یہ تقاضے ہیں۔ اس میں اس بات کی وضاحت کی جائے کہ علامہ حسن رضا خاں حسن بریلوی کی شخصیت کیا ہے۔؟ ان کی ادبی خدمات کیا ہیں۔؟ ان کی تخلیق میں شخصیت کا کس قدر اظہار ہوا ہے۔؟ نیز ان کے کلام میں عصری تقاضے کس حد تک پائے جاتے ہیں۔؟ اور دوسری طرف ان کی شخصیت اور ادبی وشعری کارنامے ہیں جو تاریک گوشوں میں محصور ہیں۔ اس صورت حال کے پیشِ نظر "مقالہ" تحریر کرنا کس قدر دشوار ہے۔؟ یہ ایک واضح سی بات ہے اور خاص کر مجھ جیسے انسان کے لئے جو اندھیری رات میں ٹامک ٹوئیاں مار رہا ہو۔ ماہنامہ سنی دنیا کے وہ رسالے جن میں علامہ حسن رضا خاں کے کلام شائع ہوئے ہیں وہ صرف چند کرنیں ہیں۔ کیا صرف ان کرنوں سے کام نکل سکتا ہے۔ اندھیری رات کا مسافر ان کرنوں کے سہارے اپنے منزلِ مقصود کا پتہ لگا سکتا ہے؟ ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں ہوسکتا ہے۔ کیونکہ شب دیجور کی اس دبیز ظلمت کو چھانٹنے کے لئے یہ کرنیں ناکافی ہیں۔ تاہم میں نے اپنے مقالہ میں ان ہی کرنوں کی مدد سے ان کی شخصیت اور اس میں پائی جانے والی قوس وقزح کی بوقلمونیوں اور ان کے ادبی خدمات وشعری کارنامے کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ یہ کوشش کہاں تک کامیاب ہوتی ہے۔ اس کا فیصلہ قارئین کے ذمہ سپرد ہے۔ وہ اس کا مطالعہ کریں اور حق ودیانت کا فیصلہ کریں۔ جو گہوارہ ادب سے آغوشِ لحد تک کام دے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس مقالہ کی کامیابی کا سہرا ان لوگوں کے سر ہے جنھوں نے اس سلسلے میں میرا تعاون کیا خواہ یہ تعاون کسی بھی نوعیت کا ہو۔ حضرت علامہ مولینا حبیب رضا خاں کا احسان کبھی میں فراموش نہیں کرسکتا کہ انھوں نے بڑی کدوکاوش سے مولانا حسن بریلوی کا غزلیہ دیوان "ثمر فصاحت" دستیاب کرایا۔ جناب عبد المجید صاحب شاداں بدایونی اس مقالہ میں ہمارے ساتھ ساتھ رہے۔ اور انھوں نے اردو تاریخ وتنقید سے متعلق بہت سی کتابیں دستیاب کرا دیئے۔ ان کتابوں سے میں نے بہت کچھ مدد لی ہے۔ ویسے میں حضرت سیدنا امام اہلسنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور حضور مفتی اعظم ہند نیز ان کے خاندان کے موجودہ افراد کو دورِ طالب علمی ہی سے جانتا ہوں۔ اور مجھے جاننا بھی چاہئے کیونکہ اس خاندان سے ہمارا دلی تعلق ہے۔ اور یہ تعلق، یہ وابستگی اس قدر دیرپا ہے کہ دنیا سے لے کر آخرت تک کام دے گی۔ میں نے اوپر جن بزرگوں کا نام لیا۔ وہ خدا کے ایسے برگزیدہ بندے تھے جو شب دیجور میں بھٹکنے والے مسافروں کے لئے منزلِ مقصود کی نشاندہی کرتے تھے اور ہاتھ پکڑ کر سیدھی راہ چلاتے تھے۔

① علامہ حسن بریلوی کی شخصیت کیا ہے۔؟
② انھوں نے کیا ادبی خدمات انجام دی۔؟
③ ادب میں مولانا کا کیا مقام ہے۔؟
④ ان کے ادبی کارناموں میں زمانے کے حالات کی کس قدر ترجمانی ہے۔؟
⑤ شاعری میں مولانا کس اعلیٰ مقام پر فائز ہیں۔؟

ان تمام مسائل پر اس مقالہ میں روشنی ڈالی گئی ہے۔ میں نے اس سلسلے میں اپنے جن جذبات کا تحریر کی دنیا میں اظہار کیا ہے، ممکن ہے ان سے آپ کا ذوق اشتیاق پورا نہ ہو۔ لیکن اس مقالہ کو فراموش بھی نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیونکہ سراب سے دھوکا کھانے والے پیاسوں کے لئے شبنم کے چند قطرے بھی فرحت بخش ہوتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ کم از کم اسی جذبے کے تحت اس مقالہ کا مطالعہ کیا جائے گا۔ اسی میں میری کامیابی ہے اور یہی میرا مقصد ہے اور بس۔!

اس مقالہ میں، میں نے صرف سرسری جائزہ ہی پیش

...بیاں کیا ہے بلکہ اس کے پس منظر کا بھی ذکر کیا ہے۔ اور منطقی
...نقطۂ نظر سے اس میں ترتیب قائم رکھنے کی کوشش ہے۔ تاکہ
...آپ مطالعہ کرتے وقت اکتاہٹ کو محسوس نہ کریں اور زبان
...کے استعمال کرتے وقت بھی میں نے ادبی خوبیوں، لطافتوں
...کا لحاظ کیا ہے۔ تاکہ یہ مقالہ خشک ہو کر نہ رہ جائے۔ اس
...قسم کی زبان کا استعمال کرنا اہلِ قلم کی مجبوری ہوتی ہے۔ بقول
...غالب کہ۔

ہر چند ہو مشاہدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے بادۂ و ساغر کہے بغیر
مقصد ہے ناز و غمزہ و لے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے دشنہ و خنجر کہے بغیر

علامہ حسن رضا خاں حسن بریلوی پر جیسے ہی مقالہ لکھنے کا ارادہ کیا۔ ویسے ہی منطقی نقطۂ نظر سے ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مولانا شخصیت اس قابل ہے کہ اس پر مقالہ تحریر کیا جائے۔ کیا وہ جاذبیت اور کشش ان کی شاعری میں پائی جاتی ہے۔ جو عظیم شاعری کا مزاج ہے۔

اولاً:۔ اس سوال کا جواب دیا جائے گا تاکہ طلب مجہول کا الزام عائد نہ ہو۔ اور

ثانیاً:۔ علامہ حسن کی شخصیت کا سرسری جائزہ پیش کیا جائے گا تاکہ مطالعہ کرتے وقت قارئین پہلے ان کا تعارف حاصل کریں۔ پھر تفصیل کے میدان میں اتریں۔

مولانا حسن ہمہ گیر شخصیت

اردو شاعری کا جب ہم جائزہ لیتے ہیں۔ اور اس کی تاریخ پر جب غائرانہ نظر ڈالتے ہیں تو کہیں کہیں کچھ ایسے گوشے عزدرِل جاتے ہیں جن سے ہمارے ذہن و دماغ میں ایک ایسے فنکار کا تصور ابھرتا ہے جن کی شخصیت ہمہ گیر اور آفاقی نظر آتی ہے جو بیک وقت بہت سی خوبیوں کے مالک ہیں۔ وہ ادیب بھی ہے اور نثر نگار صحافی بھی، وہ شاعر بھی ہے اور منفرد لب ولہجہ کا مالک بھی۔ وہ ایسی باوقار شخصیت رکھتا ہے جس میں قوس و قزح کی رنگینی ہے اور حسن و جاذبیت بھی، وہ مدت مدید تک گوشۂ گمنامی میں رہ کر اردو ادب کی خدمت کرتا رہا اور شعر و سخن کی برہم زلفوں کو سنوارتا رہا۔ غزل ہو یا قصیدہ، مسدس ہو یا ترجیع بند، رباعیات ہوں یا قطعات ہر میدان میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے اور کامیابی کی حد تک کی ہے۔ زمین شورہ ہو یا سنگلاخ، پُر خار وادی ہو یا تنگ پہاڑی پر راہ میں انھوں نے کامیاب سفر کیا۔ اور دامن کا کوئی تار بھی ضائع نہ ہوا۔ وہ کون ہے جو ان اوصاف کا مالک ہے اور اس قدر عظیم ہے۔؟ اس سے میری مراد حضرت علامہ مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی سے ہے۔ وہ صاحب دیوان شاعر تھے۔ غزل میں ان کا دیوان "ثمر فصاحت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اور اب تو یہ بہت نایاب ہے۔ جس میں فکر و آگہی، شعور و ادراک، نازکی و رعنائی، شوخی اور کھلتا ہوا انداز بیاں پایا جاتا ہے ان کی غزل کے ایک ایک لفظ سے لطافت، نظافت اور حسن و بانکپن ٹپکتا ہے۔ اردو نعت میں ان کا دیوان "ذوق نعت" ہے جو آج ہر جگہ دستیاب ہے۔ جس میں عشق پاکباز، جذبۂ خودسپردگی، خلوص و وفا، تسلیم و رضا اور سوز و گداز بدرجۂ اتم پایا جاتا ہے۔ وہ غزل کے ساتھ ساتھ نعت و منقبت کو بھی اپنا میدان تصور کرتے تھے۔ وہ نعتیہ میدان کے بہترین شہسوار ہی نہیں بلکہ جدید رجحانات اور نئے امکانات کے موجد بھی ہیں۔ نعت و منقبت کو انھوں نے ایک صنفِ سخن کی حیثیت سے برتا ہے — قدیم طرز بیان سے گریز کرتے ہوئے انھوں نے جدید طرز اور نئے لب و لہجہ میں نعتیہ شاعری کی ہے۔ اور اسے نئے آہنگ سے آشنا کیا ہے۔ یہی سوال کرنا چاہتا ہوں کہ نعت کو غزل کے روپ میں کس نے پیش کیا؟ اور اسے غزل سا بانکپن کس نے بخشا؟ ظاہر ہے اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ علامہ حسن بریلوی نے۔ یقیناً وہ استادِ زمن تھے۔ یہ تمام خوبیاں، یہ تمام کمالات ان کے کمالِ فن پر دلالت کرتی ہیں۔ اور ان کے خلوص علم و فن کی واضح علامت

ہیں۔ غزل جو ایک آزاد صنفِ سخن ہے۔ اس میں کسی قسم کی پابندی نہیں ہوتی۔ لیکن نعت ایک ایسی صنفِ سخن ہے جو صرف پُر خار وادی سے گزرتی ہی نہیں ہے بلکہ اس میں طرح طرح کی پابندیاں ہوتی ہیں۔ تصورات و خیالات پر پابندی، احساسات و جذبات پر پابندی، زبان و بیان پر پابندی، جملہ و ترکیب پر پابندی۔ بتائیے! نعت گوئی کوئی آسان کام ہے۔؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔! بلکہ یہ بہت دشوار فن ہے۔ نعت گوئی پلصراط پر چلنے سے مترادف ہے۔ یہ تلوار کی دھار سے زیادہ تیز اور بال سے زیادہ باریک ہے۔ کیونکہ فن نعت گوئی میں شاعر آزاد نہیں ہوتا۔ قدم قدم پر اس کے لئے خطرے ہیں۔ لفظ و بیان پر پہرے ہیں۔ جذبات و احساسات اس میں کھل کر پیش نہیں کر سکتے۔ اس میں جوش نہیں ہوش چاہئے۔ جنون و دیوانگی نہیں بلکہ فرزانگی و ہوشیاری چاہئے۔ لغزشِ مستانہ نہیں بلکہ اس میں تفکر و ہوشیاری کی ضرورت ہے۔ ؎

پیشِ نظر وہ نو بہار سجدے کو دل ہے بیقرار
روکئے سر کو روکئے ہاں یہی امتحان ہے

ہادیٔ برحق رسولِ اعظم صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کی وہ عالی بارگاہ ہے جو آفاق کی شیشہ گری سے زیادہ نازک ہے یہاں سانس لینا بھی سوءِ ادبی ہے۔

ادب گاہیست زیرِ آسماں از عرش نازک تر
نفس گم کردہ می آید جنید و بایزید ایں جا

سنگِ درِ جاناں ہے ٹھوکر نہ لگے اس کو
بے ہوش پکڑ اب تو اے لغزشِ مستانہ

مولانا حسن بریلوی نے غزل گوئی میں دیوانگی و کمالِ جنون انگیزی سے کام لیا۔ شکوہ و شکایت کا مظاہرہ کیا۔ ہجر و فراق کے نالے بلند کئے۔ خود کو خانہ خراب کہا۔ مولانا موصوف غزل میں محبوب سے کس طرح لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمائیے۔

کون کہتا ہے کہ آپ آئیں مسیحا بن کر
کیا مریضوں کی عیادت بھی بری ہوتی ہے

لیکن جب وہ نعت کے میدان میں آئے تو سنجیدہ ہو گئے اور ادب و احترام کے سانچے میں ڈھل گئے۔ انھوں نے نعت گوئی کی۔ لیکن ڈرتے جھجکتے اور کبھی خوف سے رکتے پھر امام اہلسنت اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی سے فیض لے کر آگے بڑھتے۔

بھلا ہے حسن کا جنابِ رضا سے
بھلا ہو الٰہی جنابِ رضا کا

کہا جاتا ہے علامہ حسن بریلوی نے ایک نعت کہی مگر اس میں ایک شعر ایسا تھا جو نہایت ہی چبھتا ہوا تھا۔ اور جس میں نہایت ہی خوش اسلوبی سے علم و فن کا تذکرہ کیا گیا تھا۔ ایک فلسفہ شعر کے قالب میں ڈھالا گیا تھا۔ حضرت رضا کی بارگاہ میں نعت مذکور سنانے کے لئے کھڑے ہوئے اور نعت پڑھنا شروع کیا۔ ہر شعر پر کیف و سرور کا عالم طاری ہو رہا تھا۔ مولانا پڑھتے پڑھتے جب اس شعر پر پہونچے کہ۔

خدا کرتا ہوتا جو تحتِ مشیت
خدا ہو کے آتا یہ بندہ خدا کا

تو علامہ حسن بریلوی کا چہرہ زرد ہو گیا خوف کا عالم طاری ہو گیا۔ جسم کا ریشہ ریشہ لرزہ براندام ہو گیا۔ کیونکہ یہ صرف شعر ہی نہ تھا۔ بلکہ ایک عقیدہ تھا۔ ایک فلسفہ تھا جو بیان ہو رہا تھا۔ اور مولانا اس لحاظ سے بھی ڈر رہے تھے کہ یہ نعت اس ذات کی بارگاہ میں پڑھی جا رہی تھی جو اپنے وقت کے امامِ فن تھے۔ مولانا حسن بریلوی نے جس حسن و خوبی سے اس صورتِ حال کی نزاکت کا اظہار کیا ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔

میں نے مولانا حسن کی شاعری کا گہرائی سے مطالعہ کیا ہے، اور نقد و تجزیہ سے کام لیتے ہوئے میں نے یہ محسوس کیا کہ مولانا کی شاعری عظیم بھی ہے اور حسین بھی۔ جہاں ان کی شاعری میں بلند مضامین اور رفعتِ تخیل پائے جاتے ہیں تو وہیں شاعرانہ حسن و خوبی بھی ہے۔ زبان و بیان کا کمال بھی ہے جو مسکرا رہا ہے۔ گہری نظر سے دیکھا جائے تو شاعرانہ عظمت اور شاعرانہ حسن و خوبی میں بہت فرق ہے یہ دو الگ الگ کمالات ہیں۔ لیکن ان دونوں کا حسین امتزاج ان کی شاعری میں ملتا ہے۔

ان کی شاعری میں رفعت خیال، جدت مضامین ندرت فن اور افکار نو کی فضا بندی پائی جاتی ہے۔ جن سے ان کے کلام میں شاعرانہ عظمت ابھرتی ہے۔ اور دوسری طرف ان کی شاعری میں عام بول چال، روزمرہ کی زبان، مانوس اور شگفتہ الفاظ ہیں۔ اور ضرورت کی حد تک محاورات، رمز و کنایات استعارات اور پیکروں کا استعمال پایا جاتا ہے۔ جس سے ان کی شاعری خوب سے خوب تر ہو گئی ہے۔

میں نے مولانا حسن بریلوی کی شاعری میں جن خصوصیات کا تذکرہ کیا۔ وہ عقیدت کی بنیاد پر نہیں بلکہ واقفیت اور صداقت کی بنیاد پر کیا۔ واقفیت اور صداقت کا تعلق کسی ایک زمانہ یا ایک دور سے نہیں ہوتا ہے بلکہ ہر دور میں اس کی آؤ بھگت ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں ایسی جاذبیت اور کشش ہوتی ہے کہ ہر دانشمند طبقہ اس کو ماننے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ صداقت صرف ان کی شاعری میں ہی نہیں بلکہ ان کی شخصیت میں بھی پائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری کے ساتھ ساتھ ان کی شخصیت بھی آفاقی اور ہمہ گیر ہو گئی ہے۔ میں اگرچہ ان کے خاندان سے گہری عقیدت رکھتا ہوں۔ لیکن اس مقالہ میں جذبہ عقیدت کا لحاظ نہیں کیا گیا ہے۔ بلکہ اس میں جو بھی تحریر کیا گیا ہے اس میں واقفیت اور صداقت سے کام لیا گیا ہے۔ میں نے مولانا حسن بریلوی کی شخصیت کے بارے میں اپنا جو نظریہ قائم کیا ہے اسے "ہوائی محل" سے تعبیر نہ کیا جائے۔ کیونکہ اس کی بنیاد حقیقت، صداقت اور حقانیت پر قائم ہے ہر دور میں دانشوروں کی روایت رہی ہے۔ اور انہوں نے حق بات کا برملا اعتراف کیا ہے۔ مولانا کی شاعری کے بارے میں دانشوروں نے کیا کہا ہے۔ آیئے اس کا مطالعہ کرتے چلیں تاکہ یہ بات واضح ہو جائے کہ مولانا کی شخصیت کیا ہے اور ان کی شاعری میں کن خصوصیات کی آمیزش پائی جاتی ہے

مولانا حسن دانشوروں کی نظر میں

(۱) جناب منشی شریف خان صاحب آزاد مہتمم جلوۂ یار میرٹھ لکھتے ہیں۔

اب اس مرحوم کا چھپتا ہے دیوان
زمانے میں خوب ہو اس کی اشاعت
ہے یہ جلوہ گاہِ حسن خوباں
کہ ہے ہر ماہرو کی اس میں صورت
فصاحت میں جو ہے ہم رنگ مومن
نظر آتی ہے غالب کی بلاغت

~~~~~

کلام ایدل چنیں شیریں زد
نمایاں صاف کیف انگبیں است
چہ اوصاف حسن آزاد گویم
ہمیں خاقانی و بے دل ہمیں است

(۲) جناب حضرت مولانا احسن مارہروی جو داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں سے تھے۔ فرماتے ہیں۔

کہ وہ شہر خموشاں میں ہیں باتیں رہ گئیں ان کی
انھیں باتوں کو حاصل اب حیات جاودانی ہے
وہ باتیں سربسر گویا سخن سنجوں کی باتیں ہیں
کہ جن میں عاشقانہ رنگ کی شیریں زبانی ہے
انھیں باتوں سے باتوں میں بن گیا دیوان
کہ جس کی ہر غزل سرمایہ دار خوش بیانی ہے

(۳) جناب مولانا نور محمد صاحب الور مدرس مدرسہ ہاشمیہ بمبئی۔ تلمیذ حضرت مولانا حکیم نظامی لکھتے ہیں۔

واہ کیا اچھا چھپا دیوانِ مولینا حسن
یہ فصاحت یہ بلاغت یہ لطافت دیکھنا
پردۂ الفاظ میں ہے شاہد معنی یہاں
ہے مجازی میں نہاں رنگِ حقیقت دیکھنا

~~~~~

چست بندش صاف معنی شوخ مضمون نیک فکر
کیوں نہ ہو پھر خوبیوں میں ایک دیوانِ حسن

(۴) جناب حاجی سید تجمل حسین صاحب تجمل چشتی جلالپوری فرماتے ہیں:۔

بھرا ہے حسن دیوان حسن میں
غضب کی ہر غزل میں

متانت میں قیامت کی ہے شوخی
زباں پاکیزہ و بندش چلبلی ہے
ہے دوہرا لطف انداز بیاں میں
بلاغت میں فصاحت وہ بھری ہے
مجازی رنگ میں رمز حقیقت
کمال ظاہری و باطنی ہے
وہ دیکھیں شاہدِ معنی کا جلوہ
جنھیں چشم بصیرت حق نے دی ہے
ہیں ظاہر میں تو شعر عاشقانہ
مگر باطن میں معنی اور ہی ہے
مضامیں ہیں امیر نامور کے
زباں اس میں جناب داغ کی ہے

(۵) جناب سید محمود علی صاحب عاشق بریلوی فرماتے ہیں:

حسنِ بندش کی صفا وہ دلکشا!
بند ہو جس طرح شیشے میں پری
اس کی ہر ہر بات میں اک بات ہے
اس کی ہر ہر بات ہے شوخی بھری
جان دیں کیونکر نہ اس پر اہل عشق
ہے ادا اس کی نکیلی چلبلی
ہر مسلسل شعر زلف حور ہے
ہر غزل ہے حسن مضمون سے بھری
فقرے فقرے سے فصاحت ہے عیاں
جملے جملے میں بلاغت ہے بھری
کہنے کو یہ فیض ہیں سب داغ کے
پر طبیعت ہی غضب کی پائی تھی

جن شاعروں، دانشوروں نے حضرت علامہ حسن بریلوی کی شاعری پر تبصرے کئے اور شاعری کی زبان میں اپنے جن تاثرات کا اظہار کیا ہے اس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حسن بریلوی نے کس انداز میں شاعری کی۔ اور اس میں کیا کیا ندرت معنی و مضمون پائی جاتی ہے۔ بندش و ترکیب میں کیسی کیسی جدت کی پہنائیاں ہیں۔ یہی وہ خوبیاں ہیں جو علامہ حسن بریلوی کو بڑے شاعروں میں شمار کرنے پر مجبور کر رہی ہیں۔

مولانا موصوف کو خاقانی و بیدل سے تعبیر کرنا، ان کی شاعری میں غالب کی بلاغت اور مومن کے رنگ کا پایا جانا حضرت امیر مینائی کے مضامین اور زبانِ داغ کی موجودگی اس بات کا احساس دلا رہی ہے کہ مولانا کی ذات مجمع صفات ہے۔ ان کی شاعری میں ندرت فکر، حسن معانی، جدت مضامین اور نادر و نایاب رموز و کنایات ہیں۔ اس میں ایسی دلکشی و صفائی ہے کہ اس پر توجہ مرکوز کیا جائے۔ اور اس پر مقالہ تحریر کیا جائے۔

ایک تلخ حقیقت

لیکن ہمیں افسوس ہے ان لوگوں پر جنھوں نے اردو ادب کی تاریخ لکھی۔ اردو شعراء کے تذکرے تصنیف کئے۔ اردو ادب کا عہد بہ عہد جائزہ پیش کیا گیا۔ ان تذکروں میں، نثر نگاروں، انشاء پردازیوں، قصیدہ اور غزل گو حضرات کے حالات اور خصوصیات کلام قلمبند کئے گئے۔ جب میری نگاہ تاریخ کی ان کتابوں پر پڑتی ہے۔ تو ہمیں ایک طرف استادانِ فن میر و غالب، ذوق و مومن، داغ و ظفر اور آتش و ناسخ کے تذکرے ملتے ہیں۔ تو دوسری طرف اقبال و فانی، حسرت و جگر اور ان لوگوں کے مفصل تذکرے دستیاب ہوتے ہیں۔ جنھوں نے جدید غزل کو ترقی دینے میں نمایاں کام انجام دیا۔ لیکن تعجب اس بات سے ہوتا ہے کہ ان تذکروں میں علامہ حسن بریلوی کا تذکرہ نہیں ہے۔ ایسا کیوں۔؟ کیا وہ ادیب نہ تھے۔؟ کیا وہ شاعر نہ تھے۔؟ کیا ان کی شاعری میں جذبہ و جوش نہیں ہے؟ کیا ان کے کلام میں درد و تڑپ، خلوص و پیار، سوز و گداز اور تسلیم و رضا کی کمی تھی۔؟ ظاہر ہے ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ وہ بڑے قادر الکلام شاعر تھے۔ نعت و منقبت، غزل، قصیدہ اور رباعی و مسدس جیسی اہم اصناف سخن میں انھوں نے طبع آزمائی کی ہے۔ ان کے اندر کسی قسم کی کمی نہ تھی۔

بلکہ تاریخ نویسوں نے قلمی خیانت سے کام لیا اور انھیں صرف "مولوی" سمجھ کر نظر انداز کر دیا۔ جب کہ مولوی ہونا قادر الکلام شاعر ہونے کے منافی نہیں ہے۔ اس مقالہ کے مطالعہ سے اس بات کا اندازہ ہو جائے گا کہ علامہ حسن بریلوی شاعری میں وہ تمام کمالات و خصوصیات پائی جاتی ہیں جو فنون لطیفہ کے لئے ضروری ہیں۔ ان کے کلام میں نہ تو بھرتی کے الفاظ ہیں اور نہ ہی وہ گھسے پٹے مضامین باندھتے ہیں۔ بلکہ ان کا اشہب فکر بہت دور دور تک پرواز کرتا ہے۔ اور ایسے ایسے جدید مضامین تلاش کر کے لاتا ہے کہ طبیعت واہ کر اٹھتی ہے۔ اور ذوق وجمال جھوم جھوم سا جاتا ہے۔ ان کی شاعری وہبی شاعری ہے۔ ان کی شاعری فطرت کی شاعری ہے۔ اس کے باوجود تاریخ و تنقید کے اوراق سے غائب۔ یہ کس قدر تعجب کی بات ہے۔؟

لیکن اصلیت اپنی جاذبیت و کشش برقرار رکھتی ہے۔ وہ مانی نہیں جاتی ہے بلکہ بذات خود منوا لیتی ہے۔ اسی لئے کہا جاتا ہے۔ "الحق یعلو ولا یعلیٰ" حق خود بلند ہوتا ہے اس کو بلند نہیں کیا جاتا ہے۔ علامہ حسن بریلوی کی شاعری حق وصداقت پر مبنی ہے۔ اصلیت و واقعیت میں رچی بسی ہے اہل قلم اس کا ذکر کریں یا نہ کریں۔ تاریخ نویس انھیں اپنے صفحات میں جگہ دیں یا نہ دیں۔ ان کے کمالات و خصوصیات اور انفرادی صلاحیتوں کو چھپایا نہیں جا سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ کسی نے انہیں خاقانی و بیدل سے تعبیر کیا۔ اور کسی نے ان کی شاعری میں غالب کی بلاغت کا سا انداز دیکھا۔ اور رنگ مومن کی چھاپ دیکھی۔ اور اب تو دھیرے دھیرے کچھ ایسے بھی نئے چہرے دیکھنے کو مل رہے ہیں جنھوں نے علامہ حسن جیسے قیمتی اور گراں بہا ہیرے کی شناخت کر لی۔ اور ان کی چمک دمک سے اپنی تحریروں کو زینت بخش رہے ہیں۔ ان نئے چہروں میں اولیت کا سہرہ حضرت مولانا فیض الحسن حسرت موہانی کو حاصل ہے۔ انھوں نے برملا علامہ حسن کی شاعری کا اعتراف کیا ہے۔ اور تبصرہ لکھتے ہوئے فرمایا ہے کہ مولانا کے بعض اشعار ایسے ہیں کہ ان کے اور داغ دہلوی کے شعار میں امتیاز کرنا دشوار ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد جناب سید لطیف حسین ادیب بریلوی نے ان کی شاعرانہ زندگی پر روشنی ڈالی ہے۔ اور اپنے مضامین میں ان کے شاعرانہ کارنامے کا بیان کیا ہے۔ اور تیسرے نمبر پر جناب صابر حسین سنبھلی کا نام آتا ہے موصوف نے اپنی کتاب "تنقید و تجزیہ" میں مولانا حسن کی نعت گوئی پر تفصیل سے بحث کی ہے۔ اور علامہ موصوف کو "جانشین داغ" کا اہم منصب سونپے جانے کی بات کہی ہے۔ آخر میں ہم جناب اسعد بدایونی کا ذکر کرنا چاہتے ہیں۔ موصوف نے "داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ" نامی کتاب لکھی ہے۔ جس میں موصوف نے علامہ حسن بریلوی کی شاعری کا ذکر کیا ہے۔ ان کی قابلیت لیاقت اور فکری توانائی کا تذکرہ جمیل کیا ہے۔ اور موصوف نے مولانا کو قادر الکلام شاعر تو تسلیم کیا ہے۔ لیکن بڑے شاعر ماننے سے انکار کیا ہے اس سلسلے میں موصوف نے مولانا کے چند اشعار کا تذکرہ کیا ہے۔ جس کو ہم ذیل میں پیش کر رہے ہیں۔

(۱) موت بھی کیا جانے کچھ بیمار ہے
کیوں نہیں آتی کچھ بیمار تک

(۲) آئینہ تمہارے نقش پا کا
خورشید کو دے سبق جلا کا

(۳) او وصل میں منہ چھپانے والے
یہ بھی کوئی وقت ہے حیا کا

(۴) اے عاشقو نوید کہ سنتے ہیں آج وہ
افسانہ دل جلوں کا زبان چراغ ہے

(۵) تربت مجنوں نظر آئی جو وحشت میں حسن
میں چڑھانے کو گل چاک گریباں لے چلا

مندرجہ بالا اشعار پر تبصرہ کرتے ہوئے جناب اسعد بدایونی لکھتے ہیں۔

"مندرجہ بالا اشعار میں مروجہ مضامین کو تھوڑی سی ندرت کے ساتھ پیش کرنے کی شعوری کوشش کا اظہار ہوتا ہے پامال مضامین کو نئے اور اچھے ڈھنگ سے استعمال کرنا بڑے شاعروں کا کام ہے حسن کے یہاں یہ کوشش نظر آتی ہے۔ مگر ان کے اشعار اس پائے کو نہیں پہونچتے

جس کے سبب انہیں بڑے شاعروں میں شامل کیا جاسکے البتہ ایسے اشعار کی بنا پر انہیں قادر الکلام شاعر تسلیم نہیں کیا جا سکتا ہے۔" (داغ کے اہم تلامذہ صفحہ ۶۵)

اسعد صاحب نے مولانا حسن کو بڑے شاعروں میں شمار نہ کرکے انصاف و دیانت سے کام نہیں لیا۔ اگر وہ جذبۂ انصاف سے کام لیتے تو یقینی طور پر انہیں حسن بریلوی بڑے شاعروں کی صف میں نمایاں طور پر نظر آتے۔ کیوں کہ ان کے دونوں دیوان "ثمر فصاحت" اور "ذوق نعت" میں ایسے بہت سے اشعار ہیں جن میں پامال مضامین ندرت اور اچھوتے ڈھنگ سے پیش کئے گئے ہیں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مولانا کی ذات اور شخصیت تنقید سے بالاتر ہے۔ تنقید کی جائے اور خوب کی جائے۔ مگر تنقید ایسی ہو جس میں صداقت، دیانت اور حقانیت کی روح پائی جائے۔ اس مقالہ میں انشاء اللہ آپ محسوس کریں گے کہ مولانا موصوف نے کس ندرت اور اچھوتے انداز بیان میں پامال مضامین پیش کئے ہیں۔ اور حقائق و معلومات کے اجالے میں آپ یہ فیصلہ کرتے وقت ذرا بھی دقت محسوس نہ کریں گے کہ مولانا موصوف بلاشک و تردد بڑے شاعر تھے۔

گزشتہ اوراق میں یہ واضح ہو چکا ہے کہ "ماہنامہ سنی دنیا" مولانا کی ادبی خدمات پر ایک نمبر نکالنے جا رہا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ ادبی خدمات کیا ہیں۔؟ اور کن چیزوں پر ادبی خدمات کا اطلاق ہوتا ہے۔؟ شعری مجموعے کیا ادبی خدمات کے زمرے میں آتے ہیں یا نہیں آتے ہیں اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے کہ شاعری ادبی خدمات میں آتی ہے۔ اس سے زبان و بیان کی اصلاح ہوتی ہے اور انسان شاعری کی زبان میں اپنے جذبات و احساسات کو پیش کرنے کی کوشش کرتا ہے اور سامعین و قارئین کے دلوں میں جذبات ابھارنے کی کوشش کرتا ہے۔ نثر کے مقابلہ میں شاعری زیادہ پُرتاثیر ہوتی ہے۔ اس سے بڑے بڑے کام لئے جاتے ہیں۔ ہر دور میں سماج و معاشرہ اور سوسائٹی کی اصلاح شاعری سے کی گئی ہے مردہ دلوں میں انقلابی کیفیت بیدار کرنے کا ذریعہ اگر کچھ ہے تو وہ شاعری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عرب و ایران اور دیگر ملکوں میں شاعری کو اہمیت کا مقام عطا کیا گیا ہے۔ ایام جاہلیت میں شاعری کا چرچا بہت عام تھا۔ ہر قبیلے میں بڑے بڑے شاعر ہوا کرتے تھے۔ جس پر ہر قبیلے کے افراد فخر کرتے تھے۔ کسی بھی ادب کا مطالعہ کیجئے اس میں شاعری کو اہمیت دی گئی ہے۔ اردو، فارسی، عربی اور انگلش ہر زبان میں شاعری ملتی ہے۔ قومی افتخار شاعری میں ہے جنگ کے موقعہ پر اجز خوانی کی جاتی ہے۔ موت یا غم کے موقعہ پر مرثیہ خوانی ہوتی ہے اور حد تو یہ ہے کہ کوئی بھی ادبی بزم بغیر اشعار کے مکمل نہیں مانی جاتی ہے۔ اس وجہ سے ہم یہ کہنے میں حق بجانب ہیں کہ ادب کا تصور ہی شاعری سے ابھر تا ہے شاعری کا تذکرہ کئے بغیر ادبی خدمات پر کوئی نمبر نہیں نکالا جاسکتا ہے۔ ادب کیا ہے؟ اس کی وضاحت کرتے ہوئے حسن زیات صاحب لکھتے ہیں۔

"کسی زبان کے شعراء و مصنفین کا وہ نادر کلام جس میں نازک خیالات و جذبات کی عکاسی اور باریک معانی و مطالب کی ترجمانی کی گئی ہو۔ اس زبان کا "ادب" کہلاتا ہے۔ اسی ادب کی بدولت نفس انسانی میں شائستگی۔ اس کے افکار و خیالات میں جلاء اس کے احساسات میں نزاکت و حسن اور زبان میں سلاست و زور پیدا ہوتا ہے ادب کا اطلاق ان تصانیف پر بھی ہوتا ہے جو کسی علمی یا ادبی شعبے میں تحقیق کا نتیجہ ہو۔ اس لحاظ سے گویا لفظ ادب ان تمام تصانیف کو اپنے احاطہ میں لے لیتا ہے جو محقق علماء کے انکشافات مضمون نگاروں کے افکار، شاعروں کے انوکھے تخیلات اور نازک تصورات پر مشتمل ہوں۔"

(تاریخ ادب عربی)

یہ ادب کا جدید تصور ہے جس کو حسن زیات صاحب نے فرمایا اور اس میں اس قدر وسعت ہے کہ شاعری، نثر نگاری، مضامین، علمی و فکری سب کے سب ادب کے اجزاء میں سے ہیں۔ لیکن ایک وہ بھی دور تھا جب کہ شاعری ہی کو "کل ادب" سمجھا جاتا تھا۔

ایچ، اے، آر، گب اپنی کتاب "عربک لٹریچر" کے صفحہ ۱۴ پر لکھتے ہیں۔

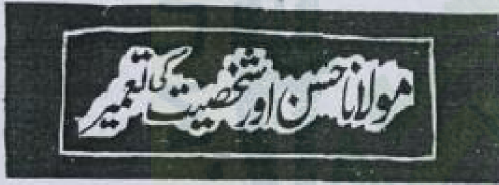
" دنیا کے زیادہ تر عظیم ادبوں کی طرح عربی ادب بھی شاعری کے ذریعہ ظہور پذیر ہوا۔"

اس سے واضح ہوا کہ ادب اور شاعری میں کس قدر مضبوط رشتہ ہے کہ شاعری کے توسط سے ہی ادب کا ظہور ہوتا ہے۔ اگر شاعری نہ ہوتی تو شاید ادب کا تصور بھی نہ ہوتا۔ ادب کا یہ تصور بہت سے مراحل سے گزر کر اس منزل پر پہونچا کہ آج ہم ادب سے شاعری، نثر گاری اور علمی انکشافات مراد لیتے ہیں۔ تغیرات زمانہ کے شانہ بشانہ ادب میں بھی تغیرات آئے۔ مغربی و مشرقی تہذیبوں کے ملاپ سے اس میں نئے نئے امکانات نے اپنے پاؤں پھیلائے اور جدید رجحانات جنم لئے اس طرح ادب میں وسعت آتی چلی گئی۔ اور اس کا مفہوم وسیع سے وسیع تر ہوتا چلا گیا کسی نے ادب میں جمالیاتی پہلوؤں کو تلاش کرنے کی کوشش کی اور کسی نے اس میں حیات و زیست کی سادگی کی جھلک دیکھنے کی شعوری جد وجہد کی۔ یہی وجہ ہے کہ ادب میں خاص طور سے دو نظریئے نظر آتے ہیں۔

اول ادب برائے ادب اور دوسرا ادب برائے زندگی۔

جو لوگ ادب برائے ادب کے نظریہ کے قائل ہیں وہ ادب میں صرف جمالیاتی اقدار کو تلاش کرتے ہیں اور اس کو مسرت و لطف حاصل کرنے کا ایک ذریعہ تصور کرتے ہیں۔ حسین الفاظ اور شگفتہ اسلوب بیانی کے مجموعہ کا نام ادب نہیں ہے۔ بے شک ادب میں خوبصورت الفاظ ہونا چاہئے۔ اس کا اسلوب شگفتہ اور خوشگوار ہو۔ لیکن ساتھ ہی اس میں زندگی کی جھلک کا ہونا بھی ضروری ہے۔ زمانے کی ترجمانی بھی اس میں پائی جائے۔ اقدار حیات اس میں رچے بسے ہوں۔ جس ادب میں ان خوبیوں کے ساتھ اعلیٰ جذبات واحساسات اور خیالات پائے جاتے ہیں وہ ادب "ادب العالیہ" کے نام سے پکارا جاتا ہے۔

مولانا حسن بریلوی ادیب تھے اور بہت بڑے ادیب تھے۔ وہ شاعر تھے اور بہت بڑے شاعر تھے۔ لیکن ان کی ادبی شخصیت کیسی تھی۔؟ وہ اقدار حیات کو کس نظریئے سے دیکھتے تھے۔؟ ان کی شاعری میں بیان کردہ جذبات و خیالات اس قسم کے ہیں۔ اس کی وضاحت کے لئے ہمیں ان کی شخصیت سے بحث کرنا پڑے گا۔ اس ماحول کی طرف توجہ مرکوز کرنی پڑے گی۔ جس ماحول اور آب و ہوا نے انھیں ادیب و شاعر بنایا اور استاد زمن کے عظیم منصب پر فائز کیا۔ اسی طرح ان کی ادبی حیثیت کو ثابت کرنے کے لئے ہمیں ان کی زندگی کے اور بھی اہم پہلوؤں کو لے کر چلنا پڑے گا۔ جیسے تعلیم و تربیت، سماج و معاشرہ، ماحول اور سوسائٹی۔ کیونکہ ادب خواہ وہ شاعری ہو یا نثر نگاری ہے ایک تخلیقی فن ہے۔ اور کسی بھی تخلیقی فن پارہ میں ادیب کی شخصیت اور اس ماحول کو دیکھا جا سکتا ہے جس میں یہ فن پارہ تخلیق پایا۔ تو پھر آیئے مولانا حسن بریلوی کی شخصیت اور ان کی تعلیم و تربیت نیز ان کے دیگر اقدار حیات کا جائزہ لیتے ہیں۔



شخصیت کیا ہوتی ہے؟ اور اس کی تعمیر کن خطوط پر ہوتی ہے؟ پھر یہ کہ مولانا حسن بریلوی کی شخصیت میں کیا عناصر پائے جاتے ہیں۔؟ اس باب کے تحت ان تمام پہلوؤں پر گفتگو کی جائیگی پروفیسر احتشام حسین فن اور شخصیت کے مصنف لکھتے ہیں۔

" فرد کی ظاہری اور باطنی حیثیت سے مل کر جو وجود ابھرتا ہے اس کو شخصیت کہتے ہیں۔ شخصیت فقط کسی شخص کا حلیہ اور سراپا نہیں ہوتا بلکہ شکل وصورت، عقل و مزاج، عادات و اطوار، خصائل و کردار، عقائد و افکار اور تجربات و مشاہدات ان تمام سے مل کر شخصیت بنتی ہے اور رفتہ رفتہ اس کا ارتقا ہوتا ہے۔ ہم بظاہر کسی کے قد و قامت کی خوبی یا خوبصورتی سے متاثر ہوتے ہیں لیکن جب اس کی باتوں میں کھوکھلا پن یا تجربات و مشاہدات میں کمی نظر آتی ہے تو ظاہر ہو جاتا ہے

لہ یہ شخصیت کھوکھلی ہے۔ شخصیت کی مثال حریم ناز کی پردوں
کی ہے۔ پردے اٹھاتے ہوئے بڑھتے جائیے۔ شوقِ دید
بڑھتا جائے گا۔ لیکن اگر آپ نے ان پردوں میں چھپے ہوئے
کسی محبوب کو نہ پایا اور آپ کا اندازہ غلط نکلا تو آپ مایوسی
کے شکار ہو جائیں گے، خوشنما خدوخال، دلکش چہرے
والا پیاز کی مانند ہو سکتا ہے جس کی حیثیت چھلکوں کے سوا
کچھ نہیں ہوتی۔ یہ تمام باتیں ثابت کرتی ہیں کہ انسان کی ظاہری
حیثیت ایک صدف کی طرح ہے۔ جس میں شخصیت
کی بوند کی مثل پروان چڑھتی ہے اور آخر کار صدف کو توڑ کر
جب باہر نکلتی ہے تو "درِ ثمین"، کی صورت میں سامنے آکر
مشاہدہ کرنے والے کی آنکھوں کو دعوتِ نظارہ دیتی ہے۔"

(پروفیسر احتشام حسین فن اور شخصیت)

مذکورہ بالا بیان سے ثابت ہوتا ہے کہ شخصیت ابرنیساں
کی بوند کی طرح انسان کی ظاہری شکل و صورت میں رہتی ہے
اور پھر اپنے مدار سے نکل کر دھیرے دھیرے منزل بہ منزل
ہوتی ہوئی خطِ مستقیم کی صورت میں درِ ثمین تک پہونچتی ہے
ظاہر ہے شخصیت کا یہ ارتقائی سفر حرکی نظام پر قائم ہے
شخصیت کی یہ حرکت فطری ہے۔ جبلی ہے یا غیر فطری اور شعوری
ہے۔ ایک مفکر کا ذہن اس بات کے اعتراف میں کوئی جھجک
محسوس نہ کرے گا کہ شخصیت کی یہ حرکت اور یہ نمو فطری اور
جبلی ہے۔ کیونکہ کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں جتنے بھی ذرے
ہیں وہ فطری طور پر اظہار کے تمنائی ہوتے ہیں۔ اور شخصیت
کائنات سے باہر نہیں ہے۔ جس طرح سے ایک دانہ زمین کے
سینے میں رہ کر زمین کی فطرت سے وہ فیضیاب ہوتا ہے اور
اپنی صلاحیت کا اظہار ایک ننھا سا پودا بن کر کرتا ہے۔ پھر
پودے تناور درخت تک کے مراحل کو وہ خود بخود طے کرتا ہے۔
اور اس طرح وہ اپنی ہری بھری شاخوں سے بہار و مستی، حسن و
رعنائی اور شگفتگی و تازگی کا اظہار کرتا ہے۔ اسی طرح ایک نومولود
بچہ اپنی حرکتوں سے قوتِ اظہار کا مظاہرہ کرتا ہے۔ نومولود بچہ
کی پرورش کے ساتھ ساتھ اس کی شخصیت کی بھی تشکیل ہوتی
ہے۔ جوں جوں شخصیت میں شعوری کیفیت کا اضافہ ہوتا رہتا
ہے ٹھیک اسی طرح اس کی قوتِ اظہار پختہ و پختہ ہوتی رہتی
ہے۔ اور یہ ارتقائی حرکت انسان کی موت کے ساتھ ختم ہوتی
ہے۔ شخصیت کا ارتقاء اور اس کی نمو اگرچہ فطری ہے۔ لیکن
اس کو اعلیٰ اور دیدہ زیب و پُرکشش بنانے میں خود اس کے عقل و
شعور، قصد و ارادہ اور ماحول و سماج کو دخل ہے۔ انسان اگر
محنت و مشقت اور جانفشانی سے تعلیم و تربیت میں کوشش
کرے گا۔ اور اچھی سوسائٹی پسند کرے گا۔ تو اس کی شخصیت
بھی اچھی ہوگی۔ ورنہ اس کی شخصیت کھوکھلا اور پیازی ہو کر رہ
جائے گی۔ جس میں صرف حریم ناز کے پردے ہی ہوں گے۔ اور
کوئی محبوب صورت اس میں نظر نہ آئے گی۔ مولانا حسن بریلوی کی
شخصیت کی تعمیر کس ماحول میں ہوئی۔ انھوں نے وراثت میں
کیا پایا۔ ان کا تعلق کس علاقہ سے تھا۔؟ اس کو جاننے کے لئے
مندرجہ ذیل تحریروں کو پڑھئے۔!

بریلی علم و فن کے میدان میں

اس عظیم شاعر کا تعلق ایک ایسے شہر سے ہے جو علم و فن کا شہر
ہے، جو خلوص و وفا کی سرزمین ہے۔ وہ کون سا شہر ہے۔؟
بریلی ہے۔! جو ظلمتوں کے ہجوم میں ضوفشاں ہے۔! یہ ایک
مینارِ نور ہے، جو محبت کی روشنی بکھیرتا ہے۔ یہ ایک سنگِ
میل ہے جو انسان کو بامقصد منزلِ حیات کی بشارت دیتا ہے
یہ ایک محرابِ تصوف ہے جو انسانی ذہن کو روحانی انداز
سے ہم آہنگ کرتا ہے۔ یہ ایک شہرِ شرافت ہے اور اہلِ
علم و فن کے لئے ایک حسین خلدِ بریں ہے۔ یہ عشق و محبت کا
ایک چمن ہے۔ جو مسکرا رہا ہے اور جہاں سبز و شادابی لہرا رہی
ہے اور فکر و فن کا گلاب ہنس رہا ہے۔ بریلی ایک ایسا شہر ہے
جو اربابِ علم و دانش کا مرکز ہے، روحانیت کی پناہ گاہ ہے۔
اردو ادب کی بھی اس شہر نے خدمت کی۔ اور اسے ترقی دینے
میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ لکھنؤ، دلی کو اگرچہ اس معاملہ میں
مرکزیت حاصل ہے۔ شعراء انہی دونوں شہروں میں زیادہ
رہے۔ اور اردو شاعری کو پروان چڑھایا۔ لیکن اس شہر
(بریلی) میں بھی ایک سے ایک بڑے شاعر ہوئے۔ اور بزم

شعر و سخن کو سجایا ہے۔ اس کی برہم زلفوں کو سنوارا ہے۔ اس سرزمین پر غزل بھی لکھی گئی ہے۔ اور نظم بھی، قصائد بھی کہے گئے ہیں اور رباعیات و قطعات بھی۔ یہاں رہنے والے شعراء کی ایک لمبی فہرست ہے۔ شعراء کی کثرت کا اندازہ تاریخ روہیل کھنڈ سے لگایا جاسکتا ہے۔ اور لطیف حسین صاحب ادیب کی مختلف کتابوں سے جو شائع ہو چکی ہیں۔ حضرت حسن بریلوی، جگر بریلوی وغیرہ وغیرہ۔ حضرت حسن بریلوی نے اپنے شاگردوں کی ایک جماعت چھوڑی ہے۔ جو شاعری کے میدان کامیاب اور بہت کامیاب ثابت ہوئی ہے اور آج بھی بریلی کی نمائندگی اردو ادب میں موجود ہے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی بہترین اہل قلم اور نقاد ہیں۔ ان کی کتابیں تنقید میں اہمیت رکھتی ہیں غزل اور مطالعہ غزل، اردو تنقید کا ارتقاء دو ایسی کتابیں ہیں جن کی طرف اہل علم و فن رجوع کرتے ہیں اور حوالوں میں ان کتابوں کو پیش کرتے ہیں۔ اس وقت علم و مسلک میں جو اہمیت بریلی کو حاصل ہے کسی شہر کو نہیں ہے۔ آج ہندوستان ہی نہیں بلکہ غیر ممالک میں بھی بریلی کی شہرت ہے۔ حق و صداقت کے مسلک کو "مسلکِ بریلی" کہا جاتا ہے۔ عشق و ایمان اور فلاح و بہبود والے مسلک کو "مسلکِ بریلی" کہا جاتا ہے۔

مسلک بریلی کوئی نیا مسلک نہیں ہے۔ بلکہ یہ وہی مسلک ہے جو صحابہ و تابعین اور تبع تابعین کا تھا۔ یہ راہ اسلاف اور بزرگوں کی راہ ہے۔ ظاہر ہے بریلی کو اہمیت کسی اور وجہ سے حاصل نہیں ہوئی ہے۔ بلکہ صرف اور صرف امام احمد رضا فاضل بریلوی سے حاصل ہے۔ مولانا احمد رضا کا تعلق ایک ایسے خاندان سے تھا جو علم و فن شعور و ادراک میں مشہور زمانہ ہے۔ اس خاندان نے عرصۂ دراز سے قوم و ملت کی خدمت انجام دی ہے اور اسکو سنوارنے میں حتی المقدور کوشش کی ہے۔ اسی خاندان سے مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی کا تعلق تھا۔ مولانا نے اپنے خاندان کی روایت کو برقرار رکھا ہے۔

مولانا حسن بریلوی اور معاشرتی طبقہ

معاشرتی طبقہ کیا ہے؟ اور مولانا حسن کی زندگی پر اس کا کیا اثر پڑا؟ آئیے اس کا گہرائی سے مطالعہ کریں۔ معاشرتی طبقہ میں عام طور پر بچوں کے پڑوسی شامل کئے جاتے ہیں۔ ان کے ساتھ بھی ان کا قریبی تعلق ہوتا ہے اس طبقہ میں شریک سبھی افراد کے رسم و رواج، طرز معاشرت، تہذیب و تمدن کم و بیش ایک سے ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر اقتصادی و معاشی حالات میں فرق ہوتا ہے۔ لیکن مختلف لوگوں سے مل کر ایک معاشرتی طبقہ بن جاتا ہے۔ اس میں ایک دوسرے کے لئے اچھے جذبات اور یگانگت پائی جاتی ہے۔ اس طبقہ میں خاندان کے دیگر افراد کے ساتھ ساتھ بچے بھی شامل ہوتے ہیں۔ ماہرین تعلیمات کے نزدیک اس کی خاص اہمیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ اس پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ تعلیمی اسکولوں اور اداروں کو چاہیئے کہ بچوں کے لئے زیادہ سے زیادہ اس کے مواقع فراہم کریں۔ تاکہ بچے اس طبقہ سے جڑے رہیں۔ معاشرتی طبقہ بچوں کی تعلیم و تربیت اور سیرت سازی میں اہم رول ادا کرتا ہے۔ امریکہ اور دیگر ترقی پذیر ملکوں میں اس پر کافی بل دیا جاتا ہے۔ ماہرین تعلیمات کو اس کا خیال آج پیدا ہوا ہے جب کہ اسلام اپنے ابتدائی دور میں ہی اس کا تصور پیش کر چکا ہے۔ قرآن اور حدیث میں جابجا یہ تاکید آئی ہے۔ کہ اچھے لوگوں کے ساتھ رہو۔ نیکوں کی صحبت اختیار کرو کیونکہ یہ صحبت بچوں کی سیرت و کردار کی تشکیل میں اہم رول ادا کرتی ہے۔ حدیث پاک میں ہے۔

"الصحبۃ مؤثرۃ"

کہ صحبت مؤثر ہوتی ہے۔

صحبت صالح ترا صالح کند ٭ صحبت طالح ترا طالح کند

نیک لوگوں کی صحبت انسان کو نیک بناتی ہے۔ اور بروں کی صحبت انسان کو برا بناتی ہے۔ انسان تو انسان رہا غیر انسان بھی اس صحبت سے متاثر ہوتا ہے۔ ایک کتا اصحاب کہف کی صحبت میں رہا تو اس کے عادات و اطوار اور سیرت و کردار آدمیوں جیسے ہو گئے۔ یقیناً اسلام کا نظریہ معاشرتی طبقہ کی تشکیل کرنا ہے۔ اور اس کی اثر پذیری کا قائل ہے۔ یہ جدید نظریہ جسے امریکہ اور دیگر ترقی پذیر ممالک اس کے علمبردار ہیں۔ اسلام اس نظریہ کو

پیش کر کے اس کے قدیم نظریہ ہونے کی مہر ثبت کر دی ۔ مولانا حسن بریلوی کے معاشرتی طبقہ میں ایسے افراد شریک تھے ۔ جن کے رسم و رواج، طرز معاشرت، تہذیب و تمدن سب میں یکسانیت پائی جاتی تھی۔ علم و شعور اور فن و ادراک کی طرف سب افراد کا رجحان تھا۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی اس معاشرتی طبقہ میں شریک تھے۔ جو نہایت ہی سادہ لوح اور نیک سیرت کے مالک تھے۔ جن کی زندگی کا لمحہ لمحہ صاف اور شفاف تھا۔ اس طبقہ کے تمام افراد ایک دوسرے کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے۔ اخلاق و مروت، خلوص و پیار، عشق و وفا تسلیم و رضا، امداد باہمی اور نیک سلوکی سے ملنا، خندہ پیشانی سے بات چیت کرنا یہ تمام چیزیں رفتہ رفتہ مولانا حسن بریلوی کی شخصیت سے قریب ہو رہی تھیں۔ بلکہ جزو شخصیت بنتی جا رہی تھیں۔ مولانا حسن بریلوی نے اس معاشرتی طبقہ میں خاص کر دو چیزوں کو اپنانے کی کوشش کی۔ یہ دونوں اس قدر پرکشش اور جاذب نظر ہیں کہ اس کی تابناکیوں کے روبرو آنکھیں خیرہ ہو جائیں گی۔

۱۔ حضرت مولانا حسن بریلوی نے اپنے اس معاشرتی طبقہ میں یہ ملاحظہ فرمایا کہ ایک طرف تو قلم و دوات، کتب و رسائل اور دوسری طرف فتاوی تحریر کئے جاتے ہیں، مسائل کی چھان بین ہو رہی ہیں۔ بحث و تمحیص کا سلسلہ جاری ہے غور و فکر کی جا رہی ہیں۔

۲۔ اور دوسری بات یہ ملاحظہ فرمائی کہ اس طبقہ کے ہر فرد کی زندگی دنیاوی آلائشوں سے پاک، تصنع و تکلف سے منزہ ہے۔ اور نماز و روزہ، اوراد و وظائف، اذکار و افکار سے معمور ہے۔ خلوص و بے لوثی کی ایسی سرگرمی ہے۔ ایسا زور و شور ہے کہ دنیا و مافیہا سے کوئی غرض نہیں بلکہ ان کی لو لگی ہے۔ تو صرف اس ذات کی طرف جو اصل الاصول اور منبع کل ہے۔ اور جو یکتا و بے نظیر ہے۔ اس معاشرتی طبقہ سے مولانا حسن بریلوی کو دوہرا فائدہ ہوا ذہنی نشو و نما میں اس طبقہ سے کافی مدد ملی۔ اور عقل میں وسعت آئی۔ اور دوسری طرف دل کی دنیا ایمان و ایقان اور عرفان سے مالا مال ہوئی۔ اور ساتھ ہی ساتھ مولانا جذبہ بے لوث سے بھی سرشار ہو رہے تھے۔

مولانا حسن اور معاشی نظام

یہ ایک حقیقت ہے کہ ہر انسان کی زندگی کا رشتہ معاش سے وابستہ ہے۔ روٹی کپڑا اور مکان انسان کی ضروریات زندگی میں سے ہیں۔ کیونکہ یہ دنیا عالم اسباب ہے۔ کوئی کتنا ہی بڑا روحانیت کا امام کیوں نہ ہو۔ غوث و قطب یا ابدال ہو انہیں مسئلہ معاش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ مذہب اسلام ایک مکمل نظام زندگی ہے، ضابطہ حیات ہے۔ وہ بھی معاشی نظام کا خاکہ پیش کرتا ہے۔ صدقہ و خیرات اور زکوۃ کا تصور اسی معاشی نظام کے مختلف رنگ و روپ ہیں۔ تاریخ اسلام اس بات پر گواہ ہے کہ بانی اسلام اور دیگر صحابہ کرام تجارت کرتے تھے اور اسی کے ذریعہ وہ اپنی معاشی نظام کو سدھارتے تھے۔ اصحاب صفہ کے واقعات مشہور ہیں کہ وہ جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے تھے اور اپنی ضروریات اس سے پوری کرتے تھے۔ بچہ جب رفتہ رفتہ ہوش و خرد کی طرف بڑھتا ہے۔ تو اس کی نظر گھر کی معاشی نظام اور اقتصادی حالات پر بھی پڑتی ہے اور اس سے بھی وہ اپنی شخصیت کی تشکیل میں مدد لیتا ہے۔ فرض کر لیجئے کہ کسی کے گھر کا معاشی نظام بگڑا ہوا ہے۔ ضرورت کی چیزیں فراہم نہیں ہو پاتی ہیں وقت پر کھانا لباس یا دیگر چیزیں فراہم نہیں ہوتی ہیں۔ اس سے بچے احساس کمتری کے شکار ہو جاتے ہیں اور ذہن کی یکسوئی بھی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ اسی طرح اگر والدین کا ذریعہ معاش کوئی ناجائز پیشہ ہے۔ جیسے جوا، قمار بازی، یا چوری ڈکیتی تو ظاہر ہے بچے اس سے اثر قبول کریں گے۔ اور آگے چل کر اسی رنگ میں رنگ جائیں گے۔ برخلاف اس بچے کے جن کا ذریعہ معاش جائز اور شرعی چیز ہے وغیرہ ہیں۔ ایسے بچے ہی تعلیم و تربیت کے میدان میں پورے اترتے ہیں۔ اور ہر خوبی سے اپنی زندگی کو مزین کرنے کے

کوشش کرتے ہیں۔

مولانا حسن بریلوی نے جس اعلیٰ خاندان میں تربیت پائی۔ جس باوقار گھر کے در و دیوار کے سایہ تلے پرورش پائی اس کا کیا معاشی نظام تھا؟ روزی روٹی اور مکان و لباس کی ضرورت اس گھر میں کس طرح پوری ہوتی تھی۔؟ مولانا رضا علی خاں کی کافی جائیداد تھی۔ اور آج بھی ہے۔ زمین سے اس قدر پیداوار ہوتی تھی کہ اسی سے ساری ضرورت پوری ہوتی تھی۔ اس معاشی نظام کا اثر مولانا حسن بریلوی اور ان کے اقربا پر یہ ہوا کہ وہ سبھی لوگ صبر و قناعت کی دولتِ لازوال سے مالا مال تھے۔ حرص و آرزو اور طمع و لالچ سے انہیں کوئی لگاؤ نہ تھا۔ بلکہ مزاج میں ایک قسم کی شانِ استغنا۔ پائی جاتی تھی۔ یہی سبب ہے کہ اس خاندان میں کرم نوازی و سخاوت کی روایت نسلاً بعد نسل چلی آتی ہے۔ فقراء و مساکین کی حاجت روائی اس خاندان کا طرۂ امتیاز تھا۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی اپنے والد گرامی حضرت علامہ نقی علی خاں کے بارے میں تحریر فرماتے ہیں۔

"عقل معاش و معاد کا مروجہ کمال دونوں کا اجتماع بہت کم سنا یہاں آنکھوں دیکھا علاوہ بریں، سخاوت و شجاعت و علوئے ہمت، کرم و مروت صدقات خفیہ و میراث جلیہ، بلندیٔ اقبال، دبدبہ و جلال، موالات فقراء امر دینی میں عدم مبالات، اغنیاء و حکام سے عزلت اور رزق موروث پر قناعت وغیرہ ذالک فضائل جلیہ و خصائل جمیلہ کا حال وہی کچھ جانتا ہے جس نے اس جناب کی برکت صحبت سے مشرف پایا۔"

(سرور القلوب)

اس تبصرے سے علامہ نقی علی خاں کی مندرجہ ذیل خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

۱۔ شجاعت و بہادری۔ ۲۔ سخاوت اور عزم کی پختگی۔
۳۔ فقراء کی خیر خواہی۔ ۴۔ سرمایہ داروں سے احتراز۔
۵۔ رزق موروث پر قناعت۔

مولانا حسن بریلوی نے اس معاشی نظام سے کیا اثر لیا؟ یہ ایک واضح سی بات ہے۔ مولانا نے جب ہوش سنبھالا تو گھر کے معاشی نظام کو درست پایا۔ اس سے وہ احساس کمتری کا شکار نہ ہوئے۔ بلکہ اپنے اندر عزم و حوصلہ کی پختگی کو محسوس کیا اور اتنی امنگوں سے زندگی بسر کرنے کی ٹھان لی۔ گویا وہ مستقبل سے مایوس نہ تھے۔ بلکہ مستقبل کو تابناک بنانے میں مصروف عمل رہے۔ صبر و قناعت کا دامن ہاتھ سے نہ گیا بلکہ حرص اور نا امیدی سے دور دور رہے۔ پھر یہ کہ اس معاشی نظام سے مولانا کے اندر خود اعتمادی کا جذبہ بیدار ہوا۔ اور نظام زندگی کو اعتدال سے گزارنے کی قوت حاصل ہوگئی۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے آگے چل کر گھر کے نظام کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اور مدرسہ منظر اسلام کے وہ پہلے مہتمم ہوئے۔ مہتمم ہونے کی روایت حضرت مولانا شوکت علی خاں صاحب قبلہ نے جو کہ حضرت جیلانی میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے داماد ہیں اس ناچیز سے بیان فرمائی۔ ہم ان کے بے حد شکر گزار ہیں۔ بہر صورت اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے۔ کہ مولانا نے اس معاشی نظام میں بہت کچھ سیکھا ہے۔

مولانا حسن اور تہذیبی نظام

تہذیب کیا ہے۔؟ اور اس کے دائرے کس قدر وسیع ہیں۔؟ یہ دونوں سوال بہت ہی اہم ہیں۔ جو غور و فکر اور تعمق نظر کی دعوت دے رہے ہیں۔ تہذیب سے ہر وہ اعمال و افعال مراد لئے جاتے ہیں جو انسان کو مرتبۂ انسانیت پر فائز کرتے ہیں۔ اور جو سماجی، معاشرتی اور اقتصادی حالات کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد دیتے ہیں۔ علم و ادب، فکر و فن، رسم و رواج، اخلاق و مروت، عشق و محبت، عادات و اطوار، رہن سہن اور بول چال یہ سب کے سب تہذیب کے امور لازمہ ہیں۔ جو انسان کو شرافت اور انسانیت سے قریب تر کرتے ہیں۔ جس انسان میں یہ تمام خوبیاں پائی جائیں گی وہ مہذب انسان کہلائے گا۔ جہاں تک تہذیب کے دائرے کی بات ہے وہ بہت زیادہ وسیع ہیں۔ اس کی وسعت کا اندازہ صرف اس بات

سے لگایا جاسکتا ہے۔ ہندوستان کے پہلے وزیر اعظم پنڈت جواہر لال نہرو نے ۱۹۵۰ء میں کسی ایک تقریب میں تہذیب کے دائرے متعین کرتے ہوئے چند سوالات کرتے ہیں اور پھر خود ہی اس کا جواب اس طرح دیتے ہیں کہ۔

کیا تہذیب سے مراد انسان کی ذہنی اخلاقی اور روحانی ترقی ہے۔؟ بے شک تہذیب کے کاموں میں سے یہ بھی ایک کام ہے۔!

کیا تہذیب اس جانچ کا بھی ایک پیمانہ ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان سے کیا برتاؤ کرتا ہے۔؟

یقیناً اچھا برتاؤ کرنا بھی تہذیب کا ایک مقصد ہے۔!

کیا اس کے معنی یہ ہیں ایک انسان دوسرے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرے۔؟

ہاں یقیناً اس کا یہ بھی مقصد ہے۔!

(نشانِ منزل۔ پروفیسر جگن ناتھ آزاد)

مولانا حسن بریلوی نے جس تہذیبی ادارہ میں قدم رکھا۔ اس میں تہذیب کے تمام دائرے پائے جاتے تھے۔ ذہنی اخلاقی اور روحانی ترقی بام عروج پر تھی۔ مولانا حسن بریلوی نے جن بزرگوں سے تہذیب سیکھی۔ ان کے اسمائے گرامی مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ حضرت علامہ نقی علی خاں۔

۲۔ امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی۔

اب رہی امام احمد رضا فاضل بریلوی کی بات۔ ان کے بارے میں جناب ظہور افر صاحب رضوی بریلوی نے اپنی کتاب میں یہ واضح کیا ہے کہ وہ کیسی جامع الصفات اور جامع العلوم شخصیت تھی۔ لکھتے ہیں۔

"اعلیٰ حضرت ایک عظیم مفتی تھے، عظیم محدث تھے، عظیم مقرر تھے، عظیم مجدد تھے، عظیم مصنف تھے عظیم مترجم قرآن تھے، عظیم شاعر تھے، عظیم محقق تھے۔ عظیم ریاضی داں تھے، عظیم سائنس داں تھے، عظیم ماہر علم ہیئت تھے، عظیم ماہر علم معاشیات تھے۔ وغیرہ وغیرہ۔"

(ALAHAZRAT AT A CLANCE)

مولانا حسن بریلوی نے امام احمد رضا بریلوی کی صحبت میں تہذیب کے تمام شعبوں میں کمال حاصل کیا ہے۔ اور ذہنی، اخلاقی اور روحانی سفر طے کیا ہے۔ اور ان سے بہت کچھ حاصل کیا ہے۔ علم و فن، شعور و ادراک اور زہد و اتقاء میں وہ کمال حاصل کیا ہے کہ ہم ان کے ہر ایک کا بھی کما حقہ پتہ نہیں لگا سکتے ہیں۔ علوم ظاہری اور علوم باطنی دونوں میں مولانا حسن کو دخل تھا بلکہ وہ ماہر علوم و فنون تھے۔ اور وقت کے بہترین ناصح تھے۔ اس طرح مولانا کی شخصیت رفتہ رفتہ ابریساں سے ورثمین کے روپ اختیار کرنے لگی۔ ان کے اخلاق و کردار میں ایسی کشش اور جاذبیت تھی کہ لوگ ان سے فطری طور پر متاثر ہوتے تھے۔ اپنوں کے تئے ان کا دل ریشم و پرنیاں سے زیادہ نرم و نازک تھا۔ اور ان کی راہوں میں آنکھوں کو بچھاتے تھے۔

مولانا حسن اور مذہبی نظام

مولانا حسن بریلوی کا تعلق جس خاندان سے تھا۔ پہلے پہل تو اس خاندان کے افراد بڑے بڑے عہدوں اور حکومت کی وزارتوں پر فائز رہے۔ لیکن اس کے بعد مذہبی رنگ و بو میں اس طرح رچ بس گئے کہ دنیا داری کو ترک کرکے گوشہ نشین ہوگئے اور علم و دیانت ان کی فطرت بن گئی۔ حضرت مولانا اعظم خاں وہ پہلے فرد ہیں جنہوں نے راہ فقر و صواب اختیار کی اور امور سلطنت سے سبک دوشی اختیار کی۔ اس کے بعد یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ کہ اس خاندان کا ہر ایک فرد فقیری کی راہ پر گامزن ہے۔ حضرت علامہ نقی علی خاں کی زندگی کا لمحہ لمحہ اسلام و شریعت کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا۔ ان کا جو بھی قدم اٹھتا تھا راہ خدا میں اٹھتا تھا۔ ان کے دل میں معرفت کا نور تھا۔ عشق و محبت کی کشش تھی۔ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زندگی کا مطالعہ فرمایئے تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ان کی زندگی سیرت رسول کا پورے طور پر نمونہ تھی۔ ان کا ہر عمل اور ہر فعل اسلام

کے ماحول میں انجام پاتا تھا۔ دل میں معرفت خداوندی کی جھلک ملتی ہے۔ اسلام وسنت کی چاندنی ان کی حیات کے گوشے گوشے میں بکھری ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ مولانا حسن بریلوی نے بھی اس مذہبی نظام سے پورا پورا فائدہ حاصل کرنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو خلوص وپیکر میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اسی مذہبی نظام کا نتیجہ ہے کہ ان کا قلم کبھی غلط راہ پر نہیں چلا ہے۔ بڑے بڑے شاعروں نے اپنی شاعری میں لغزشیں کی ہیں۔ مذہب کے خلاف راہوں پر گامزن ہوگئے ہیں لیکن ان شاعروں میں مولانا حسن کی واحد شاعری ہے۔ جس میں مذہب کے خلاف کوئی بات آپ کو محسوس نہ ہوگی۔ کیونکہ ان کی زندگی مذہبی نظام کے زیر سایہ گزری ہے۔ اور اس مذہبی نظام سے مولانا حسن بریلوی نے استفادہ کیا ہے۔ اور اس سے گہرے اثرات قبول کئے ہیں۔ یہ اثرات ان کی شخصیت میں اس طرح پیوست ہوگئی تھی کہ ان کا کوئی عمل کوئی کردار یا کوئی قول اس سے الگ نظر نہیں آتا ہے۔

اس تفصیلی جائزے سے آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ مولانا حسن بریلوی کی تعلیم وتربیت کس انداز سے ہوئی اور ان کی شخصیت کے ارتقاء میں کتنے مراحل پیش آئے اور کن بزرگوں نے انھیں زیور علم سے آراستہ کیا۔ ان کے استادوں میں خاص طور پر حضرت علامہ نقی علیخاں اور امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی ہیں۔ جن کو یہ حضرات علم وفن سے نوازیں ان کی صلاحیت کا اندازہ کون لگا سکتا ہے۔ مولانا حسن بریلوی اب پوری اور مکمل شخصیت کے مالک ہیں۔ ان کی شخصیت میں کمالات وخصوصیات تہ بہ تہ ہیں۔ ان کی شخصیت میں علم وفن کی ساری رعنائیاں ہیں، عشق ومحبت کی ساری بہاریں ہیں۔ اور فکر وشعور کی لطافتیں اور نزاکتیں پائی جاتی ہیں۔ ان کی شخصیت گلاب کی خوشبو سے کم نہیں ہے کہ ان کی شخصیت کو کسی پردے میں چھپا دی جائے۔ اسے نکھرنا ہے اور ایک دن وہ نکھر کر رہے گی اسے پھیلنا ہے کسی نہ کسی دن پھیل کر رہے گی۔ انشاءاللہ

مولانا حسن اور جملہ علوم وفنون

مولانا حسن بریلوی کے تمام سوانح نگاروں نے اس بات کا اعتراف کیا ہے کہ مولانا موصوف تمام علوم وفنون میں مہارت رکھتے تھے۔ قرآن وحدیث، فقہ وتفسیر، فلسفہ وتاریخ، منطق وحکمت اور اسماء الرجال سے پورے طور پر واقف تھے۔ اور جملہ علوم کی لطافتوں، رعنائیوں اور نزاکتوں سے واقف تھے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ وقت اور اس کے بدلتے ہوئے حالات کے نباض تھے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی جو پچاس علوم وفنون پر مہارت رکھتے تھے۔ وہ مولانا حسن بریلوی کی تقریر وتحریر پر اعتماد کلی رکھتے تھے۔ ایک موقعہ پر امام احمد رضا فاضل بریلوی نے لوگوں کو ہدایت کی۔ کہ وہ مجلس شہادت میں حسن میاں کی کتاب "آئینہ قیامت" پڑھا کریں۔ کیونکہ شہادت کے موضوع پر بہت سی کتابیں لکھی گئیں ہیں۔ جن میں روایات و واقعات کے بیان میں رطب ویابس سے کام لیا گیا ہے۔ کوئی کتاب ایسی نہیں ہے جس میں فرضی اور موضوع روایت نہ ہو۔ مگر آئینہ قیامت ایک ایسی کتاب ہے۔ جس میں روایات و واقعات وہی بیان کئے گئے ہیں جو پورے طور پر صحیح اور درست ہیں۔ پھر یہ کتاب تمام افراط وتفریط سے پاک ہے، منزہ ہے۔ اسی لئے تو امام احمد رضا نے اس کتاب کو پڑھنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حسن بریلوی کی معلومات میں کس قدر وسعت پائی جاتی ہے۔؟ ان کی علمی، فکری قابلیت کیا تھی۔؟ اس کا اندازہ کسی قدر گزشتہ اوراق سے ہوا ہوگا۔ تاہم ان کے علم وفن، فکر ونظر، شعور وادراک کا تحقیقی جائزہ کے لئے ضروری ہے کہ چند اصولوں کی اولاً وضاحت کی جائے وہ اصول مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ وہ کس کے شاگرد تھے۔؟
۲۔ انھوں نے کیا علمی خدمات انجام دی۔؟
۳۔ ان کی تصنیفات کا رنگ کیا ہے۔؟

اصل اول کی اہمیت اس لئے ہے کہ معلم اس کا تعلق خواہ کسی بھی فن اور کسی بھی علم سے ہو۔ تعلیمی امور کے

انجام دینے کے دوران وہ انسان کی تربیت میں مصروف ہوتا ہے۔ بایں وجہ معلم کی شخصیت اور ان کے کردار و عمل میں جاذبیت اور کشش کا ہونا ضروری ہے۔ تاکہ طالب علم کی زندگی اور ان کے ذہن و دماغ پر وہ اثر انداز ہو سکے معلم کی اثر اندازی کا تعلق کسی ایک شعبہ تک محدود نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ طالب علموں کی حیات کے ہر شعبے سے اس کا ربط اور تعلق رہتا ہے۔ مولانا حسن بریلوی نے علوم وفنون کی تکمیل حضرت علامہ نقی علی خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ اور امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے زیر سایہ کی۔ علم و فن کی دنیا میں جب بھی ان دونوں باپ اور بیٹے کا نام لیا جاتا ہے تو ذہن میں ایسی دو شخصیتوں کا تصور ابھرتا ہے۔ جن میں علم و فن، فکر و نظر، شعور و ادراک، فقہ و تدبر اور تبحر علمی پائی جاتی ہے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی کی شخصیت ایسی تھی جس کی ہر تہہ میں علم و فن کی رنگا رنگی، عشق و محبت کی کشش پائی جاتی ہے۔ وہ ایسے امام تھے کہ جب گویا ہوتے تو ان کی زبان اور جب لکھتے تھے تو ان کے قلم سے تحقیق و تدقیق کے گلاب جھڑتے تھے اور علم و فن کے موتی بکھرتا تھا۔ انہوں نے جس فن کو مس کیا۔ اسے انتہا تک پہنچا دیا۔ اور اس کے تمام امکانی پہلوؤں پر سیر حاصل بحث فرمائی۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک علم و دانش اور ارباب فکر و نظر انھیں "امام" کے نام سے یاد کرتے ہیں لفظ "امام" سے جو مرکزیت اور ہمہ گیری کا مفہوم متبادر ہوتا ہے۔ یقیناً اس کا مصداق امام احمد رضا کی شخصیت ہی ہے۔ بلکہ اس سے بھی ماوراء حیثیت پائی جاتی ہے۔ مولانا حسن بریلوی ان کے زیر تربیت رہ کر کیا حاصل کیا۔؟ کن علوم سے ان کی ذات مرصّع ہوئی۔ اس کا اندازہ بخوبی لگایا جا سکتا ہے۔ اسی لئے میں یہ سمجھتا ہوں کہ مولانا موصوف نے جملہ علوم و فنون میں عبور حاصل کیا۔ عربی فارسی اور اردو میں انھیں کمال حاصل تھا۔ تحریر و تقریر دونوں سے ان کا تعلق تھا۔ اظہار مافی الضمیر میں انھیں کسی قسم کی دقت محسوس نہ ہوتی تھی۔ بلکہ وہ اپنے خیالات و جذبات کی ادائیگی کے لئے لفظوں کے روپ کو تلاش نہیں کرتے تھے۔ لفظی روپ خود ان کا متلاشی تھا۔ امام احمد رضا سے وہ کس حد تک متاثر تھے۔ اس کا اظہار ان کے اس شعر سے ہوتا ہے۔

بھلا ہے حسن کا جناب رضا سے
بھلا ہو الٰہی جناب رضا کا

اس شعر کو پڑھئے۔ اس سے صاف عیاں ہوتا ہے مولانا حسن بریلوی کا بھلا ہوا ہے۔ امام احمد رضا فاضل بریلوی کی ذات سے اب سوال ہوتا ہے کہ یہ بھلا کس بات میں ہوا۔؟ مال و زر میں۔؟ دولت و ثروت میں؟ نام و نمود میں۔؟ عزت و شہرت میں۔؟ ظاہر ہے ان میں سے کسی میں مولانا کا بھلا نہیں ہوا ہے۔ کیوں کہ ان کی شخصیت نام و نمود اور ظاہری ٹیپ ٹاپ سے بے نیاز تھی۔؟ بلکہ ان کا بھلا ہوا ہے صرف اور صرف علم و فن میں۔ شعور و ادراک میں۔

اب رہی یہ بات کہ مولانا حسن بریلوی نے کیا خدمات انجام دی۔! اس سلسلے میں گزشتہ اوراق میں یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مدرسہ منظر اسلام کے اول ناظم اور بانی مولانا حسن بریلوی تھے۔ انہوں نے اپنے حسن انتظام سے مدرسہ کو ترقی دی اور علم و فن کی اشاعت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ ان کی یہ ذمہ داری صرف مدرسہ ہی تک محدود نہ تھی بلکہ گھر کی ذمہ داری بھی مولانا حسن کے سر تھی۔ اور امام احمد رضا فاضل بریلوی اس ذمہ داری سے بے نیاز تھے۔ بلکہ وہ اپنا پورا وقت تصنیف و تالیف میں صرف کرتے تھے۔ اگر یہ ذمہ داری مولانا حسن نہ سنبھالتے تو شاید امام احمد رضا کی اتنی مقدار میں تصنیفات ہمیں میسر نہ ہوتی۔ جو آج ہمیں دستیاب ہیں۔ اس طرح سے مولانا حسن بریلوی کا بھی قوم مسلم پر بڑا احسان ہے۔ ان تمام ذمہ داریوں کے باوجود مولانا حسن تصنیف و تالیف کا کام انجام دیتے تھے۔ ان کی تصنیفات مندرجہ ذیل ہیں۔

۱۔ تزک مرتضوی
۲۔ نگارستان لطافت
۳۔ آئینہ قیامت
۴۔ وسائل بخشش
۵۔ صمصام حسن
۶۔ ندوہ کا نتیجہ

۷۔ بے موقع فریاد ۸۔ دین حسن

ان مندرجہ بالا کتابوں کو پڑھیے۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ مولانا کس قابلیت کے مالک تھے اور ان کی ذات میں کیا کیا خوبیاں پائی جاتی تھیں۔ حسن بریلوی صاحب اگرچہ مولانا تھے لیکن وہ حالات اور زمانے کے تقاضوں کو خوب سمجھتے تھے۔ وقت کے بہترین نبض شناس تھے وہ حد درجہ زود حس اور ان کی فطرت حساس و دراک تھی۔ وقت کی جیسی ضرورت ہوتی تھی اس کی مناسبت سے ان کا قلم چلتا تھا۔ وہ بہترین نقاد بھی تھے۔ ان کا تنقیدی شعور پختہ تھا۔ اور کمال کی حد تک پہونچا ہوا تھا۔ اپنی بات کہنے میں وہ کبھی بھی جھجک محسوس نہ کرتے تھے۔ حق بات کا وہ برملا اعتراف کرتے تھے۔ اور تلواروں کے سایہ میں بھی حق کا اعلان کرتے تھے۔ ندوہ کا نتیجہ اور بے موقع فریاد میں ان کا یہ کمال جھلکتا ہے۔ ان کی کتابوں کا رنگ سخن نہایت ہی نکھرا اور ستھرا ہوتا ہے۔ وہ الفاظ ہلکے پھلکے اور سادہ استعمال کرتے تھے۔ جن میں سادگی اور متانت بلا کی پائی جاتی ہے۔ اور اپنی بات قرآن وحدیث کی روشنی میں کہتے تھے۔ بہرصورت انھوں نے جو بھی نثر لکھی۔ بے نظیر لکھی۔

جو لکھی نثر بے نظیر لکھی
جو کہا شعر لاجواب کہا

مولانا حسن بحیثیت شاعر

مولانا حسن بریلوی قادر الکلام اور بڑے شاعر تھے۔ ان کی شاعرانہ عظمت کا اہل علم و دانش نے اعتراف کیا ہے۔ اور انھیں ان کے اس وصف کی بنیاد پر مبارکباد پیش کیا ہے۔ مولانا کو شاعری سے فطری لگاؤ تھا۔ اور ان کی طبیعت بھی موزوں تھی۔ اشعار نظم کرنے کی صلاحیت انھیں بچپن ہی سے حاصل تھی۔ مولانا حالی مقدمہ شعر وشاعری میں لکھتے ہیں کہ شاعر بننے کے لئے صرف موزوں طبیع ہونا کافی ہے۔" لہٰذا اس بات میں کوئی شک نہیں ہے کہ مولانا کی ذات میں شاعر بننے کی تمام خوبیاں اور صلاحیتیں پائی جاتی تھیں۔ لیکن کامیاب اور بڑا شاعر بننے کے لئے انھوں نے داغ دہلوی سے استفادہ سخن کیا ہے۔ اردو شاعری میں داغ دہلوی کی جو عظمت واہمیت ہے اس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہے لیکن ان کی اس عظمت کو جاننے کے لئے آئیے اردو شاعری کا تاریخی مطالعہ کرتے ہیں۔ اس مطالعہ کے بغیر ان کی شاعرانہ عظمت کا کماحقہ تعارف نہیں ہوسکتا ہے۔ اردو شاعری کا آغاز اگرچہ دکن میں ہوا لیکن اس کا ارتقا شمالی ہند میں ہوا۔ ولی دکنی کی آمد سے پہلے دہلوی شعراء ریختہ کہتے تھے لیکن تفنن طبع کے لئے کیونکہ اس وقت فارسی شاعری کا عام رواج تھا۔ عوام وخواص دونوں میں فارسی شاعری کا عام مذاق پایا جاتا تھا۔ لیکن جب ولی دکنی کا دیوان دہلی آیا تو شاعروں نے اردو میں شاعری شروع کی۔ اور دھیرے دھیرے اس کا مذاق عام ہونے لگا۔ اور عوام الناس میں اردو شاعری سے دلچسپی اور لگاؤ پایا جانے لگا۔ اس وقت اردو شاعری میں فارسی کے اثرات غالب تھے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اس زمانے میں یہ شاعری دربار سے منسلک تھی۔ اور فارسی ہی درباری زبان تھی۔ میر تقی میر، غالب اور مومن نے اس شاعری کو وسعت دی۔ اور اسے ہندوستانی تہذیب و تمدن سے آشنا کرایا۔ ذوق جو داغ کے استاد تھے۔ انھوں نے اس شاعری کو مزید تقویت بخشی اور اسے نیا آہنگ عطا کیا اور شاعری کی زبان میں سلاست و روانی بخشی۔ داغ نے اس شاعری کو کمال تک پہونچا دیا۔ زبان وبیان سے اسے مالا مال کیا۔ داغ ایسی سلیس اور سادہ زبان میں شاعری کرتے تھے۔ کہ ان کی شاعری لال قلعہ سے نکل کر قصبات ودیہات پہونچ گئی۔ وہ اپنی شاعری میں محاوروں کا بہترین استعمال کرتے تھے۔ انھوں نے بھی زمانے کے کئی ادوار دیکھے ہیں۔ اور مصائب وآلام جھیلے ہیں۔ جن کے نتیجہ میں

انھیں دلی چھوڑنی پڑی۔ اور ملک کے دوسرے علاقوں میں جانا پڑا۔ لیکن اردو شاعری میں ان کا جو مقام ہے اس کو فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ فصیح الملک نواب مرزا داغ دہلوی نواب فخرو کے توسط سے لال قلعہ میں داخل ہوئے۔ شہزادے اور شہزادیوں کی طرح ان کی تعلیم و تربیت ہوئی اور شعر و شاعری میں استاد ذوق کے شاگرد ہوئے۔ اور ان سے اصلاح سخن لیتے رہے اس طرح انھیں شاعری میں ملکہ حاصل ہوا۔ سب سے پہلے مشاعرہ میں انھوں نے ایک طرحی غزل کہی۔ جس کا ایک شعر یہ ہے۔

ہوئے مغرور وہ جب آہ میری بے اثر دیکھی
کسی کا اس طرح یارب نہ دنیا سے بھرم نکلے

جس مشاعرہ میں یہ غزل پڑھی گئی اس میں بڑے بڑے اور قدآور شعرار موجود تھے۔ غالب، ذوق اور بہادر شاہ ظفر جیسی اہم شخصیتوں نے اس مشاعرہ کو چار چاند لگائے تھے۔ داغ کے اس شعر پر بہادر شاہ ظفر اچھل پڑے اور انھیں اپنے سینے سے چپٹا لیا۔ اس طرح بادشاہ وقت نے ان کی حوصلہ افزائی کی۔ اور ان کے ذوق شاعری کو آگے بڑھانے کی کوشش کی۔ داغ اپنی اس پذیرائی کو دیکھ کر خوش ہوئے۔ اور شاعری میں مزید کوشش کرنے لگے۔ داغ زبان کے بادشاہ تھے۔ وہ زبان جو لال قلعہ میں بولی جاتی تھی۔ اور شہزادے شہزادیاں آپس میں بات چیت کرتے تھے ٹکسالی زبان سے موسوم تھی۔ داغ اس زبان کو پورے ملک میں پھیلانا چاہتے تھے۔ خدا نے انھیں اس طرح قادر الکلام شاعر بنایا تھا کہ وہ اپنے اشعار میں محاوروں اور ضرب الامثال کا کثرت سے استعمال کرتے تھے اور اس انداز سے کرتے تھے کہ شاعری میں سلاست و روانی برقرار رہتی تھی۔ اور زبان پر کسی قسم کی گرانی محسوس نہ ہوتی تھی۔ انھیں اپنی زبان پر ناز تھا۔ اور بڑے فخر سے یہ کہتے تھے کہ ۔ ے

سارے جہاں میں دھوم ہماری زبان کی ہے

دبستان شاعری رامپور

رام پور ہی کی سرزمین میں داغ دہلوی نے دبستان شاعری کی داغ بیل ڈالی ہے۔ داغ کا دبستان شاعری تمام دبستانوں سے الگ ہے۔ اور اس کا رنگ ہر دبستان سے نکھرا ہوا نظر آتا ہے۔ اہل ذوق حضرات اسی دبستانِ داغ سے منسلک ہوئے اور نواب مرزا سے استفادۂ سخن کرنے لگے۔ مولانا حسن بریلوی بھی دیگر لوگوں کے ساتھ داغ کی شاگردی میں آئے اور ان کے دبستان سے خوشہ چینی کرنے لگے۔ مولانا موصوف ان کی خصوصیات شاعری کو اپنے اندر جذب کرنے کی کوشش کرنے لگے وہ نہایت ہی محنت و مشقت اور عرق ریزی سے زبان و بیان کی لطافتوں، نزاکتوں کو اپنی شاعری میں جذب کی وہ اپنی اس کوشش میں کہاں تک کامیاب ہوئے؟ اس کے بارے میں صابر سنبھلی صاحب لکھتے ہیں۔

"جیسا کہ عرض کیا جاچکا ہے کہ مولانا کو فصیح الملک حضرت نواب مرزا داغ دہلوی سے تلمذ تھا۔ اور شاید اردو ادب سے دلچسپی رکھنے والوں کے لئے یہ انکشاف حیرت کا باعث ہو کہ حضرت داغ کے شاگردوں میں کسی نے استاد سے اتنا استفادہ نہیں کیا۔ جتنا مولانا نے کیا۔ وہ ایک مدت تک رام پور میں رہ کر داغ مرحوم سے اکتساب فیض کرتے رہے"

(ادبی تجزیئے)

مولانا حسن جانشین داغ

صابر صاحب نے یہ انکشاف کر کے ایک حقیقت کا اظہار کیا ہے۔ مولانا حسن بریلوی کی شاعری میں داغ کی خصوصیات اور رنگ و آہنگ صاف نظر آتا ہے۔ مولانا حسرت

موہانی نے تو یہاں تک لکھا ہے کہ مولانا کی شاعری میں اور داغ کے کلام میں اس قدر مناسبت ہے کہ دونوں کے کلام میں مشکل سے فرق نظر آتا ہے۔ اس بنا پر اگر مولانا کو جانشین داغ کا خطاب دیا جائے تو یہ ناانصافی نہیں بلکہ انصاف ہوگا۔ ادبی تجزیے کی یہ عبارت پڑھئے اور ان کے منصب کا تعین کیجیے۔

"جب کہ پختگی اور استاد کے رنگ کو
کامیابی سے برتنے کے سبب مولانا کو بجا
طور پر جانشین داغ کہا جا سکتا ہے۔"
(ادبی تجزیے)

صابر صاحب کو مولانا کی شاعری میں دو چیزیں نظر آئیں۔ اول پختگی اور دوم استاد کے رنگ کو کامیابی سے برتنا۔ یہ دونوں وصف جس شاعر کے کلام میں پائے جائیں گے وہ بڑے شاعروں میں ہوگا۔ اور ان کی شاعری بڑی شاعری ہوگی۔ یہ پختگی آسانی سے نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ اس کے لئے کافی محنت و مشقت کرنا پڑتی ہے۔ اور تنقیدی شعور سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس کے بعد ہی شاعری میں پختگی آتی ہے۔ ہر تنقید نگار نے شاعر کو مشورہ دیا کہ وہ الفاظ کا انتخاب محنت سے کریں۔ اور اشعار منظم کرنے کے بعد اس پر نظر ثانی کریں۔ ابن رشیق اس نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

واضح القریض ما قارب النظم
ان کان واضحا مستبینا

جب نظم پوری کر چکو تو اس کی تنقید و تصحیح کرا گرچہ وہ واضح اور ظاہر ہو۔ علامہ ابن خلدون اس نکتہ کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔

"کہ جب اشعار منظم کرنے سے فراغت مل جائے تو خود اپنے اشعار پر ناقدانہ نظر ڈالنی چاہیے۔ اور جب کسی شعر میں کوئی نقص یا سقم دیکھے تو اس کو قلم زد کرنے میں بھی پس و پیش نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ شعر انسانی فکر کی پیداوار ہے۔ اور اس کی طبیعت کی ایجاد اکثر خود بسندی کے دھوکے میں آ کر ایک بھس پھسے شعر کو اچھا سمجھ لیتی ہے۔ لیکن جب وہ دوبارہ غور کرتا ہے تو اپنا عیب اپنے سامنے کھل جاتا ہے۔"
(تنقید کے جدید اصول و نظریات)

ابن رشیق اور ابن خلدون کی عبارتوں سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ شاعری کے لئے تنقیدی شعور کا بیدار ہونا ضروری ہے اور شاعر کو چاہیے شعر موزوں کرنے کے بعد وہ اس پر نظر ثانی کرے۔ غور و فکر سے کام لے۔ اور اس کے نوک و پلک کو درست کرے ان منزلوں سے گزرنے کے بعد ہی اچھی شاعری وجود پا سکتی ہے۔ قریب قریب ہر شاعر کے یہاں اس قسم کا تنقیدی شعور ملتا ہے۔ مولانا حسن بریلوی بھی اس تنقیدی شعور سے نوازے گئے تھے۔ اولاً وہ شعر کہتے تھے۔ ثانیاً اس کی تنقید کرتے تھے۔ اور ثالثاً اس کے نوک پلک میں اگر کوئی خامی پائی جاتی تھی تو اس کی اصلاح فرمایا کرتے تھے۔ الفاظ و محاورات اور تشبیہات و استعارات کی وہ جانچ پڑتال کیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا کی شاعری میں پختگی نظر آتی ہے۔ اب بات یہ کہ مولانا نے اپنے استاد داغ کے رنگ کو کامیابی سے برتا ہے۔ کیسے اور کس طرح۔؟ داغ کی شاعری میں سلاست و روانی اور عام بول چال کے الفا استعمال کئے گئے ہیں ساتھ ہی ساتھ ان کی شاعری میں گہری معنویت پائی جاتی ہے۔ داغ کے ان ہی اوصاف کو مولانا نے اپنی شاعری میں برتا ہے۔ اور کامیابی کے ساتھ برتا ہے۔ استاد کے ان اوصاف کو کوئی بھی شاگرد اسی وقت برت سکتا ہے جب کہ استاد اور شاگرد کے مابین تعلقات نہایت ہی خوشگوار ہو۔ مولانا حسن بریلوی اپنے استاد داغ دہلوی سے کتنے قریب تھے اور کس والہانہ انداز میں استاد انھیں نوازتے تھے اس کا اظہار مولانا اس طرح کرتے ہیں

یاد ہیں رامپور کے جلسے ۔ اون کی شفقت کا حال کیا کہیے
پیارے شاگرد تھا لقب اپنا ۔ کس سے اس پیار کا مزا کہیے
جب استاد کسی کو پیارے شاگرد سے پکارے

تو اس کہنے میں جو لطف و مزا ہے اور اس سے شاگرد کو جو کیف و سرور حاصل ہوتا ہے۔ اس کو الفاظ کے روپ میں بیان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ ان اشعار سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا موصوف پر حضرت داغ دہلوی کس قدر مہربان تھے۔ اسی مہربانی اور شفقت کا نتیجہ ہے کہ مولانا کی شاعری میں وہ خوبیاں نظر آتی ہیں جو اور کسی شاگرد کے کلام میں نہیں ہیں۔ مولانا حسن بریلوی اپنی زیست کے آخری ایام تک اس بات کو دہراتے رہے کہ ہمارے کلام میں جو خوبیاں ہیں جو گلفشانیاں مضامین بلند ہیں۔ یہ سب حضرت استاد کی کرم نوازی کے طفیل میں ہیں۔ اگر ان کی مہربانیاں نہ ہوتیں تو شاید یہ خصوصیات بھی ان کے کلام میں نہ پائی جاتی۔ کس ذوق و شوق سے اس مضمون کو باندھتے ہیں۔ ذرا ملاحظہ فرمایئے

لطف ان سُست مضامین میں کہاں سے آتے
اے حسن گر کرم حضرتِ استاد نہ ہو

اے حسن کیا آتے بندش میں مضامین بلند
تم بھی ان افکار میں ایسی زمین کہنے کو تھے

مولانا کی شاعری کو پڑھیئے اس میں ایسی گلفشانیاں ہیں کہ طبیعت واہ واہ کر اٹھتی ہے۔ اور دل مچل مچل سا جاتا ہے۔ قلب و جگر میں خوشی اور مسرت کی لہر سی اٹھتی ہوئی نظر آتی ہے۔ یہ صرف بقول مولانا حضرتِ استاد کا کرم ہے۔ اور رنگ برنگ کے یہ پھول استاد ہی کے گلزار کے ہیں۔

یہ گلفشانیاں تو نہ ہوتیں کبھی اے حسن
تم نے چنے ہیں پھول گلزار داغ کے

ان بیانات سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ مولانا کی شاعری میں داغ کا رنگ گہرا اور بہت گہرا ہے۔ ان کے وصف کی بنیاد پر صابر صاحب نے مولانا موصوف کو "جانشین داغ" کہنے کا مشورہ دیا ہے۔ لیکن آج تک کسی بھی اہل قلم نے صابر صاحب کے اس مشورہ پر عمل نہیں کیا ہے۔ ان کو جانشین داغ کہنے کی بات تو الگ ہے۔ تاریخ نویسوں نے ان کا تذکرہ بھی صحیح ڈھنگ سے نہیں کیا ہے۔ صرف اس بنیاد پر کہ وہ مولانا تھے۔ اور وہ مذہبی پیشوا کی عظیم حیثیت رکھتے تھے جب کہ وہ صرف مولانا ہی نہیں بلکہ بہت بڑے اور قادر الکلام شاعر بھی تھے۔ شعر و ادب میں ان کا منصب بہت ہی زیادہ بلند و بالا تھا۔ انکی شاعری میں قوس و قزح کی رنگینی و رعنائی پائی جاتی تھی۔ تذکرہ نویسوں نے اس کا تذکرہ نہ لکھ کر کیا انصاف سے کام لیا ہے۔؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ بلکہ انھوں نے بے انصافی کی ہے۔ اور تاریخ کے ساتھ ظلم کو روا رکھا ہے۔ اسی حادثہ سے متاثر ہو کر اہل انصاف کا دل یہ پکار اٹھے گا کہ "آواز دو انصاف کو انصاف کہاں ہے"

مولانا حسن اور دیگر دبستان شاعری

اس بات میں کچھ شک نہیں ہے کہ مولانا حسن بریلوی دبستانِ داغ سے متعلق تھے۔ اور تا عمر اسی دبستان کی اشاعت کرتے رہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اسی دبستان میں گھر کر رہ گئے۔ اور دبستانوں سے مولانا نے اگرچہ براہ راست استفادہ سخن نہ کیا لیکن اس سے متاثر ضرور ہوئے۔ کسی ایک دبستان میں گھر کر رہ جانا اور دوسرے دبستانوں سے متاثر نہ ہونا۔ یہ صورت وہاں پیدا ہوتی ہے جہاں دو دبستانوں کے شاعروں کے درمیان شاعرانہ چشمک ہو۔ جیسا کہ لکھنؤ میں میر حسن اور میر انیس کے شاگردوں میں زبردست شاعرانہ نوک جھونک رہتی تھی۔ اور ہمہ وقت ایک دوسرے کے خلاف صف آرا ہونے کے لئے کمربستہ رہا کرتے تھے۔ مولانا حسن بریلوی اور ان کے استاد داغ دہلوی کی شاعرانہ چشمک کسی سے نہ تھی۔ داغ دہلوی اور حضرت امیر مینائی کے مابین بڑے خوشگوار تعلقات تھے اور داغ نے تو امیر مینائی کی شان میں اشعار بھی کہے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں میں کسی قسم کی شاعرانہ نوک جھونک نہ تھی۔ حالانکہ بعض لوگوں نے اس کی نشاندہی کی ہے۔ لیکن یہ غلط ہے۔ داغ

کے ساتھ رامپور میں حضرت امیر مینائی بھی تھے۔ جو شعر و سخن کی بزم کو سجا رہے تھے۔ ڈاکٹر عبادت بریلوی امیر مینائی کے بارے میں اپنی کتاب "غزل اور مطالعہ غزل صفحہ ۳۹۲ میں لکھتے ہیں۔

رام پور میں داغ کے ساتھ امیر مینائی بھی سے غزل کی روایت کو آگے بڑھانے میں حصہ لیتے ہیں۔ امیر مینائی میں داغ کی سی بات تو نہیں۔ کیونکہ اُن کی شخصیت داغ کی شخصیت سے مختلف ہے۔ اور جو ماحول رامپور آنے سے قبل انھیں ملا وہ داغ کے ماحول سے ذرا بھی مناسبت نہیں رکھتا۔ امیر مینائی نے خاصا عرصہ لکھنوی ماحول میں گزارا اور اس زمانے میں لکھنوی غزل کا جو انداز تھا اس سے اثرات بھی قبول کئے چنانچہ بڑا حصہ ان کی شاعری کا لکھنوی خصوصیات کا حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود وہ پوری طرح لکھنوی رنگ میں نہیں رنگ سکے۔ کیونکہ انھیں تصوف کا ماحول بھی ملا تھا۔ وہ ایک صوفی خاندان کے فرد تھے۔ اس لئے تصوف سے انھیں گہری دلچسپی تھی۔ اسی لئے تصوف کے اثرات بھی ان کی غزلوں میں نظر آتے ہیں۔ تصوف کے توسط سے کہیں کہیں انہوں نے اخلاقی موضوعات پر بھی طبع آزمائی کی ہے۔

مولانا حسن بریلوی اگرچہ داغ کے شاگرد تھے۔ لیکن ان کی طبیعت کی جو افتاد تھی۔ اور مزاج میں سادگی تھی۔ وہ امیر مینائی کے ماحول سے مناسبت رکھتی ہے۔ مولانا بھی ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جہاں تصوف کا رنگ پایا جاتا تھا اسی لئے انھوں نے کہیں کہیں اپنی شاعری میں تصوف کے اثرات قبول کئے اور اخلاقی مضامین پر طبع آزمائی کی اور دنیا کی بوقلمونی سے بیزاری کا اظہار کیا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا حسن بریلوی کی شاعری میں امیر مینائی کے مضامین ہیں۔ ایسا نہیں ہے کہ مولانا حسن بریلوی نے صرف اپنے موجودہ شعراء اور استادانِ فن سے اثرات قبول کئے۔ بلکہ انھوں نے قدیم اساتذۂ سخن کی شاعری اور ان کے دیوان کا مطالعہ کیا ہے۔ اور ان سے بھی اثرات قبول کئے ہیں۔ مولانا کی شاعری میں فصاحت و بلاغت کی جو جھلک ملتی ہے اس سے غالب کے رنگ کا اندازہ ہوتا ہے حالانکہ غالب کی طرح وہ مشکل پسند نہیں تھے۔ اسی طرح انھوں نے عشق و محبت اور حسن کے بیان صداقت و واقعات سے کام لیا ہے۔ جس سے مومن کی شانِ انفرادیت ٹپکتی ہے۔ منشی شریف خاں صاحب صفا مولانا حسن کی شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

فصاحت میں جو ہے ہم رنگِ مومن
نظر آتی ہے غالب کی بلاغت

اور جناب تحمل حسین صاحب نے کہا ہے۔

مضامین ہیں امیر نامور کے
زباں اس میں جناب داغ کی ہے

ان تمام عناصر سے مل کر مولانا کی شاعری کا رنگ چوکھا ہو گیا ہے۔ اور ان کی شاعری نکھر گئی ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی شاعری میں صرف تقلید ہی سے تقلید ہے۔ بلکہ اس میں ان کی انفرادیت کا بھی پتہ ملتا ہے۔ جس کے سبب ان کی شاعری ہر ایک سے الگ نظر آتی ہے۔ اور ان کی شانِ انفرادیت دیکھنے کو ملتی ہے۔

کہنے کو یہ فیض ہیں سب داغ کے
پر طبیعت ہی غضب کی پائی ہے

مولانا حسن اور فن شاعری

شاعری ایک فن ہے جو کئی مرحلوں سے عبور کر کے تخلیق پاتی ہے۔ مولانا حسن بریلوی نے صرف رسمی شاعری نہیں کی ہے بلکہ انہوں نے اسے فن کی حیثیت سے برتا ہے اور اس کے تمام تقاضوں کو پورا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں وہ تمام خصوصیات پائی جاتی ہیں، جو ایک کامیاب اور بہترین شاعری کے لئے ضروری ہیں۔

زبان و بیان کی لطافت و نزاکت، حسن و رعنائی، دلکشی
و بانکپن، شاعری کی شدتِ احساس اور اشعار کی شدتِ
تاثیر جب یکجا ہوتی ہے تو شاعری بنتی ہے اُن عناصر میں
سے اگر ایک عنصر بھی کم ہو گیا تو شاعری اچھی شاعری نہیں
ہوتی ہے۔ بلکہ وہ کھوکھلی شاعری کہلاتی ہے۔ آپ
محسوس کریں گے کہ مولانا کی شاعری میں یہ تمام عناصر شدت
سے پائے جاتے ہیں اور اسی شدت کا نتیجہ ہے کہ ان کی
شاعری خوب سے خوب تر ہوتی چلی گئی ہے اور زمانے
کو اپنی بہار یہ جانفزا دکھلا رہی ہے۔ جس کو ارباب علم و
دانش سراہتے رہے ہیں اور آج بھی سراہ رہے ہیں۔
لیکن ان تمام عناصر کو تلاش کرنے سے قبل ضروری
ہے کہ پہلے ہم شعر کا مطالعہ کریں کہ شعر کیا ہے؟ اور اہلِ
فن نے اس کی کیا تعریف بیان کی ہے۔ اور شعر کا اطلاق
کس کلام پر ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی بتا دینا ضروری ہو گا کہ شعر و
سخن کا مبدا کیا ہے؟ اور اس کی تخلیق کہاں سے ہوئی
ہے۔ اور مختلف مکتبِ فکر سے تعلق رکھنے والوں نے اس
بارے میں کیا کیا نظریہ پیش کیا ہے؟ جب تک ان امور
کی وضاحت نہ کی جائے گی تو بات ادھوری کی ادھوری رہ
جائے گی۔ اور مولانا کی شاعری میں زبان و بیان کی جاذبیت
اور ان کے احساس و جذبہ اور ان کی شاعری کی شدت
تاثیر کی تلاش بے سود ثابت ہو گی۔ یہ بحث ذرا دشوار ہے
جس میں فلسفیانہ گہرائی پائی جاتی ہے۔ اس مطالعہ کے
لئے ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر لیں۔ تاکہ بات آپ
کے ذہن میں اترتی چلی جائے۔

شعر اور نظریات

اس کارخانۂ قدرت میں کوئی چیز بے کار نہیں ہے۔ زمین
کی وسعتوں سے لیکر آسمانوں کی پہنائیوں تک جتنی
بھی اشیاء پائی جاتی ہیں سب کام کی چیزیں ہیں۔ کیونکہ
وہ حکیم مطلق ہے۔ اور تمام دانشوروں، مفکروں کا اس
بات پر اتفاق ہے۔

فعل الحکیم لا یخلو عن الحکمۃ

"کہ حکیم کا کوئی بھی فعل حکمت سے خالی نہیں ہے۔"

شعر و سخن بھی کام کی چیز ہے۔ اور اس سے بڑے بڑے کام
نکلتے رہے ہیں۔ اور آج بھی نکل رہے ہیں۔ شعر و سخن کے
بارے میں یہ کہہ دینا کہ وہ ایک بے کار مشغلہ ہے۔ صرف
ایک حقیقت کو جھٹلانا نہیں ہے بلکہ حکیم علی الاطلاق پر
بے کار شئی کی تخلیق کا الزام لگانا ہے۔ حالی صاحب اس
نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

حکیم علی الاطلاق نے اس ویرانۂ آباد نما یعنی
کارخانۂ دنیا کی رونق اور انتظام کے لئے انسان
کے مختلف گروہوں میں قابلیتیں پیدا کی ہیں تاکہ
سب گروہ اپنے اپنے مزاق اور استعداد کے
موافق جدا جدا کاموں میں مصروف رہیں۔ اور ایک
دوسرے کی کوشش سے سب کی ضرورتیں رفع ہوں
اور کسی کا کام اٹکا نہ رہے۔ اگرچہ ان میں بعض
جماعتوں کے کام ایسے بھی ہیں جو سوسائٹی کے حق
میں چنداں سودمند نہیں معلوم ہوتے۔ مگر چونکہ
قسام ازل سے ان کو یہی حصہ پہونچا ہے۔ اس لئے
وہ اپنی قسمت پر قانع اور اپنی کوششوں میں سرگرم
ہیں۔ جو کام ان کی کوشش سے سرانجام ہوتا ہے
گو تمام عالم کی نظر میں اس کی کچھ رفعت نہ ہو مگر
ان کی نظر میں وہ ویسا ہی ضروری اور ناگزیر ہے
جیسے اور گروہوں کے مفید اور عظیم الشان کام
تمام عالم کی نظر میں ضروری اور ناگزیر ہیں۔ کسان
اپنی کوشش سے عالم کی پرورش کرتا ہے۔ اور
معمار کی کوشش سے لوگ سردی، گرمی، مینہ
اور آندھی کی گزند سے بچتے ہیں اس لئے دونوں
کے کام سب کے نزدیک عزت اور قدر کے
قابل ہیں۔ لیکن ایک بانسری بجانے والا جو کسی
سنسان ٹیکرے پر تن تنہا بیٹھا بانسری کے سے
لے سے اپنا دل بہلاتا ہے اور شاید کبھی سننے

والوں کے دل بھی اپنی طرف کھینچتا ہے۔ گو اس کی ذات سے بنی نوع کو فائدہ کی چنداں توقع نہیں مگر وہ اپنے دلچسپ مشغلہ کو کسان اور معمار کے کام سے کچھ کم ضروری نہیں سمجھتا اور اس خیال سے اپنے دل میں خوش ہے کہ اگر اس کام کو سلسلۂ تمدن میں کچھ دخل نہ ہوتا تو صانع حکیم انسان کی طبیعت میں اس کا مذاق ہرگز پیدا نہ کرتا۔

ہزار رنگ درین کارخانہ درکار است
نگیر نکتہ "نظیری"، ہمہ نکو بستند!

(مقدمہ شعر و شاعری، از الطاف حسین حالی)

الطاف حسین کے مندرجہ بالا تحریروں سے واضح ہوا کہ ایک سنسان صحرا میں تن تنہا بانسری بجانے والا، موسیقی کی لے میں شاعری کرنے والا اپنے آپ کو تہذیب و تمدن سے رشتہ سے منسلک اور جڑا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اور اپنے آپ میں مست ہوتا ہے۔ اور یہ سوچ کر خوش ہوتا ہے کہ میں نے بھی ایک نمایاں کام انجام دیا ہے۔ سائنس کے اس دور میں شعر و سخن کی اہمیت میں اور بھی اضافہ ہو گیا ہے کہ اہل فکر نے اس کے بارے میں اپنے اپنے نظریات کا اظہار کیا ہے۔ اور اس میں نئی جہتوں کی تلاش شروع کر دی ہے۔ مولانا حسن بریلوی جن کا رشتہ ارباب دانش سے جڑا ہوا ہے۔ انھوں نے بزم شعر و سخن کی رونق و بہار میں اضافہ کیا ہے ان کی اس شعوری کوشش کو ناقابل اعتبار تصور نہیں کرنا چاہیے۔ کیونکہ انہوں نے جو شاعری کی ہے۔ کچھ سوچ سمجھ کر ہی کی ہے۔ دیوانہ بھی کچھ سوچ کر ہی دیوانہ بنتا ہے جس کا اسے احساس رہتا ہے۔ اور وہ اپنی اسی دنیا میں مست نظر آتا ہے۔ کلام منظوم کو شعر کہا جاتا ہے۔ ایسا کلام جس میں ترتیب و ربط نہ ہو وہ شعر نہیں بلکہ نثر کہلاتا ہے شعر کی یہ تعریف عروضیوں کے نزدیک ہے لیکن ارباب فکر و نظر کے نزدیک صرف قافیہ پیمائی۔ یا کچھ دار الفاظ کے مجموعہ کا نام شعر نہیں ہے۔ بلکہ اس میں اور بھی خوبیوں اور خصوصیات کا ہونا ضروری ہے۔ جب تک یہ خوبیاں اور خصوصیات اس میں نہ پائی جائیں گی عروضیوں کے نزدیک تو وہ شعر کہلائے گا۔ لیکن اہل فکر و دانش کبھی بھی اس کو شعر کے نام سے موسوم نہ کریں گے۔ بلکہ ان کے نزدیک ایک ایسا کلام بیازی صورت رکھتا ہے جس میں صرف پردے ہی پردے ہوں۔ اس کے پس منظر کوئی محبوب ہستی نہیں ہے

شاعری پر تنقید کرنے والوں میں اولیت کا سہرا افلاطون کے سر ہے۔ افلاطون کو عام طور پر شاعری کا دشمن مانا جاتا ہے حالانکہ وہ خود بھی اعلیٰ شاعر تھا۔ اس میں کوئی دو رائے نہیں ہے کہ وہ شاعری کو ناپسند کرتا تھا۔ لیکن ایسی شاعری کو جو پست ہو۔ اور بد اخلاقی، بدتہذیبی کو فروغ دے۔ مگر وہ شاعری جو اخلاق و کردار کو سدھارے اس کی وہ قدر کرتا تھا ہاں اتنی بات ضرور ہے وہ فلسفہ کو اعلیٰ درجہ دیتا تھا۔ اور شاعری کو اس سے کم ان کے نزدیک شاعری کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ بیانیہ ۲۔ رزمیہ ۳۔ ڈرامائی

افلاطون ایسے شاعر کو عظیم قرار دیتا تھا۔ جو معلم اخلاق ہو۔ گویا اس کے نزدیک شاعری کی بنیاد اخلاق پر ہے
ارسطو کا دور افلاطون کے فوراً بعد شروع ہوتا ہے۔ وہ افلاطون کا شاگرد تھا اور سائنس داں تھا اس لئے اس کا طریق کار سائنٹفک اور تجزیاتی ہے اس سے پہلے شاعری کو اخلاق کی تعلیم کا ذریعہ سمجھا جاتا رہا۔ اور شاعر کی حیثیت محض معلم اخلاق کی تھی جیسا کہ افلاطون کی تعلیمی نظریات سے واضح ہوتا ہے۔ مگر ارسطو نے اپنے استاد کے خلاف آواز بلند کی اور شاعری کے جمالیاتی پہلو پر زور دیا۔ اور اس کو مسرت و انبساط کا ذریعہ بنایا دونوں کے شعری نظریات میں مندرجہ ذیل فرق و امتیاز ہے۔

۱۔ افلاطون کے نزدیک دراصل شاعری میں اخلاق کو اولیت حاصل ہے اور ارسطو کے خیال میں اس کی حیثیت ضمنی اور ثانوی ہے۔

۲۔ افلاطون شاعری کو الہامی مانتا ہے۔ یعنی آدمی اپنے کوشش و اختیار سے شعر نہیں کہتا ہے اور نہ ہی اس میں اس کے شعور کو کوئی دخل ہے۔ بلکہ ایک غیبی قوت ہے

جو اس سے شعر کہلوا رہی ہے۔ مگر ارسطو اس کو تسلیم نہیں کرتا ہے۔ بلکہ وہ شاعری کو انسانی کوشش کا نتیجہ تصور کرتا ہے

۳۔ شاعری کے لئے افلاطون نے وزن کو ضروری قرار دیا ہے۔ لیکن ارسطو شاعری کے لئے وزن کو ضروری نہیں سمجھتا ہے۔

افلاطون اور ارسطو کے شعری نظریات میں اگرچہ تضاد نظر آتا ہے۔ لیکن تعمق نظر سے اگر اس پر غور کیا جائے تو اس میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ بلکہ دونوں کے بیانات میں مطابقت ضرور پائی جاتی ہے افلاطون کی اس رائے سے اختلاف نہیں کیا جا سکتا ہے۔ کہ شاعری ایک الہامی اور وہبی چیز ہے۔ کیونکہ یہ تجربہ اور مشاہدہ کی بات ہے۔ کہ بڑے سے بڑا شاعر ہر وقت شاعری کرنے پر قدرت نہیں رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے لئے مخصوص وقت چاہیے، سنجیدہ اور خوشگوار ماحول چاہیے۔ جس میں ہر طرف سناٹا ہو اور شاعر کے ذہنی خیالات اور ذہنی رویہ کسی ایک مضمون پر مرتکز ہو۔ یہ لمحہ ایسا ہوتا ہے جس میں قدرت کی طرف سے مضامین ذہن میں آتے ہیں اور الفاظ کے روپ میں شاعری ہونے لگتی ہے غوث محمد خاں صاحب شاعر یا فنکار کی اس کیفیت کو اس طرح بیان کرتے ہیں۔

فنون لطیفہ کی تخلیق میں ایک ایسا ہی عمل ہے جو انسان کی تنہائی کی کیفیت میں اس سے بڑے بڑے کارنامے کراتا ہے۔ تنہائی کی کیفیت اس لئے ضروری ہے کہ صرف اسی کیفیت میں ہی فنکار اپنے کو اپنی وجود کی گرفت سے آزاد کرا کے ایک ایسی ہی بے خودی میں پہونچ جاتا ہے۔ جہاں ہوائیں سرگوشیاں کرتی ہیں۔ آسمان پر تیرتے ہوئے بادل اس کو ایک نغمہ سناتے ہیں فضائیں اس سے ہمکلام ہوتی ہیں۔ ایسے عالم میں وہ اپنے ایک آزاد پنچھی کی طرح محسوس کرتا ہے۔ ہر مادی اور دنیاوی تفکر سے میری وجود کے بوجھ سے آزاد اور شب و روز کے آلام سے مبرا۔ اسی کیفیت کو انگریزی میں TRAMS CENDENCE کہتے ہیں۔ جس کی طرف کروچے اور دوسرے مفکرین نے اشارہ کیا ہے۔ (ہماری زبان ۸ رجون ۱۹۹۰ء ش ۲۲۔ ج ۴۹)

اس عالم تنہائی اور بے خودی میں جو شاعری تخلیق پاتی ہے اس کے الہامی ہونے سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے۔ سیماب اکبرآبادی جو ایک معروف شاعر ہیں وہ شاعری کے الہامی ہونے کے بارے میں کہتے ہیں۔

جب سیماب اٹھتے ہیں کبھی الہام کے بادل
برس جاتے ہیں کچھ نغمے مرے قلب غزل خواں پر

غالب اپنے نظریہ کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

آتے ہیں غیب سے یہ مضامین خیال میں
غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے

اردو کے قدیم شعراء میں سے سب سے پہلے وجہی نے اپنی شاعری کے بارے میں اس طرح اظہار خیال کیا ہے۔

ہوا جیو شعر بولوں بولنے
خزینے لگیا غیب کے کھولنے

ان تمام تجربات و مشاہدات سے ثابت ہوا کہ شاعری اسرار غیب سے ہے کہ شاعر کے قلب احساس پر جب تک فیض و رحمت کی بارش نہ ہو تو شاعری نہیں ہو سکتی ہے۔

اور ارسطو نے یہ جو کہا کہ شاعری انسانی کوشش کا نتیجہ ہے اس کو بھی غلط نہیں کہا جا سکتا ہے کیونکہ شاعری میں تخلیقی عمل کی رعنائیاں پائی جاتی ہیں۔ اور تخلیقی عمل ارادہ و شعور کے بغیر وجود پذیر نہیں ہو سکتا ہے۔ جو انسان جس قدر کوشش کرے گا اور محنت و مشقت سے کام لے گا۔ اس کی شاعری اتنی ہی قابل قدر اور اعلیٰ ہوگی۔ اردو تنقید نگار سب کے سب اسی پر اتفاق کرتے ہیں۔ شاعری میں اصلاح سخن کی روایات کا پایا جانا۔ مختلف دبستانوں کا وجود، اردو شاعری کا لکھنوی یا دہلوی تہذیب و تمدن کا آئینہ دار ہونا۔ اور ہر بڑے شاعروں کے اسلوب بیان میں فرق و امتیاز یہ تمام چیزیں اس بات کو واضح کر رہی ہیں کہ شاعری اکتسابی اور انسانی کوشش کا ثمرہ ہے۔ یہی سبب ہے کہ انسان کے ابتدائی دور کی شاعری میں وہ پختگی اور زور بیان نہیں پایا جاتا ہے۔ جو آخری دور کے شاعری میں ملتی ہے

یقیناً اسی دور کی شاعری شاعر کو زندہ رکھتی ہے۔ اور اس کی زندگی کی ترجمانی پیش کرتی ہے۔ اچھے سے اچھے شعر کہنے کے لئے کہنہ مشق ہونا ضروری ہے۔ مولانا الطاف حسین حالی نے تین بنیادیں قرار دی ہیں۔ اور وہ یہ ہیں

۱۔ تخیل ۲۔ تفحص الفاظ ۳۔ کائنات کا مطالعہ

یہ شرطیں مطلق شاعری کی ہیں۔ دربار رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے شاعر حضرت حسان بن ثابت کے نزدیک اچھا شعر وہ ہے جب پڑھا جائے تو لوگ کہہ اٹھیں کہ سچ کہا ہے۔ اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ شاعری کی بنیاد اصلیت پر قائم ہونا چاہئے۔ عرفی کی رائے میں اصلی شعر وہ ہے جس میں حسن لفظ اور حسن معنی دونوں کا حسین امتزاج پایا جائے۔ صرف الفاظ کے گورکھ دھندوں کا نام شاعری نہیں ہے۔ بلکہ معنوی اعتبار سے بھی اس میں رفعت پائی جائے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ شاعری میں عظمت اور اچھائی کن راہوں سے آتی ہے وہ کیا عناصر ہیں جو اشعار کو عظیم بناتے ہیں۔؟ ان عناصر کی نشاندہی کرنے میں وقت کے عظیم محقق اور فلسفی لان جائی سن لکھتے ہیں کہ شعرو ادب میں مندرجہ ذیل طریقوں سے عظمت آتی ہے۔

۱۔ خیال بلند ہو۔
۲۔ صنعتوں کا استعمال ہو۔
۳۔ محنت اور توجہ سے الفاظ کا انتخاب کیا گیا ہو۔
۴۔ موقع اور محل کی مناسبت سے الفاظ کا استعمال کیا گیا ہو۔
۵۔ جذبات میں ایسی شدت ہو کر پڑھنے والوں کے دل میں اتر جائیں۔
۶۔ لفظوں کی ترتیب سے ہم آہنگی ظاہر ہو۔ اور نغمگی پیدا ہو جو نہ صرف کانوں کو بھاتی ہو بلکہ جذبات کو بھی بیدار کرتی ہو۔

شاعری میں ان مندرجہ بالا عناصر کی موجودگی اس بات کا احساس دلاتی ہے کہ اس میں تخلیقی عمل کی رعنائیاں پائی جاتی ہیں۔ تخلیقی عمل کے بغیر شاعری کا وجود قریب قریب ناممکن ہے۔ حضرت مولانا حسن بریلوی جو ایک بڑے اور ماہر فن شاعر تھے۔ ان کی شاعری میں بھی یہ عناصر پائے جاتے ہیں۔ جن کا تفصیلی جائزہ بعد میں پیش کیا جائے گا۔ اس سے قبل آپ تخلیقی عمل اور اس کے مراحل کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ اس کو سمجھائے بغیر گفتگو جاری رکھنے میں مولانا کی شاعری کا تجزیاتی مطالعہ پیش کرنے میں دشواری آئے گی۔ اور جگہ جگہ رکاوٹ محسوس ہو گی۔

تخلیقی عمل۔ اور معنی ومفہوم

تخلیقی عمل کیا ہے۔؟ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے جناب وزیر آغا صاحب لکھتے ہیں۔

> اصلاً یہ وہ عمل ہے جس کی مدد سے انسان اپنے ہی وجود کی بامشقت قید سے رہائی پا جاتا ہے۔ بالکل جیسے کوئی شئی کسی مدار میں مسلسل گھومتے چلے جانے کے بعد معاً لپک کر ایک نئے اور کشادہ تر مدار میں چلی جائے، جسم، معاشرہ، اسطور، تاریخ اور فن ہی نہیں کائنات کے محیط وسیط نظام میں بھی اس کا یہی اصول کار فرما ہے خود حقیقت اولیٰ بھی جو وحدت کی علم بردار اور نام و روپ سے بے نیاز ہے اپنے تخلیقی عمل میں دو واضح سطحوں کا احساس دلاتی ہے۔ (تخلیقی عمل)

اس بیان سے واضح ہوتا ہے کہ کسی شئی کا ایک مدار سے لپک کر دوسرے مدار میں آنے کا نام تخلیقی عمل ہے، اس کی وسعت کس قدر ہے۔؟ اس کا بھی اندازہ مندرجہ بالا تحریروں سے ہوتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ تخلیقی عمل میں کتنے کردار نمایاں کام انجام دیتے ہیں اور تخلیقی عمل کن کن مرحلوں سے گزرتی ہے۔ فنون لطیفہ کی تخلیق میں چار کردار حصہ لیتے ہیں اور وہ یہ ہیں۔

۱۔ اجتماعی لاشعور ۲۔ معروضی دنیا
۳۔ تخلیقی مشینری ۴۔ آہنگ

اجتماعی لاشعور

اجتماعی لاشعور کا تعلق نفسیات سے ہے کسی بھی ادبی فن

پارے کو سمجھنے کے لئے فنکار یا تخلیق کار کے نفسیات کا مطالعہ
کرنا ضروری ہے اور ادب کا تحصیل نفسی کے توسط سے
جو ادراک حاصل ہوتا ہے وہ بہت زیادہ اہمیت کی حامل
ہے۔ تحلیل نفسی کے نظریہ کو سب سے پہلے فرائڈ نے پیش
کیا۔ اور اس کے تلامذہ نے اس کو ترقی دی۔ فرائڈ نے
لاشعوری کیفیات کا مطالعہ کرنے کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا ہے
کہ جن چیزوں پر پابندی کی جاتی ہے وہ بظاہر دب جاتی
ہیں۔ لیکن لاشعور کے نہاں خانے میں محفوظ رہتی ہیں۔
فرائڈ کے نظریہ تحلیل نفسی سے استفادہ کرتے ہوئے
فنکار کی ذہنی کیفیات اور قوت تخلیق کو موضوع بنانے کی
تحریک ادب وتنقید میں عام ہوئی۔ فرائڈ نے فنکار کیلئے
لاشعوری کیفیات اور جنون پر زور دیا ہے۔ تحلیل نفسی کے
ماہرین سنجیدہ خواہشات کے ذرائع اظہار خواب، دیوانگی
اور شاعری کو قرار دیتے ہیں اس طرح شاعری کا تعلق لاشعور کی
کی کیفیات سے جاکر جڑ جاتی ہے۔ ظاہر ہے لاشعور کا تعلق
ذہنی کیفیات سے ہے۔ اسی لئے تو تنقید کے دبستانوں میں
ایک اور دبستان کا اضافہ ہوا ہے۔ اس دبستاں کو ارباب
ذوق نفسیاتی تنقید کا نام دیتے ہیں۔ اس دبستاں کے تحت
اولاً ذہن کو تین حصوں میں بانٹا جاتا ہے۔ کہ ذہن کی تین
قسمیں ہیں۔

ذہن

لاشعور — تحت الشعور — شعور

شعور:۔ ذہن کا وہ حصہ کہلاتا ہے جن کے بارے میں
ہم خوب جانتے ہیں کہ اس میں کیا ہے۔؟
لاشعور:۔ وہ حصہ کہلاتا ہے جو نہایت ہی اندھیرا رہتا
ہے اور اس کے بارے میں ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ اس میں
کیا ہے۔؟
تحت الشعور:۔ ان دونوں کے بیچ میں ایک حصہ ہے
جن کے بارے میں ہم تھوڑی بہت جانتے ہیں۔
لاشعور کی اندھیری کوٹھری میں وہ تمام خواہشات،
احساسات وتجربات جمع ہوتی ہیں جو اب تک شعور کی سطح
پر نہیں آئے ہیں۔ یہی خواہشات کبھی خواب کی صورت میں
ظاہر ہوتی ہیں۔ اور کبھی دیوانگی یا شاعری کی صورت میں۔ یہ
لاشعوری خواہشات وتجربات اجتماعی صورت میں شعور پر
یورش کرتی ہیں۔ تو اس وقت تحت الشعور کی ذمہ داری یہ
ہوتی ہے کہ وہ اس یورش ویلغار سے شعور کی نازک سطح
کو محفوظ رکھے۔ لاشعوری کیفیات وخواہشات میں سے
وہ خواہش جو شعور میں آنے کے لائق ہوتی ہے اسے لاشعور سے
نکال کر شعور کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ اور بقیہ خواہشات
پیچھے کی طرف دھکیل دیتا ہے۔ لاشعور کی یہی خواہشیں ادھر
ادھر بھٹکتی رہتی ہیں۔ اور منزل شعور تک آنے کے لئے
بے قرار رہتی ہیں۔
بھٹکتی خواہشیں کیوں منزلوں کو روتی ہیں
طواف کوئے کہیں شادیاں بھی ہوتی ہیں
لاشعور میں جمع شدہ خواہشوں، تجربوں اور مشاہدوں کو اجتماعی
لاشعور کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ کسی بھی فن کار کے
لئے یہ خواہشات کچے مواد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اور تخلیقی
عمل کا یہ مرحلہ جذباتی سطح پر تکنیک اور احساس ناکامی
سے عبارت ہوتا ہے۔ اس کچے مواد کا ایک حصہ ان عناصر
پر مشتمل ہوتا ہے جن سے فن پارے کی خارجی تشکیل ہوتی
ہے۔ جیسے رنگ، سنگ اور لفظ وغیرہ۔ یہ عناصر کب صورت
پذیر ہوتے ہیں اس کے بارے میں جناب وزیر آغا صاحب
لکھتے ہیں۔
یہ عناصر صرف اس وقت فن پارے کی
صورت پذیر ہونے میں مدد دے سکتے ہیں۔
جب فنکار اپنے تخلیقی جوہر سے ایک برقی لہر
سی دوڑا دیتا ہے۔ لفظ ہی کو لیجئے۔
شاعری کی تخلیق میں کوئی لفظ بھی غیر شاعرانہ نہیں
اگر شاعر تخلیقی جوہر سے لیس ہے تو وہ اس
لفظ کو بھی جو بظاہر غیر شاعرانہ ہے ایک معنوی
پرچھائیں سے منسلک کرتا ہے۔ دوسری
طرف اگر اس کے یہاں تخلیقی جوہر ہی ناپید
ہے تو وہ نام نہاد شاعرانہ الفاظ کو بھی معنوی
پرچھائیں عطا نہیں کرسکتا۔ (تخلیقی عمل ص۱۸۰)

کچے مواد کا دوسرا حصہ ان تجربات پر مشتمل ہے جن میں بعض مزاج کے اعتبار سے منفعل اور بعض فعال ہوتے ہیں۔ منفعل تجربات میں وہ تمام منفی تجربات شامل ہیں جنھیں فن کار ورثہ کے طور پر حاصل کرتا ہے۔ یہ تجربات خواہ فطری ہو یا روحانی۔ اور فعال تجربات وہ ہیں۔ جنھیں تخلیق کار اپنی حیاتِ عنصر میں حاصل کرتا ہے۔ اور جو گھر تعلیمی ادارہ یا صحت وعلالت، واقعات وحادثات نیز سیاسی، سماجی، قومی اور بین الاقوامی حالات علمی انکشافات اور معروضی زندگی کی جملہ سطحوں سے اخذ کردہ تجربات پر مشتمل ہوتے ہیں۔ اس کے بعد یکایک تخلیق کار کی زندگی میں کوئی واقعہ نمودار ہوتا ہے یہ واقعہ بڑا بھی ہوسکتا ہے اور بے حد معمولی بھی۔ اس واقعہ سے جب شدید جذباتی دھچکا لگتا ہے اور منفعل تجربات میں تموج پیدا ہوتا ہے تو ان تجربات کا تصادم فعال تجربات سے ہوتا ہے اور اس طرح تخلیق کار کی اندرونی دنیا میں ایک شدید طوفان پیدا ہوجاتا ہے اور وہ شدید بحرانی حالات سے دوچار ہوتا ہے۔ اس طرح تخلیق کار یا فن کار کے لئے مزاج کی کیفیت پیدا ہوجاتی ہے۔ اور اسے کوئی چیز اچھی نہیں لگتی ہے۔ وہ دنیا ومافیہا سے بیزار ہوجاتا ہے۔ نکہت بادِ صبا ہو یا بوئے گل سب اس کی بے قراری میں اضافہ کرتی ہیں۔ سچ کہا ہے کسی نے۔

ہٹ اے نکہت بادِ بہاری راہ لگ اپنی
تجھے اٹکھیلیاں سوجھی ہیں ہم بے زار بیٹھے ہیں

معروضی دنیا

معروضی دنیا کا تعلق خالص فن کار کی ذات اور شخصیت سے ہے کہ ایک طرف فنکار ہے اور اس کے دوسرے سرے پر فنکار کی زندگی، سماج معاشرہ اور اس کے مسائل ہیں۔ جس کے بیچ رہ کر اپنی زندگی کے لمحات گزارتے ہیں۔ اور جس فضا میں وہ سانس لیتے ہیں کوئی بھی فنکار اپنی زندگی کو فراموش نہیں کرسکتا ہے۔ کسی نہ کسی طرح شعوری یا غیر شعوری طور وہ اپنے فن پارے میں اس زندگی کی جھلک پیش کرتا ہے۔ وزیر آغا صاحب لکھتے ہیں۔

فن کی زبان تو اساطیری یا علامتی ہے اور چونکہ ہر فرد کے اندر یہ سارا علامتی اور اساطیری طرز بیان موجود ہے۔ لہذا جب یہ فنی تخلیق میں خود کو اجاگر کرتا ہے تو معاشرہ اپنی داخلی سطح پر اس سے متمتع ہوتا ہے۔ یوں ایک سچا فنکار فرد اور معاشرے کے رشتے کا علمبردار ہوتا ہے۔ مگر وہ اس رشتے کے معروضی سطح سے کہیں زیادہ اس کی داخلی سطح کو اہمیت دیتا ہے اسی لئے وہ ایسا فن تخلیق کرتا ہے۔ جو بقول ہربرٹ ریڈ "ہمیشہ" اب" کی فضا کا حامل ہوتا ہے۔ یعنی جو کبھی باسی نہیں ہوتا۔ (تخلیقی عمل ص ۱۲۳)

اس بیان کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ فن کار اپنے فنی پیکر میں اپنی ذات وشخصیت اور سماج ومعاشرہ دونوں کو پیش کرتا ہے۔ اسی سبب یہ فن سچا فن ہوتا ہے۔ اور فن کار اسی فن پارے کی بنیاد پر حیات جاوداں حاصل کرتا ہے فرد اور معاشرے کے رشتے کا علمبردار فنکار جب فنی تخلیق سے دوچار ہوتا ہے۔ یا وہ جب تخلیقی عمل انجام دیتا ہے تو اس کی نوعیت کیا ہوتی ہے اور کس طرح وہ معاشرے کی جھلک کو پیش کرتا ہے اس کو جاننے کے لئے یہ عبارت پڑھئے۔

جب کوئی فنکار تخلیق کے عمل میں مبتلا ہوتا ہے تو خود کو ایک لمحہ پر مرتکز کرلیتا ہے۔ اور اس ارتکاز کی مدد سے ایک ہی لمحے میں اس سارے کے سارے مرورِ زماں کو دریافت کرلیتا ہے جو اس کے اپنے باطن میں پوشیدہ تھا۔ یہی بات صوفیاء کے یہاں اس طور سے ملتی ہے کہ جز اپنے اندر غوطہ کھا کر کل کو پہچان لیتا ہے۔ دوسری طرف فلاسفروں کے یہاں ایک شئی کو دوسری اشیاء سے منسلک کرکے ایک تصور قائم ہوتا ہے گویا فن کار تو خود کو ایک لمحے احساس، منظر یا کیفیت میں اس طور غرق کرلیتا ہے کہ باقی دنیا سے اس

کا کوئی تعلق باقی نہیں رہتا۔

(تخلیقی عمل ص ۱۳۲)

قارئین بھولے نہ ہوں گے۔ اجتماعی لاشعور کے منفعل اور فعال عناصر جس واقعہ کے توسط سے ایک دوسرے سے متصادم ہو کر بے بسی اور بحرانی حالات میں بدل گئے۔ اور جس کے نتیجہ میں فنکار کی صورت مزاج اور یاسیت کی آئینہ دار ہو گئی تھی۔ اس واقعہ کا تعلق اسی معروضی دنیا سے ہوتا ہے اس مزاج اور یاسیت کی منزل پہ آ کر فنکار کی صورت پارہ کی سی ہو جاتی ہے۔ یہاں تک کہ اس زندگی میں اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور وہ اس سے نکلنے کے لئے حتی المقدور کوشش کرتا اور نجات کی راہ کے لئے ادھر ادھر ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ جناب عبدالمجید صاحب شاداں بدایونی جو بہترین شاعر اور فن کار ہیں۔ ان کے کئی ایک دیوان شائع ہو چکے ہیں۔ انھوں نے اپنا تجربہ بیان کرتے ہوئے بتایا کہ۔ "شعر کی تخلیق کے وقت مجھے ایسی بے قراری اور بے چینی لاحق ہو جاتی ہے کہ کسی کروٹ سکون نہیں ملتا ہے گویا یہ اسی قسم کی کیفیت ہوتی ہے۔ ایک عورت پر دردِ زہ میں مبتلا ہونے پر طاری ہوتی ہے اور وہ اس سے نجات پانے کے لئے اللہ تعالےٰ سے دعائیں مانگتی ہے۔"

شاداں صاحب کے اس بیان سے میرے ذہن میں تخلیقی عمل کے سارے مدارج اور مراحل کی نشاندہی ہوتی ہے اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی بھی فنکار اس بے چینی و بیقراری کی کیفیت سے کس طرح نجات پا سکتا ہے۔؟ اور اس کی کیا صورت نکل سکتی ہے۔

آہنگ اور تخلیقی مشینری کا متحرک ہونا

گزشتہ اوراق میں بتایا گیا کہ تخلیق کار عجیب طرح کی کرب و معیبت میں گرفتار ہوتا ہے۔ اور وہ ایسی بے چینی اور اندھیرے کے عالم سے دوچار ہوتا ہے۔ کہ اس کا دم گھٹنے لگتا ہے اور سانس تک کے رکنے کی نوبت آجاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر انسان کی فطرت اس عالم سے دوچار ہونے کے بعد اس سے نجات پانے اور آزاد ہونے کی کوشش کرتا ہے لیکن اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس سے نجات پانے کی کیا صورت ہوگی۔ جناب وزیر آغا صاحب لکھتے ہیں۔

> مزاج کی اس فضا میں روشنی کا ایک کوندا سا نمودار ہوتا ہے اور تخلیق کار بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتا ہے کہ یہی کوندا ہے جو اسے مزاج کے ہولناک طوفان سے باہر نکلنے کا راستہ سمجھا سکتا ہے۔ (تخلیقی عمل ص ۱۸۲)

ارباب فکر و نظر سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ روشنی پارس کی کوندشتی لطیف ہے۔ جسے صرف دیکھا جا سکتا ہے الفاظ کے روپ میں اس کو پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اور نہ ہی کوئی فن کار اپنے کچے مواد کو پیکر کا روپ دے سکتا ہے۔ اس لئے ضروری ہے وہ روشنی کی تجسیم بھی ہو۔ صورت کے روپ میں اس کی تعلیب بھی ہو تاکہ فن کار اس کو اپنی گرفت میں لے سکے۔ یقینی طور پر اس روشنی اور وزن کے نمودار ہونے سے فن کار کو خوشی اور مسرت ضرور ہوئی ہوگی۔ اور اس مزاج کی فضا سے باہر آنے کی شدید خواہش اس کے دل میں پیدا ہوئی ہوگی۔ اور روشنی تک پہونچنے کے لئے وہ ہاتھ پاؤں چلائے گا۔ اسی دوران وہ آخر کار اس ازلی اور ابدی آہنگ تک رسائی حاصل کرے گا۔ جو قدرتی طور پر ہر شئی کے پس منظر پایا جاتا ہے۔ یہ آہنگ برقی قوت اور برقی لہر کی حیثیت رکھتا ہے۔ جب فن کار اس کا لمس حاصل کرتا ہے تو اس کے اندر جو تخلیقی مشینری پائی جاتی ہے وہ متحرک ہو جاتی ہے اور دھیرے دھیرے وہ اس مزاج کی کیفیت سے اوپر اٹھنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور دوسری طرف روشنی اس کو اپنی طرف کھینچنے کی کوشش کرتی ہے۔ بالآخر فن کار کے لئے فن کی دنیا میں ایک ایسی منزل آتی ہے جہاں فن کار اپنی تخلیقی مشینری کے ذریعہ اس روشنی کو پا لیتا ہے۔ اور اس کی تجسیم کر کے اپنے کچے مواد کو جو فعال اور منفعل تجربات پر مشتمل ہیں فن کے روپ میں پیش کر دیتا ہے۔ اور فن کار.... آزادی کی دنیا میں سانس لینے لگتا ہے۔ اس سے اندازہ ہوا کہ فن کار خلاق طبیعت کا مالک ہوتا ہے۔ اور ان کے

اندر ایسی صلاحیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں جن سے غیر فنکار محروم ہوتے ہیں۔ تخلیقی عمل کے اس تفصیلی جائزے سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ تخلیق کا سارا ڈرامہ فن کار کی داخلی دنیا میں کھیلا جاتا ہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کوئی بھی فنکار خارجی دنیا سے کیا لیتا ہے۔ اور خارجی دنیا کی کون سی چیز اس کی تخلیق میں اول شعر میں نمایاں ہوتی ہے۔؟ اس سوال کے جواب میں میں صرف اس قدر بتانا چاہتا ہوں کہ فن کار اگر شاعر یا ادیب ہے تو وہ اپنے اردگرد کی زندگی سے الفاظ اور بول چال کو لیتا ہے۔ شاعر اگر اپنی تخلیق کے دوران صرف اپنی شخصیت اور اپنی گوناگوں خوبیوں پر نظر ڈالتا ہے تو وزن کی تجسیم میں، وہ ایسے الفاظ کا انتخاب کرتا ہے جن میں ان کی انانیت زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔ اس کی مثال میں غالب کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ کہ ان کی شاعری اس قدر مشکل اور ژولیدہ صورت ہوگئی ہے کہ عام قاری اس کو سمجھنے سے قاصر رہتا ہے۔ اسی لئے غالب کے دور میں ہی ان کی شاعری پر اعتراض ہوا ہے۔ اور ان کی مشکل پسندی کو لوگوں نے خوب جم کر کوسا ہے۔ غالب کی اسی مشکل پسندی کے پیش نظر یہ اعتراض کیا گیا۔

پہلا دور وہ ہے جب ان کے شعر پر پھبتیاں
کی پھبتیاں کسی جاتی تھیں اس زمانے میں
وہ طرز بیدل، بیدل میں ریختہ کہتے تھے۔ اور
اسے قیامت جانتے تھے۔ حکیم آغا جان عیش
نے ایک محفل شعر میں غالب کو سنا دیا تھا۔

ے کلام میر سمجھے یا کلام میرزا سمجھے
مگر ان کا کہا یہ آپ سمجھیں یا خدا سمجھے

ان کے علاوہ اور بھی بے ہودہ اشعار کہے تھے اور مرزا نے جھلا کر کہا تھا۔

نہ ستائش کی تمنا نہ صلے کی پرواہ
گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

ان کی رباعی بھی ہے۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سن سن کے اسے سخنوران کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

(آج کل نئی دہلی دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۹)

اور اگر شاعر یا ادیب وزن کی تجسیم کے وقت عوامی زبان اور سماج و معاشرہ کا زیادہ خیال کرتا ہے تو وہ ایسے الفاظ کا استعمال کرتا ہے جو عام فہم اور بول چال کے ہوتے ہیں۔ اس سلسلے میں میر ذوق، داغ اور مولانا حسن بریلوی کی شاعری کو پیش کیا جا سکتا ہے کہ ان حضرات نے اپنی شاعری میں، روزمرہ کے بول چال اور محاوروں کہاوتوں کی زبان میں شاعری کی ہے۔ جس کے سبب ان کی شاعری عام فہم اور سلیس زبان کی شاعری ہوگئی ہے۔ اور اس کی شاعری کو عوامی مقبولیت نے ہاتھوں ہاتھ لیا ہے۔

کلام حسن میں تخلیقی عمل کی کیفیت

شخصیت اور اس کے تشکیلی عناصر کے متعلق جائزے میں بتا چکا ہوں کہ مولانا حسن بریلوی ایک ایسے خاندان کے فرد تھے جن کے افراد بہت سی خوبیوں اور کمالات کے مالک تھے۔ اور توارث میں مولانا نے بہت سی خصوصیات کو حاصل کیا تھا۔ اور نیز اس بات کی بھی نشاندہی کر چکا ہوں کہ وہ خصوصیات کیا ہیں۔؟ نسلی توارث اور نسلی تجربات میں انہوں نے جو کچھ بھی حاصل کیا اور جن خصوصیات سے ان کی ذات و شخصیت مالا مال ہوئی۔ وہ سب کے سب مولانا کے لاشعور والے حصہ میں جمع ہوتی رہیں۔ یقیناً یہی خصوصیات و کمالات اور تجربات و مشاہدات منفعل عناصر ہیں۔ اور تہذیب و تمدن کے مختلف اداروں مثلاً گھر یا خاندان، معاشرتی طبقہ، معاشی نظام، تہذیبی نظام، مذہبی نظام اور سماج و ماحول سے جو تجربات انہوں نے کشید کئے۔ سب فعال عناصر کے روپ میں لاشعور میں جمع ہوتے رہے۔ اور ان دونوں عناصر سے مل کر لاشعور اجتماعی لاشعور کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ اور کچے مواد کی حیثیت رکھتا ہے۔ ان میں اتنی قوت اور جذب و کشش نہیں ہوتی ہے

کہ وہ فن پارے کا روپ اپنا سکے۔ جیسا کہ تحقیقی عمل کے
مدارج کے جائزے میں اس کی وضاحت کی جاچکی ہے۔
ان کچھ مواد کی طرف مولانا حسن اشارہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

جب تو آئے درس گاہ عشق میں
اے حسن فاضل تھے اپنے گھر سے ہم

مولانا حسن بریلوی نے اپنے اس شعر میں درس گاہ عشق کو مطلق رکھا
ہے جس سے عشق مجازی کی درس گاہ بھی مراد لی جاسکتی ہے اور عشق
حقیقی کی درس گاہ بھی۔ لیکن قرین قیاس یہی ہے کہ اس مقام پر اس
سے درس گاہ عشق مجازی ہے۔ کیونکہ جس درس گاہ عشق میں مولانا
آئے تھے۔ اس کے سر معلم حضرت داغ دہلوی تھے۔ اور ان کے
یہاں عشق حقیقی خال خال ہی نظر آتا ہے۔ ہاں ان کی شاعری میں
ان کے دبستان میں اور ان کی درس گاہ میں عشق مجازی ہی کے
جلوے تھے۔ اسی کی بے قراریاں تھیں اور اسی عشق مجازی کا
درد و کرب تھا۔ جو داغ کو بے چین کر رہا تھا۔ اور حضرت داغ
تھے جو اسی درد و کرب اور تڑپ و بے قراری کے عالم میں شاعری
کر رہے تھے اور اپنے لبوں سے گلفشانیاں کر رہے تھے۔
اس لئے کہ ان کی شاعری کا سب سے بڑا محرک بقول خلیق انجم
"خوب صورت چہرے تھے" اور مولانا حسن بریلوی اس درس گاہ
میں اس وقت آئے جب کہ وہ اپنے گھر ہی سے فاضل تھے۔ اس
متذکرہ بالا شعر میں "فاضل" سے ہم اصطلاحی معنی مراد لیتے ہیں یعنی
ایسی شخصیت جو مختلف صلاحیتوں کی جامع ہو۔ جس میں شعور و ادراک
غور و فکر اور علم و فن کی قوت ہو۔ ظاہر ہے یہ تمام چیزیں مولانا
موصوف کو فعال و منفعل عناصر کی صورت میں مل چکی تھیں۔ اور لاشعور
میں جمع تھیں۔ جسے ہم نے اجتماعی لاشعور کا نام دیا ہے۔ مولانا حسن
نے اس درس گاہ عشق میں کیا سیکھا؟ فن شاعری سیکھا اور لطافت
شعر و سخن سیکھی، اسلوب بیان سیکھا اور اسی درس گاہ میں مولانا نے
ایسے واقعات بھی دیکھے اور چشم سر سے ایسے مظاہر کا ملاحظہ بھی کیا۔
جن سے مولانا جذباتی سطح پر متاثر بھی ہوئے۔ اور دل کی دنیا بھی
اس سے متاثر ہوئی۔ اسی وجہ سے اندر کی دنیا میں ایک بھونچال سا
آگیا۔ شدید طوفان برپا ہوگیا۔ اور فعال و منفعل عناصر ایک دوسرے
سے متصادم ہو کر بے نام و نشان ہوگئے۔ اور بے بسی کے عالم
میں مولانا کی کیا صورت تھی۔ ان کے مزاج کی کیا کیفیت تھی۔ ان
اشعار سے آپ اندازہ لگا سکتے۔

(۱) دل میں ہجوم یاس ہے امید چل بسی،
اتنا بسایا یہ قصر کہ ویران ہوگیا

(۲) نہ قید زلف میں ہے مرغ دل نہ سینہ میں
نہ یہ قفس کے لئے ہے نہ آشیاں کے لئے

(۳) کس طرح ضبط کریں رونے کو
درد کو دل میں چھپاتے کیونکر

(۴) نہ کہیں تو ہو کلیجہ ٹکڑے
کوئی پوچھے تو سناتیں کیونکر

(۵) بے کسی مری عیاں حال دل زار سے ہے
ٹپکی پڑتی ہے مری شکل سے ناچاری دل

(۶) عشق اور عشق بتاں ہائے مصیبت میری
درد اور درد فراق آہ گرفتاری دل

مولانا حسن بریلوی کے اندرون دل جو طوفان خیزیاں ہیں۔ اور
نفس کے اندر قیامت جو انگڑائیاں لے رہی ہے۔ اس سے
بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اجتماعی لاشعور کے تجربات و
احساسات اور مشاہدات و خواہشات کے دونوں عناصر کے
تصادم سے کس بے بسی کا عالم ہے۔ بے شک یہی وہ حالات
ہیں جن سے انسان نبرد آزما ہونے کے بعد اس کا دم گھٹنے
لگتا ہے۔ اور اس سے نکلنے کی ہر ممکن کوشش کرتا ہے۔ اسی
عالم اضطراب میں مولانا حسن بریلوی نے آخر کار اس آہنگ
کو پا ہی لیا جو ازلی اور ابدی ہوتا ہے۔ اور جس سے تخلیقی قوت
متحرک ہوتی ہے۔ اب موصوف اپنی تخلیقی مشنیری کی مدد و
تعاون سے شاعری کی تخلیق کر رہے تھے۔ اشعار پر اشعار لکھ
رہے ہیں۔ غزل کیا نعت و منقبت کیا، رباعی و قطعات کیا
سب کے سب ان کے قلم سے موسلا دھار بارش کی طرح
جھڑ رہے ہیں۔ طبیعت ہے جو جوش و خروش میں مچل رہی ہے
قلم ہے جو خامہ فرسائی کر رہا ہے اور اس مسلسل عمل، اور پیہم
جد و جہد سے قلم تھکتا نہیں ہے بلکہ لکھتا ہی چلا جارہا ہے
واہ کیا ہی خوب ترجمانی کی ہے۔ آپ لکھتے ہیں۔

اب حسن منقبت خواجہ اجمیر سنا
طبع پر جوش ہے رکتا نہیں خامہ تیرا

مولانا حسن بریلوی نے دل کی بے چینی اور اضطراب سے نکلنے کے لئے وزن اور روشنی کی تجسیم جن الفاظ اور جملوں سے کی ہے وہ اسی معروضی دنیا کے الفاظ ہیں۔ جو سماج و ماحول سے پسند کئے گئے ہیں۔ یہی سبب ہے کہ مولانا حسن بریلوی نے شاعری کی تخلیق کے دوران فن شاعری کے تمام تلازمات اور فنی تقاضوں کو ملحوظ خاطر رکھا۔ اپنی تخلیق کے کسی بھی موقعہ پر آپ نے فن کے اصول و نظریات سے انحراف اختیار نہیں کیا ہے۔ ؟ اور نہ ہی بے راہ روی سے کام لیا ہے۔ انھیں خوبیوں اور کمالات کی وجہ سے آپ فن شاعری کے مستند اساتذہ میں تھے۔ یہ مبالغہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ یہ نقلیت نہیں بلکہ اصلیت ہے۔ مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں۔

شعر و سخن کا شوق حضرت کو ابتدا ہی سے تھا۔ کچھ روز تک بطور خود مشق کرتے رہے اس کے بعد مرزا داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا۔ اور ایک مدت تک رامپور میں رہ کر استاد کے گلشن سخن سے گل چینی کرتے رہے۔ یہاں تک کہ بجائے خود استاد مستند قرار پائے۔

(اردوئے معلیٰ بابت جون ۱۹۱۲ء)

حسرت موہانی نے حسن بریلوی کے بارے میں یہ کہا " استاد مستند قرار پائے۔" اس سے جو بات شعور میں آتی وہ بہت ہی دیدہ زیب ہے۔ آخر کار موہانی صاحب نے اس بات کا اعتراف ہی کیوں کیا۔ ؟ ظاہر ہے ان میں وہ تمام کمالات و امتیازات پائے جاتے تھے۔ جو مستند استاد کے لئے ضروری ہوتی ہیں۔ اس بیان کی روشنی میں یہ بآسانی کہا جاسکتا ہے کہ مولانا بہت بڑے شاعر تھے۔ اگرچہ انھوں نے اس بارے میں اپنے نظریہ کا اظہار نہیں کیا ہے۔ اور نہ ہی کہنا چاہئے۔ کیونکہ گڑ کہنے سے منہ میٹھا نہیں ہوتا ہے۔ لیکن کہیں کہیں ان کے اشعار میں ایسے اشارے مل جاتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا غیر معمولی شخصیت کے حامل رہتے۔

شاخ خامہ سے ہوئی بحر غزل رشک چمن
طبع رنگین نے جمایا رنگ گلشن آب میں

ذوق کے شاگرد کے شاگرد کا دیکھیں کلام
باحیا ہیں اب بھی گرد و بیں زد شمن آب میں

ان دونوں اشعار سے فن شاعری کی جو بالادستی ثابت ہوتی ہے اور فن نزاکتوں کا جو احساس ہوتا ہے۔ اس سے بہت سی باتیں ذہن میں آگئیں اور درازہائے سربستہ کھل کر رہ گئے۔ مولانا کی شاعری رشک چمن ہے اور انکی طبع رنگین بہت کچھ جمایا ہے اور رنگ کو اور بھی چوکھا کر دیا ہے۔ اسی طرح ان کے اور بھی اشعار ہیں جن سے ان کے فنی شعور اور فنی ذوق کا پتہ چلتا ہے۔

اب تک جتنی باتیں بتائی گئیں، اس کا تعلق یا تو ذات و شخصیت کی تعمیر اور اس کے عناصر کے تشکل سے تھا۔ یا پھر شاعری کی تخلیق سے پہلے ان کے دل کی دنیا میں اٹھنے والے جذبات و احساسات سے تھا۔ اب ان کے دو دیوان میرے سامنے ہیں۔ جن میں ان کے فن پارے ہیں۔ ان کے تخلیقی کارنامے روز روشن کیطرح واضح ہیں۔ اور ان کے فن پارے میں ایسی جذب و کشش ہے جو دعوت نظارہ دے رہی ہے۔ اور ارباب فکر و نظر کو کچھ سوچنے پر مجبور کر رہی ہے۔ تو پھر آیئے اور ان کی شاعری کی روشنی میں ان کی شخصیت، فنی کمالات اور اسلوب بیان اور داخلی و خارجی ہیئت کو سمجھنے کی کوشش کرتے ہیں، تاکہ مولانا حسن بریلوی کے ادبی خدمات کا صحیح معنی میں شعور حاصل ہوسکے اور ان کی شاعرانہ عظمت کو سمجھا جاسکے۔ نیز اس بات کی بھی معلومات حاصل کی جاسکے کہ اردو ادب میں مولانا کو کیا مقام حاصل تھا۔ ؟ آخر وہ کیا خصوصیات و انفرادیت ان میں پائی جاتی ہے۔ ؟ کہ اتنے طویل عرصے گزر جانے کے بعد بھی ان کی شخصیت ہمارے لئے زندۂ جاوید کی حیثیت رکھتی ہے۔

کلام حسن کا تنقیدی و تجزیاتی مطالعہ

حضرت مولانا حسن بریلوی کے دو دیوان میرے سامنے ہیں۔ " ثمر فصاحت" اور " ذوق نعت"۔ اول کا تعلق غزلیہ شاعری سے ہے۔ اور دوسرے نعتیہ شاعری سے ہر دو موضوع

پر ہم بعد میں الگ الگ بحث کریں گے۔ یہاں صرف ان کی شاعری سے بحث کی جارہی ہے۔ خواہ اس کا تعلق غزل سے ہو یا نعت و منقبت سے۔ کائنات میں جتنی بھی چیزیں ہیں۔ اور جتنی بھی اشیاء تخلیق کے زیر اثر وجود میں آتی ہیں۔ ان پر غور و فکر اور تنقید و نظر کرنے کی دو سطحیں ہیں۔ اول یہ کہ اس تخلیقی فنپارے سے فنکار یا تخلیق کار کا تعلق ہے یا نہیں ہے۔ اور اگر ہے تو کس نوعیت کا ہے۔ اس میں تخلیق کار کی شخصیت کا اظہار ہوا ہے تو کس قدر، اور کس مقدار میں۔؟ اور دوسرا یہ کہ خود فنپارے کی کتنی سطحیں ہیں۔؟ اور اس کی مختلف سطحوں میں کیا کیا خوبیاں پائی جاتی ہیں۔ ان خوبیوں اور کمالات و خصوصیات کے پائے جانے کی کیا وجوہات اور اسباب و علل ہیں۔ ان تمام پہلوؤں پر اگر سیر حاصل بحث کی جائے گی تو صحیح معنوں میں کسی شاعر یا فنکار کے فن تنقیدی و تجزیات کا مطالعہ ہوگا۔ ورنہ بات ادھوری کی ادھوری رہ جائے گی۔ اس لئے ہم یہ کوشش کریں گے کہ مولانا حسن کی شاعری کے تمام ممکنہ پہلوؤں پر کچھ نہ کچھ بحث کی جائے۔ تاکہ بات ادھوری نہ رہ جائے۔ مولانا حسن بریلوی کی تعلیم و تربیت اور فن شاعری نیز مولانا کی شاعری میں پائی جانے والی تخلیقی عمل کی کیفیت کے بارے میں جو تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا اس سے اندازہ تو ہو ہی گیا ہوگا کہ مولانا بہت بڑے فن کار اور شاعر و ادیب ہیں۔ نیز ان کی شخصیت قوس قزح کی متنوع رنگینیوں کی حامل ہے۔ مولانا کے بڑے فنکار ہونے میں کسی کو شک نہ ہوگا۔ مگر وہ شک کرے گا اور شبہ کی گنجائش نکالے گا جو اندھری بصیرت کا مالک ہے۔ کارخانۂ قدرت سے جن کو ذوق اور صحیح فیصلہ کرنے کی قوت ملی ہے۔ وہ اس اجالے میں آفتاب و ماہتاب کی مانند چمکنے والے فنکار مولانا حسن کی فنکاری کا ہرگز ہرگز نہ انکار کرے گا۔ مولانا کی شاعری میں دو مختلف پہلو پائے جاتے ہیں۔ "داخلیت اور خارجیت"، جذبات و احساسات فکر و تخیل، سوز و گداز، انانیت اور معنی آفرینی کا نام داخلیت ہے اور خارجیت کے زیر اثر الفاظ کی نشست و برخاست جملوں کی بندش اور صنائع و بدائع نیز وزن و آہنگ کے مسائل آتے ہیں اور ان ہی دونوں کے امتزاج سے شاعری تکمیل کی منزل سے ہم کنار ہوتی ہے۔

مولانا حسن اور داخلیت

کسی فن پارہ اور شاعری میں داخلیت کو وہی حیثیت حاصل ہے جو جسم میں روح کو حاصل ہوتی ہے۔ انسانی وجود کا صرف ڈھانچہ اور شکل و صورت کا ہونا کوئی اہمیت نہیں رکھتا ہے۔ جب تک اس میں روح کی لطافت اور اس کی تازگی نہ ہو۔ گویا مدار زندگی اگر کوئی شئی ہے تو وہ روح ہے۔ کہ اسی سے انسان زندہ رہتا ہے۔ اور حیات و زیست کی بوقلمونی سے مستفید ہوتا ہے۔ اور اگر یہ نہیں ہے تو سمجھئے کہ انسان کا صرف ڈھانچہ ہے۔ جو مورتی کی صورت میں خاموش کھڑا ہے۔ نہ خود حرکت کرسکتا ہے اور نہ کسی کی مدد کرسکتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح شاعری میں اگر داخلیت اور اس کی رنگا رنگی ہے تو شاعری زندہ ہے۔ اور متحرک ہے۔ اس میں ہر طرح کی تازگی اور لطافت و نزاکت کا احساس ہوتا ہے اس سے وہ خود بھی دیدہ زیب پُر کشش ہوتی ہے۔ اور دوسروں کو بھی اپنی جذب و کشش سے متاثر کرتی ہے۔ آج میرؔ و اقبالؔ اور داغؔ کی اس قدر اہمیت کیوں ہے۔ یہ صرف اس وجہ سے کہ ان کی شاعری میں داخلیت و معنویت کا رنگ گہرا ہے۔ لیکن اس سے یہ مطلب ہرگز نہ لیا جائے کہ داخلیت ہی سب کچھ ہے۔ اور خارجیت ایک بے کار سی چیز ہے۔ خارجیت کی بھی اہمیت ہے اور اس کو بھی عزت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ ارباب فکر و نظر داخلیت کو اولیت کا درجہ دیتے ہیں۔ اور خارجیت کو ذیلی اور ثانوی ـــــــ شمس الرحمٰن فاروقی لکھتے ہیں۔

" اور چونکہ خارجی ہیئت کی اہمیت صرف ذیلی ہے۔"
(لفظ و معنی ص ۱۱۳)

احساسات و جذبات

احساسات و جذبات کا تعلق داخلیت سے ہے کیسی بھی سماج میں شاعر کی حیثیت اس کے دیگر افراد سے نمایاں ہوتی ہے بلکہ اگر یہ

کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ کہ وہ خلاق طبیعت کا مالک ہوتا ہے جس سے سماج اور افراد، سماج و معاشرہ کی بہت سی امیدیں وابستہ ہوتی ہیں۔ اس لئے ضروری ہے کہ شاعر نہایت ہی زود حس ہو اور ان کی طبیعت حساس ہو۔ اگر وہ ان خوبیوں سے لیس نہیں ہے تو سمجھ لیجئے کہ ان میں شاعرانہ صلاحیت مفقود ہے اور ان کی حیثیت عمومی ہے۔ ان میں اور سماج کے دیگر افراد میں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ احساسات کا تعلق حواس خمسہ سے ہوتا ہے۔ قوتِ باصرہ، قوتِ شامہ، قوتِ سامعہ، قوتِ ذائقہ اور قوت لامسہ ان سب کے ذریعہ احساسات ہوتے ہیں۔ ان ذرائع احساس سے جو تجسسات ہوتے ہیں اس کا شعور و ادراک شاعر کو دیگر ذرائع سے ہوتا ہے۔ ان ذرائع کا کام یہ ہے کہ ان احساسات کو دماغ تک پہونچائے۔ حضرت مولانا حسن بریلوی نہایت زود حس اور حساس طبیعت کے مالک تھے یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری میں جابجا احساس کی شدت پائی جاتی ہے۔ اور اس شدتِ احساس سے ان کی شاعری میں جو خوبیاں پیدا ہو گئی ہیں اس کو ارباب ذوق ہی سمجھ سکتے ہیں۔ موصوف نے اپنے حواس کے ذریعہ فطرت کی نیرنگیوں اور اس کی سحر طرازیوں کو محسوس کیا۔ اور اس میں پائے جانے والے جمالیات سے اپنے آپ کو محظوظ کیا، بہار و شباب، فصل گل، باد بہاری، شادابی و رعنائی، سحاب و بادل کا جھوم جھوم کر برسنا۔ اور کائنات کے ذرے میں پائے جانے والے حسن و خوبی کا انھوں نے بخوبی احساس کیا ہے اور اس کو اپنی شاعری میں بیان فرمایا ہے۔ گویا مولانا حسن بریلوی آغوش فطرت میں مچلتے ہوئے نظر آتے ہیں اور اس کی نیرنگی سے ان کی شاعری اٹکھیلیاں کھیلتی ہیں۔ احساسات کی مختلف صورتیں ہیں۔ جو ذیل میں تحریر کی جاتی ہیں۔

۱۔ بصری احساس ۲۔ سامعی احساس
۳۔ ذوقی احساس ۴۔ لامسی احساس
۵۔ شامی احساس

مولانا حسن کی شاعری میں یہ احساسات کہیں تو انفرادی صورت میں پائی جاتی ہیں۔ یعنی صرف، بصری یا ذوقی۔ سامعی یا لامسی وغیرہ۔ اور اجتماعی صورت میں۔ یعنی ایک احساس میں کئی کئی احساسات شامل ہوتی ہیں۔ مندرجہ ذیل اشعار میں احساسات کی پوری ترجمانی ملتی ہیں۔

۱۔ یہ فصل گل یہ جھوم کہ آنا سحاب کا
ساقی میں اور ایک پیالہ شراب کا

۲۔ دیکھا ہے جب سے حسن رخ بے حجاب کا
رنگ آفتاب میں ہے گل آفتاب کا

۳۔ چھینٹے یہ دے رہا ہے یہ برسنا سحاب کا
ٹھنڈی ہوائیں دور ہو جام شراب کا

مذکرہ بالا اشعار میں سے ۱ اور ۲ کے مصرعۂ اولیٰ میں بصری احساس کی کیفیت ملتی ہے۔ اور دوسرے مصرعوں میں ذوقی کیفیت ہوتی ہے۔ جو لفظوں کے روشندان سے ٹپک رہی ہے اور ۳ نمبر شعر میں قوت لامسہ کا بھی استعمال کیا گیا ہے۔ جس کے ذریعہ مولانا موصوف ٹھنڈک کا احساس کر رہے ہیں اور اس خوشگوار موسم میں سانس لیتے ہوئے نظر آتے ہیں۔

۴۔ دل نہ دینے کی شکایت ہے عدو کے سامنے
یہ تو کہئے آپ کا وعدہ وفا ہو جائے گا

۵۔ وصل عدو کا حال سنانے سے فائدہ
للہ رحم کیجئے بس بس سنا سنا!!

۶۔ آپ کیا کہتے ہیں دشمن برابر ہے حسن
خوب ہوتا جو میں دشمن برابر ہوتا

ان اشعار کو پڑھئے اور اندازہ لگائیے کہ مولانا کی قوتِ سماعت کس قدر تیز تھی۔ اسی طرح ان کی شاعری میں اور بھی بہت سے اشعار ملتے ہیں جن میں احساسات کا ذکر ہے۔ یہی احساسات جب شدت اختیار کرتے ہیں اور اس سے دل کی دنیا متاثر ہوتی ہے۔ تو وہ جذبات و ارادت کے روپ میں بدل جاتے ہیں احساسات و جذبات میں اس قدر یکسانیت اور یگانگت ہے کہ اہل ادب ایک دوسرے کی جگہ استعمال کرتے ہیں۔ احساسات بول کر جذبات مراد لیتے ہیں اور جذبات بول کر احساسات مراد لیتے ہیں۔ مگر حقیقت میں دونوں ایک دوسرے سے جدا معنی رکھتے ہیں۔ اگر یہ تحسسات سادہ اور سلیس ہیں تو وہ احساسات ہیں اور جب اس میں شدت آجاتی ہے تو وہ جذبات کہلاتے ہیں۔ ملے جلے تاثرات احساسات کے زمرے میں

تے ہیں۔ لیکن گہرے تاثرات کو جذبات کا نام دیتے ہیں۔ جذبات
کی اہمیت ہے اور اس کی افادیت کس قدر عام ہے۔ اس سے
کسی کو مجال انکار نہیں ہو سکتا ہے۔ کائنات میں جتنی بھی رنگینیاں
ہیں۔ جس قدر شوخیاں ہیں۔ حسن و جمال کی جو بھی انگڑائیاں ہیں۔
ذوق و شوق کی جتنی بھی دلآویزیاں ہیں۔ سب جذبات کی بدولت
ہیں۔ اگر جذبات نہ ہوں تو حسن کی پذیرائی بھی نہیں ہو سکتی۔
کلیوں کی تبسم میں دلکشی، پھولوں کے مسکرانے میں رعنائی
محبوب کی ادا و ں میں بانکپن بھی نہ ہوگا۔ اور کائنات کے رنگ و
بو کی ہر چیز خشک ہو کر رہ جائے گی۔ جس میں نہ فرحت و انبساط
ہوگا اور نہ ہی غم و اندوہ۔ نہ تو کوئی انسان رحم و ہمدردی کے
جذبات سے آشنا ہوگا۔ اور نہ ہی انسانی رشتوں کا کوئی وجود
ہوگا۔ نہ ماں کے قلب میں ممتا کا سراغ لگے گا اور نہ ہی باپ جذبۂ
شفقت سے روشناس ہوگا۔ گویا زندگی کا سارا کاروبار جذبات
سے چل رہا ہے۔ ہر دانشور نے جذبات کی اس اہمیت اور
افادیت کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے۔ ہماری شاعری کے
مصنف جذبات کی افادیت کا اعتراف کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

دنیا میں جو کچھ رونق اور چہل پہل ہے وہ جذبات کی
بدولت ہے۔ اگر خوشی غم عداوت، محبت، نفرت
خوف و ہمدردی یہ سب جذبات ناپید ہو جائیں۔
تو دنیا میں ایک سناٹا ہو جائے۔ نہ گلاب کے
چمن سے فرحت ہو۔ نہ ببول کے بن سے وحشت
نہ شاما کے سحری نغموں سے روح بیدار ہو نہ کوے
کی بے ہنگام صدا کانوں پر بار ہو۔ نہ کسی سے
سننے کا اشتیاق ہو اور نہ کسی سے چھٹنا شاق ہو
ایک بے امتیازی کا عالم پیدا ہو جائے۔ جس میں
نہ ماں کو بیٹے سے محبت ہو۔ نہ بھائی کو بھائی سے
سے الفت ہو۔ نہ بچپن کے دوست اور نہ کسی
اجنبی میں امتیاز رہے۔ نہ اپنے بچے کی خوں
خاں اور ماں کی دل خروش گریہ و زاری میں
فرق ہو۔ مختصر یہ کہ اگر جذبات فنا ہو جائیں۔ تو
رشتے ٹوٹ جائیں، تعلق چھوٹ جائے زندگی
کی دلچسپیاں مٹ جائیں۔ سوسائٹی کی بنیادیں
ہل جائیں۔ معاشرت کی کلیں بگڑ جائیں۔ تہذیب
و تمدن کے کارخانے بند ہو جائیں۔ اور انسانیت
و حیوانیت کے بیچ میں ایک دھندلا سا خط فاصل
باقی رہ جائے۔ انسانوں کو حیوانوں پر جو
فضیلت ہے وہ صرف عقل کی بنا پر نہیں۔
جذبات بھی انسان کا طرۂ امتیاز ہیں یہی جذبات
جب لفظوں کا لباس پہن لیتے ہیں تو شعر
کہلاتے ہیں۔

(ہماری شاعری)

جذبات کی اس افادیت اور اس کی وسعت کا کوئی بھی انسان
بحیثیت انسان انکار نہیں کر سکتا ہے۔ اور دانشور طبقہ تو
اس سے انکار کے بارے میں سوچ ہی نہیں سکتا ہے۔ جذبات
کا شاعری سے اسی قسم کا تعلق ہے۔ جیسا کہ روشنی کو سورج
سے اور خوشبو کو گلاب سے ہے۔ ہر شاعر کے یہاں جذبات
پائے جاتے ہیں۔ جس شاعری میں جذبات کی رنگا رنگی نہ ہو
وہ شاعری نہیں بلکہ محض تک بندی ہے۔ میر و غالب، آتش و
ناسخ، ذوق و داغ، انیس و نسیم سب کے یہاں جذبات
کی شدت نظر آتی ہے۔ کسی کے یہاں کم اور کسی کے یہاں زیادہ
ہے۔ بہر حال جذبات ہے ضرور۔
میر تقی میر نے درد و غم، رنج و محن اور سوزش عشق جمع
کیا۔ تو ان کا دیوان بنا۔ فانی اپنے غموں میں اس طرح ڈوب
گئے کہ ان کی امیدیں ٹوٹ گئیں اور یاس و ناامیدی میں گھر گئے
تو امام یاسیات کہلائے۔ حسرت موہانی نے جذبات کی دنیا
سے متاثر ہو کر شاعری کی تو شاعر جذبات کہلائے۔

مجھ کو شاعر نہ کہو میر کہ صاحب میں نے
درد و غم کتنے کئے جمع تو دیوان کیا

گویا میر کی شاعری میں جذبات ہی جذبات ہیں۔ ان کا کوئی
شعر جذبات سے عاری نہیں ہے۔ دہلوی شعراء کے نزدیک
جذبات ہی جذبات ہیں، واردات قلب ہیں اور یہی جذبات
و واردات ان کی شاعری کا عام رنگ ہے۔ البتہ لکھنوی
دبستان شاعری میں جذبات کم اور الفاظ کی تراش و خراش
زیادہ پائی جاتی ہے۔ چونکہ مولانا حسن بریلوی دہلوی دبستان

شاعری سے تعلق رکھتے تھے اس لئے ان کی شاعری میں جذبات کی فراوانی اور اس کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کے دونوں دیوان میں یہی رنگ غالب ہے۔ ان کی شاعری کے حوالہ سے جذبات کو سمجھنے سے قبل آیئے جذبات کو سمجھتے ہیں کہ وہ کیا ہیں اور ان کی کتنی صورتیں پائی جاتی ہیں۔

جذبات کی حقیقت

جذبات کو انگریزی میں (EMOTIONS) کہتے ہیں۔ جذبہ ایک طاقتور اور شدید احساس کا نام ہے۔ اس سے جسم کے اندرونی اور بیرونی اعضاء متاثر ہوتے ہیں۔

جذبات ایک طاقتور اور شدید احساس ہے کیونکہ شدید جذباتی حالت میں انسان کے اندر کئی طرح کی ظاہری اور اندرونی تبدیلیاں اور مجموعی ہیجانی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اس لئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ جذبہ کسی فرد میں پورے جسمانی نظام کی ہیجانی کیفیت کا نام ہے جب کوئی فرد شدید جذباتی حالت میں ہوتا ہے تو اس کے اعضاء کے اندرونی افعال میں نمایاں تبدیلیاں آجاتی ہیں۔ ظاہری طور پر بھی کئی طرح سے جذباتی اثرات دیکھے جاسکتے ہیں۔ مثلاً چہرہ سرخ ہوتا ہے۔ مٹھیاں بھینچ لینا، جسم کا تھرتھرانا چیخنا، ہنسنا وغیرہ۔

(تعلیمی نفسیات کے نئے زاویے)

جذبہ ایک پیچیدہ عمل ہے جس کے مطالعہ کرنے میں کئی ایک طرح کی دشواریاں حائل ہوتی ہیں۔ کیونکہ اس سے کئی ایک نفسیاتی پہلو سے متعلق ہوتے ہیں۔ غائر نظر سے اگر اس کا مطالعہ کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ کسی بھی ابھرنے والے جذبہ کا تعلق انسانی کردار سے ہوتا ہے۔ مثلاً مشاہدات سے، تجربات سے یا پھر اکتسابات سے اور پرانی یادوں سے۔ جب تک ان متعلقات کا مطالعہ نہ کیا جائے تو جذبہ کا کماحقہ ادراک نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسری دشواری یہ آتی ہے کہ اب تک یہ طے نہیں ہو پایا ہے کہ جذبہ کی کتنی قسمیں ہیں۔؟ کسی نے دو کہا ہے اور کسی نے تین۔ پھر یہ کہ دو کہنے والوں میں بھی اختلاف ہے۔ کسی نے جذبہ کی دو قسم۔ اعلیٰ اور ادنیٰ بتاتی ہے۔ اور کسی نے ابتدائی جذبات۔ اور ماخوذ جذبات سے تعبیر کیا ہے اور جن لوگوں نے جذبات کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ وہ یہ ہیں۔

۱۔ غصہ ۲۔ خوف ۳۔ محبت

اور بعض لوگوں نے جذبات کی تین شدید حالتیں بتائی ہیں۔ جیسا کہ حالی کی تنقید پر تبصرہ کرتے ہوئے وحید قریشی صاحب لکھتے ہیں

> چونکہ آریائی ادب میں کسی جذبے کی واضح صورت ہی کی عکاسی عام طور پر ممکن تھی اور جذبات کی صرف تین شدید حالتیں یعنی انتہائی غم، انتہائی غصہ اور انتہائی مسرت۔

(مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۵۔)

شاعری میں عام طور پر دو ہی قسم کے جذبات کا اظہار ملتا ہے انتہائی غم یا انتہائی مسرت، خوف یا ڈر کا اظہار بہت کم ملتا ہے آیئے اب مولانا حسن کی شاعری میں جذبات کو تلاش کرتے ہیں مولانا حسن بریلوی جب ہجر و فراق کی منظر کشی کرتے ہیں تو شدید غم میں درد و تڑپ، کرب و بے چینی اور بے قراری وغیرہ ہجر و فراق کے اثرات ہیں۔ مثلاً مولانا حسن فرماتے ہیں۔

۱۔ ساقی خمارِ ہجر کی شدت سے غش ہوں میں
چھینٹا دے موہنہ پر اب تو شراب وصال کا

۲۔ سنگِ غمِ فراق سے دل پر چوٹ نہ لگا
آئینہ ٹوٹ جائے گا تیرے جمال کا

۳۔ میری میت پہ وہ موہنہ ڈھانکے ہوئے بیٹھے ہیں
کوئی پوچھے تو کہ اب کس سے حیا ہوتی ہے

۴۔ افسوس دستِ شوق نے پائی نہ دسترس
باہیں گلے میں ڈالنے کو ہار ہو گئے

۵۔ دل جاں بلب جگر میں تپک جاں بے قرار
ہم تیرا نام لے کے گنہگار ہو گئے

۶۔ افسردہ خاطری کا سبب ہے ترا فراق
مرجھا گئے جو تجھ سے جدا ہار ہو گئے

۷۔ وائے تقدیر کہ تم اوس کو حنا سمجھے ہو
چٹکیوں میں جو ملا جائے مرا دل ہے وہی

۸۔ مل کر اوس شوخ سے بے چین کیا قہر کیا
جس پہ ہم ناز کیا کرتے تھے یہ دل ہے وہی

۹۔ پس پشت بھی ملیں خاک میں تمنا ہیں
وہ خاک ہوں جو ترے قدموں سے لگا ہی رہے

۱۰۔ آنکھیں ترس رہی ہیں طبیعت نڈھال ہے
تیرے فراق میں ہمیں جینا محال ہے

۱۱۔ حال شب غم کا پوچھنا کیا۔؟
جس طور سے ہو سکی سحر کی

۱۲۔ منزل بہت بعید ہے طاقت نہ زاد راہ
یارب مدد غریب کی حالت تباہ ہے

۱۳۔ کہو تو اے حسن کیوں روتے ہو کیسی گزرتی ہے
ہنسی سمجھے تھے دل دے کر نکلنا کوئے جاناں سے

ان اشعار کو پڑھئے، ان میں شدید غم اور انتہائی درجہ کی حسرت وافسوس کا احساس ہوتا ہے۔ اُن کی شاعری میں یہی جذبۂ غم کی شدت پائی جاتی ہے۔ ان کی شاعری میں کوئی شعر ایسا نہیں ہے کہ جس کا رشتہ غم کی دنیا سے جڑا ہوا نہ ہو۔ اسی بنیاد پر میں کہتا ہوں کہ مولانا حسن بریلوی انتہائی غم کے اعلیٰ درجہ پر فائز ہیں۔ اور اسی وجہ سے آپ کی شاعری اور دیگر شاعروں کے کلام سے ممتاز نظر آتی ہے۔ اس کے علاوہ آپ کی شاعری میں حیرت وتعجب کا بھی جذبہ کہیں کہیں پایا جاتا ہے۔ جو ان کی شاعری کا مطالعہ کرنے والوں سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اب آیئے اور اس بات کا اندازہ لگایئے کہ ان کی شاعری میں نشاط وسرور اور فرحت و انبساط کس حد تک پایا جاتا ہے۔

۱۔ کون کہتا ہے آپ آئیں مسیحا بن کر
کیا مریضوں کی عیادت بھی بری ہوتی ہے

اس شعر میں اگرچہ جذبۂ غم واندوہ اور رنج ومحن کا تذکرہ ہے لیکن اس کے ایک گوشہ سے نشاط وامید کی جو کرن نظر آتی ہے اس سے شعری کیفیت میں مزید اضافہ ہو جاتا ہے۔

۲۔ اے جان گل گزرتے ہیں جس رہگذر سے آپ
کہتی ہیں نکہتیں کہ گئے ہیں ادھر سے آپ

۳۔ احباب کو حسن وہ چہکتی غزل سنا!
ہر لفظ سے ہو جس کے نمودار آفتاب

۴۔ چشم ظاہر سے رُخ یار کا تماشا دیکھا
آنکھیں جب پھوٹ گئیں تب یہ تماشا دیکھا

۵۔ گنگ وحیرت زدہ سب دیکھنے والے پائے
بن گئے آپ تماشا وہ تماشا دیکھا

۶۔ دیکھنے والے ترے لاکھ زباں بند رکھیں
آنکھیں کہہ اٹھتی ہیں ہم نے وہ تماشا دیکھا

اور نعتیہ کلام میں مولانا حسن بریلوی پر کیف وسرور کا ایسا عالم طاری ہوتا ہے کہ وہ اسی میں کھو جاتے ہیں اور مدینہ کی ہر چیز میں انھیں محبوب کا جلوۂ زیبا نظر آتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ جنت اور فردوس بریں پر خار مدینہ، صحرائے طیبہ کو فضیلت دیتے ہیں۔ ذرا انداز تو دیکھئے، کیا فرماتے ہیں۔

۷۔ عجب رنگ پر ہے بہار مدینہ
کہ سب جنتیں ہیں نثار مدینہ

۸۔ مبارک رہے عندلیبوں تمہیں گل
ہمیں گل سے بہتر ہے خار مدینہ

۹۔ جدھر دیکھئے باغ جنت کھلا ہے!
نظر میں ہے نقش و نگار مدینہ

۱۰۔ کیا بات تمہارے نقش پا کی ہے
ہے تاج سر وقار آقا

۱۱۔ وہ مشکل ہے واہ واہ تمہاری
اللہ کو آئے پیار آقا

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کی شاعری جذبات سے لبریز ہے۔ یہی سبب ہے کہ ان کی شاعری میں ایک قسم کی سحر کاری پائی جاتی ہے۔

معذرت

ڈاکٹر محسن علی ماوری گونڈوی کی کوشش و تحریک پر جناب نیاز اللہ سحر گونڈوی نے ایک قیمتی مضمون تحریر کیا تھا، مگر وہ ضائع ہو گیا، لہٰذا ہم جناب سحر گونڈوی سے معذرت خواہ ہیں۔ نیز کئی تمام مضامین کی کتابت کے بعد کچھ مضامین موصول ہوئے۔ مگر ہم انکو شامل اشاعت کرنے سے قاصر ہیں۔ اور ان سبھی مضمون نگار حضرات کا شکریہ ادا کرتے ہیں۔

(ادارہ)

فکر و تخیل

گزشتہ اوراق سے واضح ہو گیا کہ مولانا حسن بریلوی کے دل میں جذبات کا ایک سمندر ہے جو موجیں مار رہا ہے۔ اور تلاطم برپا کر رہا ہے۔ کہیں وہ شدت غم سے دوچار ہیں تو کہیں سرور و انبساط اور کیف و نشاط سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ لیکن شاعری میں جو جذبات الفاظ کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ وہ صرف جذبات و احساسات ہی نہیں ہوتے ہیں بلکہ فکر و تخیل کی آتش سوز ان میں پک کے آتے ہیں اور اس کی بھٹی سے سلگ کر آتے ہیں۔ جیسا کہ باکرن کا خیال ہے۔

شعر تخیل کی جلتی ہوئی آگ کا لاوا ہے جس کے پھٹ
پڑنے سے زلزلہ آتے آتے رک جاتا ہے

(لفظ و معنی ص ۱۴۴، از شمس الرحمان فاروقی)

اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ جذبات اور فکر و تخیل کے امتزاج سے ہی شاعری میں عظمت آتی ہے اور ادب العالیہ کی تخلیق ہوتی ہے۔ جب تک شاعری میں یہ صورت حال نہ ہو وہ شاعری کیا ہے؟ صرف تک بندی اور الفاظ کا گورکھ دھندا ہے۔ حضرت مولانا حسن بریلوی کی فکری پرواز کیا تھی۔؟ ان کا تخیل کس قدر بلند تھا۔؟ اس کی وضاحت ضروری ہے۔ تخیل کی تعریف کرتے ہوئے فاروقی صاحب لکھتے ہیں۔

تخیل سے مراد وہ قوت ہے جو مختلف اسباب
افکار کو ایک رشتے میں پرو سکتی ہے۔ یعنی
انسانی ذہن کی وہ صلاحیت جو غیر متعلق چیزوں
کو منسلک اور مضبوط کر سکتی ہے۔

(لفظ و معنی ص ۲۵)

ور الطاف حسین حالی صاحب بیان کرتے ہیں کہ:

تخیل وہ ایک ایسی قوت ہے کہ معلومات کا
ذخیرہ جو تجربہ یا مشاہدہ کے ذریعہ ذہن میں پہلے
سے مہیا رہتا ہے اس کو مکرر ترتیب دے کر
ایک نئی صورت بخشتی ہے اور پھر اس کو الفاظ
کے دلکش پیرایہ میں جلوہ گر کرتی ہے۔

(مقدمہ شعر و شاعری ص ۱۱۴)

حالی کے بیان سے واضح ہوتا ہے کہ شاعر کے دل میں جو جذبات احساسات، تجربات یا مشاہدات کے ذریعہ ابھرتے ہیں وہ پہلے اس کا اپنی قوت تخیل سے ادراک کرتا ہے۔ اور اس کا عرفان و اظہار کرتا ہے پھر اس میں دوبارہ ترتیب دے کر نئی صورت سے اسے آشنا کرتا ہے۔ مولانا حسن بریلوی میں یہ کیفیت کس حد تک پائی جاتی تھی۔؟ اس کا اندازہ صرف اس شعر سے لگایا جا سکتا ہے۔ کہ

انگلیاں کانوں میں دے دے کے سنا کرتے ہیں
خلوت دل میں عجب شور ہے برپا تیرا

مولانا کے خلوت میں کیا ہے؟ ایک شور برپا ہے۔ رگ رگ میں ایک خلش ہے۔ جو رہ رہ کے چبھ رہی ہے۔ ظاہر ہے یہ شور اور کسی کا نہیں ہے۔ بلکہ محبوب دو عالم نور مجسم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر کا ہے۔ یہ شور دل میں کہاں سے آیا۔؟ یہ شور و خلش کس طرح پیدا ہوئی ہے۔؟ صرف نسلی تجربات کی بنیاد پر اور خاندانی اثرات کی وجہ سے۔ لیکن یہ شور عام شور کی طرح نہیں ہے۔ کہ اس کو چلتا کر دیا جائے۔ بلکہ عجب نرالا اور انوکھا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ مولانا اس شور کو کانوں میں انگلیاں دے دے کر سنتے ہیں۔ تاکہ مکمل طور پر اس کا وجدان اور عرفان حاصل ہو سکے۔ اس وجدانی کیفیت کو مولانا نے جس طرح بیان فرمایا ہے اس سے یہ اندازہ لگانا بعید نہیں ہے کہ موصوف کی قوت وجدان بلند و بالا ہے اور ان کا فکری رویہ قابل دید ہے۔ اس کیفیت کا وجود دو طریقوں سے ہوتا ہے۔ اولاً جذبات و احساسات دھیرے دھیرے فکر و تخیل کی آتش سوزاں میں لاوا کی طرح پکتے ہیں اور الفاظ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ثانیاً فکری مضامین میں جذبات کی آنچ جھلس جھلس کر الفاظ کے روپ میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اول الذکر صورت میں وہ شاعری وجود میں آتی ہے۔ جس میں جذبات کی فراوانی ہوتی ہے۔ واردات قلب اور کیفیات دل کی لہریں اٹھتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اور ان لہروں کیساتھ تخیلات کی رنگین فضا بھی نظر آتی ہے۔ مولانا حسن بریلوی کی شاعری کا یہی رنگ ہے۔ اسی رنگ کا سبب ہے کہ ان کی شاعری پڑھتے تو قلب و جگر پر ایسا کیف طاری ہوتا ہے کہ قلب گم ہو جاتا ہے۔

اور قاری و سامع دونوں پر جذبہ بے خودی طاری ہو جاتی ہے۔
اور ثانی الذکر کی صورت میں وہ شاعری تخلیق پاتی ہے جس میں
افکار نو کی فضا بندی ہوتی ہے اور اس کے ساتھ جذبے کا بھی
عمل ہوتا ہے۔ جیسا کہ اقبال کی شاعری میں منظر آتا ہے۔ مولانا
حسن بریلوی نے اس میدان میں شاعری کی۔ لیکن بہت کم کی ہے
مولانا خود فرماتے ہیں۔

شرف اور رشک کے کہنے سے کچھ تک بندیاں کر لیں
حسن افکار میں ہم سے دو غزلا ہو نہیں سکتا

شرف اور رشک دونوں مولانا کے بے تکلف دوستوں میں سے
تھے ان کے کہنے سے تو اس قسم کی شاعری کی۔ لیکن اس میں
وہ کامیابی نصیب نہ ہوئی جیسی کامیابی آپ کو جذبات کی شاعری
میں ملتی ہے۔ جس غزل کا یہ مقطع ہے اس کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱۔ ہزاروں خواہشیں دل میں چھپائے کس طرح کوئی
مری جان تم سے اک جوبن کا پردا ہو نہیں سکتا
۲۔ مرے دکھ دینے والے کیوں وہ قسمیں یاد ہیں تجھ کو
تری تکلیف تیرا دکھ گوارا ہو نہیں سکتا!
۳۔ مریض ہجر کو تم نے عبث جھگڑے میں ڈالا ہے
یہی کہہ دو کہ اب ہم سے یہ اچھا ہو نہیں سکتا
۴۔ وہ دل دیں نہ بوسہ دیں عجب الجھن میں ڈالا ہے
یہاں پاس مروت سے تقاضا ہو نہیں سکتا
۵۔ فراق دائمی اس وصل کے پردے میں پنہاں ہے
کسی کے دل سے مل کر دل سے ملنا ہو نہیں سکتا

ان اشعار میں تفکر کا مزاج پایا جاتا ہے اور فلسفیانہ خیالات پائے
جاتے ہیں۔ کیوں۔؟ اور کس طرح۔؟ جیسے الفاظ گہرے فلسفیانہ
مضامین کی علامات ہیں۔ اسی طرح مولانا کا یہ فرمانا کہ "عبث
جھگڑے میں ڈالا ہے" اور "عجب الجھن میں ڈالا ہے" اس
سے جو تصورات ذہن کے پردے پر ابھرتے ہیں وہ بنکر یہ
مضامین اور فلسفیانہ خیالات ہیں۔ وصل میں فراق دائمی کی جھلک
دیکھ لینا دقت نظر کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اور مولانا کے یہاں یہ
وصف پایا جاتا ہے۔ یہ دقت نظر اور یہ باریک بینی اس بات کی نشاندہی
کر رہی ہے کہ مولانا کی پرواز تخیل کس قدر بلند ہے۔ ان کا اشہب
فکر آسمانوں کی بے پناہ وسعتوں میں پرواز کرتے ہوئے
محسوس ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے یہاں مضامین بلند ہیں۔
لیکن پھر بھی یہ رنگ ان کے یہاں غالب نہیں ہے۔ بلکہ کہیں کہیں
ہے۔ اب آیئے مولانا موصوف کے یہاں جذبات و احساسات
اور جوش و جذبہ کے پردے میں تخیلات کا مطالعہ کرنے کی
کوشش کریں۔ لیکن اس سے قبل تخیل کی کارکردگی کیا ہوتی ہے؟
اس پر بھی ایک نظر ڈالتے چلیں۔ تخیل کی کارکردگی کا جب
ہم جائزہ لیتے ہیں۔ اس کی دیگر کرشمہ سازیوں کے ساتھ ساتھ
یہ بھی کارکردگی ہے۔ جسے ذیل میں بتایا جا رہا ہے۔

۱۔ مختلف تصورات و خیالات کے درمیان رشتۂ وحدت
کو برقرار رکھنا۔ یا پھر اسی رشتہ کو وجود عطا کرنا۔
۲۔ مدرکات سابقہ میں نئی ترتیب پیدا کرنا۔
۳۔ اور نئے نئے خیالات کو جنم دینا۔
۴۔ اسباب و علل کی تلاش و جستجو۔
۵۔ تصورات کے ساتھ ساتھ الفاظ کی سحر کاری میں بھی حصہ لینا۔

مولانا حسن بریلوی کی شاعری کا مطالعہ کیجئے۔ تو اس بات کا
اندازہ ہوگا کہ ان کی ہر غزل اور ہر نعت میں مختلف تصورات و
خیالات ہیں۔ کہیں وہ محبوب کی اداؤں کا ذکر کرتے ہیں۔ اور
کہیں ان کی صفات کا، کہیں لب و دندان کا بیان ہے۔ اور
کہیں زلف و رخسار کا، کبھی وہ ان کے حسن و جمال کا تذکرہ
کرتے ہیں۔ اور کبھی جلوہ رنگین کا، کسی مقام پر وہ اپنے محبوب
کے اخلاق مروت کو مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں اور کہیں
اس کے جور و ستم کا۔ غرض کہ مختلف خیالات و تصورات سے
وہ اپنے نگار خانے کو زیب و زینت بخشتے ہیں۔ لیکن ان
بکھرے خیالات اور منتشر افکار میں بھی وہ اپنی قوت تخیل سے
مدد لیتے ہوئے وقت کا ایسا گہرا رشتہ برقرار رکھتے ہیں کہ
طبیعت عش عش کر اٹھتی ہے۔ اسی لئے ان کی ہر غزل محبوب کے
زلف مسلسل کی یاد تازہ کرتی ہے۔ تو پھر آیئے۔ اور ان کے اس
جلوۂ رنگین کا مطالعہ کرتے ہیں۔

مختلف خیالات میں وحدت کی رنگینی

خیال ۱:۔ حسن بریلوی صاحب نے ردیف ہائے ہونا

میں ایک نعت کہی ہے جس میں مجموعی طور پر تیرہ اشعار ہیں۔ نثار، خار، وقار، افتخار وغیرہ قافیے ہیں۔ اور مدینہ ردیف ہے۔ اس نعت کا مطلع ہے۔

عجب رنگ پر ہے بہار مدینہ
کہ سب جنتیں ہیں نثار مدینہ

اس مطلع کو پڑھتے ہی ہر قاری کے ذہن میں یہ تصور ابھرتا ہے کہ اس نعت کا مرکزی خیال؛ مدینہ طیبہ کی بہاریں، دلآویزیاں اور حسن وجمال کی مختلف تصویریں اور چھوٹے بڑے خیالات ہوں گے۔ سب کا رشتہ کسی نہ کسی طرح اس مرکزی خیال سے جڑا ہوگا۔ مرکزی خیال اگرچہ "بہار مدینہ" ہے۔ لیکن بہار ایک وصف ہے اور یہ قائم بالذات نہیں ہوتا ہے۔ بلکہ اس کا قیام کسی نہ کسی شئی یا محل کے ساتھ ہوتا ہے ارباب علم و دانش سے مخفی نہیں ہے کہ بہار کا وجود کہاں ہوتا ہے۔ ظاہر ہے اس کا وجود گلشن اور چمن ہی میں ہوتا ہے۔ اس طرح مولانا حسن بریلوی نے "بہار مدینہ" کہہ کر چمن مدینہ مراد لیا ہے۔ اور اس کے مراد لینے میں ظاہر ہے تخیل کو دخل تام حاصل ہے۔ اس نعت میں مختلف خیالات یہ ہیں۔

خیال نمبر ۱ (۱) مبارک رہے عندلیبو تمہیں گل
ہمیں گل سے بہتر ہے خار مدینہ
(۲) رگِ گل کی جب نازکی دیکھتا ہوں
مجھے یاد آتے ہیں خار مدینہ

ان دو شعروں میں عندلیب، گل اور خار کا تذکرہ ہے۔ ظاہر ہے یہ چیزیں بہار مدینہ سے مختلف ہیں۔ لیکن ان تمام چیزوں کو "گلشن" سے جو نسبت ہے اور جو تعلق ہے اس کو کوئی ہوش مند انسان فراموش نہیں کر سکتا ہے۔ بس یہی تعلق رشتہ وحدت ہے۔ کیا وحدت کی یہ نوعیت فرضی ہے۔؟ کیا دروغ و کذب پر مبنی ہے۔؟ کیا اس میں مبالغہ آرائی سے کام لیا گیا ہے؟ نہیں اور ہرگز نہیں۔ بلکہ یہ صداقت پر مبنی ہے اور بالکل سچ ہے بس اسی صداقت سے ان شعروں میں شدت تاثیر پیدا ہو گئی ہے ظاہر ہے یہ سب تخیل کی کرشمہ سازیاں ہیں۔

خیال نمبر ۲ (۱) مری خاک یا رب نہ برباد جائے
پس مرگ کر دے غبار مدینہ
(۲) ملائک لگاتے ہیں آنکھوں میں اپنی
شب و روز خاک مزار مدینہ

ان دو اشعار میں "غبار" اور "خاک مزار" کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ اس سے اعلیٰ تخیل کی نشاندہی ہوتی ہے۔ کیونکہ اس میں غبار اور خاک مزار کا ذکر مشبہ بہ کی مناسبت سے نہیں بلکہ مشبہ کی مناسبت سے ہے۔ اور ارباب علم و دانش سے پوشیدہ نہیں ہے کہ مشبہ اور مشبہ بہ کے مابین اس قسم کی مناسبت اور ربط و تعلق کی تلاش بغیر قوت متخیلہ کے ممکن نہیں ہے۔

خیال نمبر ۳

۱۔ جدھر دیکھئے باغ جنت کھلا ہے
نظر میں ہے نقش و نگار مدینہ
۲۔ رہیں ان کے جلوے بسیں ان کے جلوے
مرا دل بنے یادگار مدینہ
۳۔ مرادِ دلِ بلبلِ بے نوا دے
الٰہی دکھا دے بہار مدینہ

ان اشعار میں شاعر نے جو خیالات و تصورات پیش کئے ہیں۔ وہ اگرچہ مطلع سے مختلف ہیں لیکن یک گونہ اس سے مناسبت رکھتے ہیں۔ ہر طرف باغ جنت کا کھلا ہوا دیکھنا سبز و شادابی سے محظوظ ہونا۔ اور پھر نظر میں مدینہ کی نقش و نگار کے سما جانے اور دل کو یادگار مدینہ بننے کی بات کرنا ظاہر ہے یہ کسی نہ کسی مناسبت کے وجہ ہے۔ مولانا حسن بریلوی کی اس ایک نعت میں مختلف خیالات و تصورات کا پایا جانا اور ان کے درمیان وحدت کو قائم رکھنے کے لئے کہیں مشبہ اور مشبہ بہ کے مابین نسبت پیدا کرنا۔ ان کی قوت تخیل کی پرواز کی بات ہے۔ اس سے مولانا کی شاعری میں جو نکھرا ہوا رنگ نظر آتا ہے۔ اس سے ان کی شاعری کہیں سے کہیں پہونچ گئی ہے۔ گویا زمین اور اس کی ارضی حیثیت سے اوپر اٹھ کر عرش اعظم کے جلوؤں میں نہا رہی ہے۔ یہ صورت صرف ان کی ایک نعت میں نہیں بلکہ ہر نعت اور ہر غزل میں پائی جاتی ہے۔

اعلیٰ تخیل کی کارکردگی کی دوسری صورت ہے۔

مدرکات سابقہ میں نئی ترتیب پیدا کرنا

مدرکات سابقہ سے مراد وہ معلومات ہیں جو شاعر کے ذہن میں شعری تخلیق سے پہلے پائی جاتی ہوں۔ ان میں ایک نئی ترتیب پیدا کرنا جس سے جدید نتیجہ بر آمد ہوتا ہے۔ یہ وہ وصف ہے جس سے شاعری میں خوب سے خوب تر بات آتی ہے۔ اسی کو شاعری کی زبان میں پامال مضامین کو اچھوتے انداز میں پیش کرنا کہتے ہیں۔ جن سے شاعر کا شمار بڑے شاعروں میں ہوتا ہے۔

اسد بدایونی کے بقول مولانا کی شاعری میں اس قسم کی کوشش نظر آتی ہے۔ لیکن اس میں وہ کس قدر کامیاب ہوتے ہیں۔ اس کا فیصلہ قارئین ہی کریں گے۔ مدرکات سابقہ میں مفرد تصورات بھی آتے ہیں اور مرکبات خیالات بھی۔ مفرد تصورات کی مثال میں اس شعر کو پیش کیا جا سکتا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں

دل میں یا انجمن میں یا آنکھوں میں
تھی غرض دیکھنے سے ہمکو کہیں دیکھ لیا

ہر غزل گو شاعر عاشق مزاج ہوتا ہے۔ وہ کسی نہ کسی کو اپنا معشوق بناتے ہیں اور ان کے غمزہ و ادا نیز ان کی عشوہ طرازی کے وہ قتیل ہوتے ہیں۔ اور محبوب کی دید کا طالب ہونا یہ ان کا فطری جذبہ ہوتا ہے۔ فرہاد طالب دید ہی تو تھا کہ جس کی آرزو میں انہوں نے جان جوکھم والا کام انجام دیا ہو اور موت سے کھیلنے کے لئے تیار ہو گئے۔ یہ فرہاد ہی کا عزم و حوصلہ تھا کہ انہوں نے جوئے شیر جاری کرنے کا بیڑا اٹھایا۔ مجنوں نے خاک کس لئے چھانی۔ اس لئے کہ وہ لیلٰی کو ایک نظر دیکھ لے۔ ہر شاعر کے یہاں یہ جذبہ پایا جاتا ہے۔ کہ وہ محبوب کی دید کی باتیں کرتے ہیں اور وصال کی تمنائیں کرتے ہیں۔ لیکن قریب قریب ہر شاعر نے محبوب کو چشم سر سے دیکھنے کی بات کی ہے۔ اور آمنے سامنے زیارت کو اہمیت دی ہے۔ یہ تمام چیزیں مولانا موصوف کے ذہن میں موجود تھیں۔ لیکن انہوں نے ان مدرکات و معلومات میں جس طرح نئی ترتیب پیدا کی ہے۔ وہ فخر کی بات ہے۔ اور ان کے اعلیٰ تخیل کو پیش کرتی ہے۔

دل میں یا انجمن میں یا آنکھوں میں
تھی غرض دیکھنے سے ہم کو کہیں دیکھ لیا

مولانا حسن بریلوی کے نزدیک صرف محبوب کو دیکھنا ہے۔ کہیں بھی دیکھ لیجئے۔ دل میں دیکھئے یا انجمن میں یا پھر کسی کی آنکھوں میں دیکھئے۔ دید کا یہ معنی کس قدر وسیع اور پُر لطف [illegible] اس کا اندازہ ایک شاعر ہی لگا سکتا ہے۔ مگر یہ دید [illegible] دیدوں سے افضل و اعلیٰ ہے۔ دید میں یہ افضلیت [illegible] ہے۔ صرف مولانا کی قوت فکریہ کی وجہ سے آئی ہے۔ مرکب تصورات میں ہم صرف اس قدر کہیں گے۔ شاعری کی [illegible] روایت یہ رہی ہے کہ ہر شاعر نے اپنے محبوب کی آمد کو مسیحا کی آمد سے تعبیر کیا ہے۔ اور ان کے آنے سے مریض عشق پہ جو اثر ہوتا ہے۔ کہ بیمار عشق کے چہرہ و رخ پر رونق آجاتی ہے۔ لیکن مولانا حسن بریلوی نے اس عام تصور سے ہٹ کر بات کی ہے۔

کون کہتا ہے کہ آپ آئیں مسیحا بن کر
کیا مریضوں کی عیادت بھی بری ہوتی ہے

وہ محبوب کی آمد کو مسیحا کی آمد سے تعبیر نہیں کرتے بلکہ انسانیت کے ناطے وہ اس آمد کو مزاج پرسی سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیا یہ اچھوتا خیال نہیں ہے۔؟ کیا اس میں ایک طرح کا بانکپن نہیں ہے۔ بالکل ہے یقیناً یہ سب کیا ہے۔؟ صرف تخیل کی کرشمہ سازیاں ہیں۔ اور بس۔!

نئے نئے خیالات جنم دینا

مولانا حسن بریلوی نے اپنی شاعری میں نئے نئے خیالات لانے کی کامیاب کوشش کی ہے اور ان کی شاعری میں جو معنی آفرینی ہے۔ خیالات کی جو جدت ہے۔ اس کو فراموش نہیں کیا جا سکتا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار سے اس کی بخوبی وضاحت ہوتی ہے۔ ملاحظہ فرمایئے۔

۱۔ اپنا ہی تصور ہے نہیں تم سے دور ہیں
تم تو ہمارے ساتھ رہے ہم جدھر گئے

۲۔ رنگین مزاج ہیں یہ ترے قسلوں کے دل
زخموں سے باغ تھے جو لیے تو حنا ہو گئے

۳۔ یہ حسن خود فروش عجب جنس ہے حسن
وہ بک گئے جو اس کے خریدار ہو گئے

حسن بریلوی کی شاعری میں عشق کا تصور

مولانا سید اکمل اجملی نائب سجادہ نشین دائرہ شاہ اجمل الہ آباد

حسن و عشق اردو شاعری کی وہ بنیاد ہے جس پر شعر و سخن کی عمارت مدت ہائے دراز سے سر اٹھائے کھڑی ہے۔ خاص طور سے غزل کا تو حسن و عشق سے چولی دامن کا ساتھ ہے بقول آل احمد سرور غزل ایک وحشی صنف سخن ہے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ غزل کے وجود کی باعث عربی قصائد کی تشبیب ہے۔ جس میں شعراء اپنے افسانۂ عشق کو بیان کرتے تھے۔ اس لئے یہ کہنے میں مجھے قطعی عار نہیں کہ غزل حسن و عشق کے امتزاج و اتصال سے عالم وجود میں آئی۔ اردو غزل سے ان دو کو الگ کر دیجئے تو غزل کا وجود ہی ختم ہو جائے۔ غزل کو جنسیات سے الگ کر کے سوچا ہی نہیں جا سکتا جس سے متاثر ہونا ہر فرد کی میراث ہے۔ حساس انسان جسے پروردگار عالم نے تخلیقی صلاحیت بھی عطا کی ہے وہ حسن سے بہ نسبت ان لوگوں کے جو تخلیقی صلاحیت کے مالک نہیں ہیں کچھ زیادہ ہی متاثر ہوتا ہے اور جس طرح سے وہ اظہار کرتا ہے دوسرے اس انداز میں اپنے تاثرات کے اظہار سے قاصر ہیں۔ وہ حساس انسان شاعر ہے جو اپنے خیالات، اپنے تصورات، اپنے جذبات اور اپنے تجربات کو بہتر سے بہتر انداز میں اپنی تخلیق میں پیش کرتا ہے۔ یہ بات صرف اردو شاعری تک ہی محدود نہیں بلکہ دنیا کی تمام زبانوں کی شاعری میں حسن و عشق کو بڑی اہمیت حاصل ہے اور ان دونوں کا ایک دوسرے سے ایسا گہرا تعلق ہے کہ انھیں جزو لاینفک کی حیثیت حاصل ہے۔

غزل کے خلاف بہت سی تحریکیں وجود میں آئیں جن سے متعلق شعراء نے غزل کو حسن و عشق کی فضا سے نکالنے کی کوشش کی مگر وہ کامیاب نہ ہو سکے نہ ان کی شاعری کو کوئی بڑا مقام حاصل ہو سکا۔ صرف تصوف ایک ایسی تحریک ہے۔ جس سے غزل سب سے زیادہ متاثر ہوئی اور جس نے اعتدال کا راستہ اختیار کیا اور عشق مجازی سے عشق حقیقی کی طرف غزل کے دھارے موڑے مگر وہ غزل کی اس روایت کو بدل نہ سکا بلکہ اس کو ایک اور روح عطا کر دی۔ سارے معاملات وہی رہے مگر ان اشعار کی تشریح کچھ ایسے انداز میں کی اور ایسے ایسے نکات غزل کے پیکر کو عطا کئے جو تصوف یا عشق حقیقی کی طرف ذہن انسانی کو متوجہ کر سکیں۔ مگر جہاں تک فضا کا تعلق ہے وہ جوں کی توں موجود رہی۔ وہی ہجر و وصال، وہی رندی و سرمستی، وہی واردات قلبیہ کا اظہار مگر ساتھ ہی کچھ ایسے نکات بھی رہے جنھوں نے اسے صوفیانہ رنگ میں ڈھالنے کی کوشش کی۔ اور ایسے شعراء کامیاب بھی ہوئے۔ میر درد اور اصغر گونڈوی ایسے شعراء میں اہمیت کے حامل ہیں۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی شاعر اس تحریک سے اپنا دامن نہیں بچا پایا۔ غرض کہ غزل عشق مجازی و عشق حقیقی کا معجون مرکب بن گئی۔ لیکن کچھ شعراء صرف اور صرف عشق مجازی سے ہی اپنی غزل کو سجاتے رہے۔ ان ہی میں داغ دہلوی بھی ہیں۔

داغ دہلوی کی شاعری بھی ہمیں اسی تناظر میں سوچنے کی دعوت دیتی ہے۔ ان کی شاعری میں حسن مجازی کے جلوے ہیں۔ انھوں نے غزل کو اس نگاہ سے نہیں دیکھا جس انداز سے صوفی شعراء دیکھتے تھے۔ داغ جیتے جاگتے انسان اور گوشت و پوست والے معشوق کی قربت کے قائل تھے۔ ان کا معشوق اسی دنیا کا فرد تھا۔ چنانچہ ان کے یہاں وہ سارے لوازمات موجود ہیں جو عشق مجازی کی طرف ہی رہنمائی کرتے ہیں۔ یہ بات صرف داغ کے یہاں ہی نہیں بلکہ کم و بیش ہر شاعر کے یہاں کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ اگر ہم ساری اردو شاعری

کا محاسبہ کریں تو ہمیں ہر شاعر کے یہاں وافر تعداد میں ایسے
اشعار ملیں گے جو اس کی حسین بوالہوسی، اذیت کوشی، کچھ
پالینے کی خاطر ڈھول دھپیا دھینگا مشتی، بوس و کنار، وصال
و قربت سب کچھ مل جائے گا۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ
کیا ہر شاعر کسی نہ کسی صورت میں بوالہوس ہے، اذیت کوش
ہے اوچھے پن اور شعلہ مزاج کا مالک ہے۔ یہیں پر ہمیں حالی
کی وہ بات یاد آتی ہے کہ شاعری کے لئے عشق و محبت کا ہونا
ضروری ہے۔ کسی کے عشق میں گرفتار ہونا ناگزیر ہے اور اگر
اس کے یہاں ان جذبات کے سوتے سوکھ گئے ہیں تو شاعری
کے لئے ضروری ہے کہ وہ مصنوعی عشق کرے اور تصوراتی
طور پر وہ ساری فضا اپنے اوپر طاری کرے جو ایک عاشق کے
یہاں پائی جاتی ہے۔ ہمیں داغ دہلوی کے یہاں یہ فضا اپنے
عروج پر نظر آتی ہے۔ ان کی شاعری کے مطالعہ کے بعد یہ نتیجہ
اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ اپنے دور کے بڑے بوالہوس
اذیت کوش اور شعلہ مزاج کے مالک تھے۔ حالانکہ ان کی زندگی
کا مطالعہ ان تمام باتوں کی نفی کرتا ہے۔ یہ بات صرف داغ
دہلوی تک ہی محدود نہیں بلکہ اکثر شاعروں کی حیات اور شاعری
ایک دوسرے کی تضاد ہے۔ مثلاً ریاض خیرآبادی کی شاعری
ان کو رندوں اور سرمستوں کا امام بناکر پیش کرتی ہے لیکن یہ
حقیقت ہے کہ انہوں نے اس کمبخت کو منہ ہی نہیں لگایا۔ کبھی
چکھا ہی نہیں لیکن خمریات کے سارے لوازمات اور ساری
فضا ان کی شاعری میں موجود ہے۔

داغ دہلوی کے تلامذہ میں ایسے شعراء کی تعداد کافی ہے
جو بہت مشہور ہوئے ان میں ڈاکٹر اقبال، سائل دہلوی، نوح
ناروی اور حسن بریلوی کے نام قابل ذکر ہیں۔ اقبال فطری
طور پر نظم کے شاعر ہیں۔ چونکہ فلسفہ ان کا خاص موضوع تھا۔
اس لئے ان کی شاعری کی ہیئت ہی دوسری ہے۔ وہ شاعر
کم اور مبلغ زیادہ نظر آتے ہیں۔ میری ذاتی رائے ہے کہ
اقبال کے یہاں غزل اتنی اس صورت میں موجود نہیں، جس
صورت میں داغ کے یہاں یا داغ کے دوسرے تلامذہ کے
یہاں ہوسکتی ہے میری اس رائے سے اختلاف کیا جائے
اقبال بین الاقوامی حیثیت کے شاعر ہیں۔ ان کی شاعری عظیم ہے
اس میں کوئی دو رائے نہیں لیکن غزل کے جو فطری تقاضے
ہیں وہ عشق ان کے یہاں کم نظر آتے ہیں۔ سائل دہلوی کے
یہاں بھی داغ اسکول کی لوری نہیں ملتی لیکن کافی
حد تک وہ اسکول کے قریب ہیں۔ نوح ناروی نے صرف
زبان کا خیال رکھا اس لئے فکری گہرائی ہمیں ان کے یہاں
نہیں ملتی مگر زبان کے سلیقہ میں نوح کی حیثیت مستند ہے۔
جہاں تک حسن بریلوی کا تعلق ہے وہ داغ دہلوی
کے شاگرد اور داغ اسکول کے مستند شاعر کی حیثیت رکھتے
ہیں۔ داغ اسکول کے سارے لوازمات بھی حسن بریلوی کے
یہاں پائے جاتے ہیں۔ ان کا معشوق بھی اسی گوشت و
پوست کا انسان ہے۔ حسن اسی گوشت و پوست کے انسان
سے محبت کرتے ہیں۔ مگر ان کے یہاں داغ کا چلبلا پن
نہیں بلکہ ایک متانت و سنجیدگی پائی جاتی ہے اور وقار
کی کارفرمائی نظر آتی ہے۔ جو اول تا آخر قائم رہی۔ ان کا معشوق
انھیں کسی منزل پر لاکر کھڑا کر دیتا ہے۔ خود حسن بریلوی
کی زبان سنیئے۔ ؎

دیکھو تو حسن لوگ تمہیں کہتے ہیں کیا کیا
کیوں عشق کیا آپ نے اس دشمن دیں سے

بات غزل کی اپنی ایک مخصوص فضا کی چل رہی تھی۔ حسن
بریلوی بھی اس فضا سے پہلو نہیں بچا پاتے۔ یہ بات صرف
حسن ہی تک محدود نہیں بلکہ بڑے بڑے شعراء اس فضاء
سے اپنے کو نکال نہ سکے۔ بہت سی مثالیں غزل کے اشعا
میں آپ کو مل جائے گی۔ جہاں جتنی بوالہوسی بھی ہے اذیت
کو اتنی بھی پیش دستی بھی ہے۔ اور کچھ حاصل کر لینے کے
خواہش بھی۔ ؎

ہم سے کھل جاؤ بوقت مے پرستی ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے رکھ کر عذر مستی ایک دن
ڈھول دھپا اس سراپا ناز کا شیوہ نہیں
ہم ہی کر بیٹھے تھے غالب پیش دستی ایک دن
(غالب)

وصل کی رات میرے بستر پر
مثل چیتے کے وہ مچلتے ہیں

یاں گرہ کھل گئی دل کی وہاں آنگیا مسکی
لبِ نازک سے صدا آنے لگی بس بس کی

حسن بریلوی بھی اسی رو میں ہے مگر آخر اللہ کر شاعر تک نہیں گرے بلکہ اعتدال میں رہ کر بوس و کنار سے دو چار ہوئے۔

بولے وہ بوسہ ہائے تبسم پر
ارے ظالم کوئی حساب بھی ہے (حسن بریلوی)

یہ تمام اشعار ان شعراء کے ہیں جو داغ اسکول کے نہیں مگر ان کے یہاں بھی وہ فضا موجود ہے۔ حسن بریلوی کے یہاں بھی وہی فضا ملتی ہے اور میرا خیال ہے بہت کافی ملتی ہے۔ مگر اس کے اظہار میں اعتدال ہے۔ ان کے یہاں وصل کی خواہش بھی ہے اور وصال کے بعد کی چاشنی بھی۔ گستاخی بھی ہے اور معشوق کی عشوہ طرازی بھی، شوخی بھی ہے اور شرارت بھی، دعوت بھی ہے اور خود سپردگی بھی۔ معشوق کی جانب سے ہلکا سا احتجاج بھی ہے اور دعوت پیش دستی بھی۔ ان کے بہت سے اشعار ان کے عشق کو مجازی رنگ دینے میں اس شارح کے ساتھ ہیں جو ان کے اشعار کی شرح کرے۔ چند نمونوں سے میری بات کی وضاحت ہو جاتی ہے۔ ؎

کسی کا شعر ہے۔ ؎

حائل تھی بیچ میں جو رضائی تمام شب
اس غم میں ہم کو نیند نہ آئی تمام شب

تم مجھے کہتے ہو بے حیا گستاخ
دھری رہیں گی یہ باتیں جو میں ہو گیا گستاخ

ان کی غزل میں صنفِ نازک بھی اپنی پوری آب و تاب سے موجود ہے۔ اور ہندوستانی فضا بھی اس لئے کہ گھونگھٹ صرف ہندوستان کی دین ہے۔

وصل میں جب ہاتھ گھونگھٹ کو لگایا اے حسن
شرم بولی منھ چھپا کر یہ سمی ابھی نہیں

ہمیں اس سے انکار نہیں کہ حسن کے یہاں تصوف موجود ہے حسن کے یہاں تصوف ضرور موجود ہے۔ وہ بھی اس لئے کہ وہ بہرحال ایک صوفی گھرانے سے متعلق تھے۔ عشقِ حقیقی نے حسن کو بھی متاثر کیا ہے۔ حسن نے اسے برتا بھی ہے مگر یہ حقیقت ہے کہ جتنا وہ عشقِ مجازی میں کامیاب ہیں اور دوسری دنیا جسے ہم تصوف کہتے ہیں وہ وہاں اس مقام پر نظر نہیں آتے جس مقام پر درد، منظر یا اس قبیل کے دوسرے شعراء نظر آتے ہیں۔ اور اس کی وجہ صرف یہی ہے کہ وہ جس اسکول سے متعلق تھے اس اسکول کے لوازمات سے اپنے آپ کو بچا نہیں پائے۔ تصوف کی چند مثالیں میری بات کی وضاحت کرتی ہیں۔

جب آنکھ کھلی تو بے خودی سے
پردہ تھا جمال خود نما کا

اس قدر یکرنگ ہوں ہم تم کہ کچھ کھلنے نہ پائے
جلوہ فرما کون ہے محو تماشا کون ہے

حسن بریلوی کا تصورِ عشق لوگوں سے مختلف ہے وہ اعتدال پسندی کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے۔ ان کے یہاں متانت و سنجیدگی کے ساتھ اور کسی حد تک شوخی و بے باکی جھلکتی ہے۔ وہ جیسا محسوس کرتے ہیں بانکپن ویسے ہی تصویر اپنے معشوق کی پیش کر دیتے ہیں۔ حسن بریلوی کا معشوق اگر شوخ ہے، چلبلا ہے تو ایسی شوخی کا مالک ہے جس میں سفلہ پن نہیں بلکہ ایک وقار، ایک متانت اور ایک سنجیدگی ہے۔ حالانکہ دونوں متضاد کیفیتیں ہیں مگر عامیانہ پن ان کے معشوق سے سرزد نہیں ہوتا جبکہ داغ کے یہاں عامیانہ پن واضح ہو جاتا ہے۔ حسن کی غزل کا عاشق عشق میں مخلص ہے۔ موقع پرست نہیں لیکن تمام بشری تقاضوں سے مملو ہے۔ اسے قدم قدم پر وصالِ یار کی خواہش ہے۔ وہ بہت بے باکی سے اپنے خیالات کا اظہار کر دیتا ہے ان کا عاشق سفلہ مزاج یا عامیانہ جذبات کا مالک نہیں۔ شعراء عموماً معشوق کو ایسی شکل میں پیش کرتے ہیں جیسے وہ صرف ظالم و جابر انسان ہے۔ مگر حسن کا معشوق ایسا نہیں۔ نہ وہ ظالم ہے نہ ستمگر بلکہ نشاط ہے مگر اکثر بوس و کنار پر راضی بھی ہو جاتا ہے۔ اور کبھی عاشق کی جرأت و گستاخی پر اور بےشمار

بوسہ بازی پر اسے تنبیہ بھی کرتا ہے۔ ے

تم چپکے سے اک بوسۂ عارض ہمیں دیدو
کہتے ہیں قسم کھا کے کہیں گے نہ کسی سے

بولے وہ بوسہ ہائے سم پر
ارے ظالم کوئی حساب بھی ہے

کیا کہوں کیا ہے مرے دل کی خوشی
تم چلے جاتے گے خفا ہو کر

حسن بریلوی داغ اسکول کے نمائندہ شاعر کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کے کلام سے چند اور مثالیں پیش خدمت ہیں تاکہ قاری حسن کی اردو غزل میں کیا حیثیت تھی اور ان کا کیا مقام ہے۔ اسے متعین کرسکے۔ ے

اے مست مئے ناز ذرا دیکھ کے چلنا
بس جاتے کہیں دل نہ کسی خاک نشیں کا

حضرت دل مزاج کیسا ہے
پھر بھی اس کوچہ میں گزر ہو گا

الفت ان کی نہیں چھوڑی جاتی
حال دل کا نہیں دیکھا جاتا

اپنے مطلب کے آشنا ہو تم
سچ ہے تم کو کسی سے کیا مطلب

کیا کہوں کیا کہہ رہی ہے یہ گھٹا یہ فصل گل
کیا کہوں کیا چاہتے نہیں شیفتہ و میخانہ آج

صفا مئے حسن سے محرومی دیدار کی باعث
نظر آتی ہے اپنی شکل ہمکو روئے جاناں میں
ہائے دشمن دیکھیں ان کے اٹھتے جوبن کی بہار
ہائے میں کوئی نہ ہوں میری نظر کوئی نہ ہو

پوچھتے کیا ہو کہ دل میں کون ہے
تو یہ آئینہ الٹا کر دیکھ ... لو

جان اگر ہو جان تو کیونکر نہ ہو تجھ پر نثار
دل اگر ہو دل تری صورت پہ شیدا کیوں نہ ہو

میں کس گنتی میں ہوں اور اک مرے دل کی حقیقت کیا
ہزاروں جان دیتے ہیں وہ صورت ہی کچھ ایسی ہے

بلا سے اک دل مضطر اگر گیا تو کیا
مرے تو ہم نے تری شوخی تقریر کے دم

ترے در سے کوئی پھرا ہو گا
رہ گئے ہم تو خاک میں مل کے

ملنے کے پتے

مولانا چاند علی رضوی، بھونڈی ضلع تھانہ
محمد صادق علی پٹھان، شاستری نگر شولاپور
جمیل احمد رضوی، سعد اللہ نگر ضلع گونڈہ
اللہ بخش اشرفی، باسنی ضلع ناگور
حضرت مفتی اشفاق حسین جودھپور
مولانا انور نظامی، ہزاری باغ بہار
مولانا نور محمد مصباحی، قیصر گنج بہرائچ
مولانا خورشید، فرید پور بریلی شریف
مولانا نسیم اللہ خاں، پرانا شہر بریلی شریف
مولانا ضیاء الحق، مسجد ہبلی کرناٹک
محمد لطف الرحمن، اندر قلعہ بنگلہ دیش
محمد ایوب کلاتھ بازار گلبرگہ شریف
مولانا عبد الغفور کھاٹو، ناگور

شاعری میں حسن کا مقام اور منصب

ڈاکٹر سید شمیم گوہر، چک نیا مجرہ ——— الہ آباد

حضرت حسن خاں بریلوی، حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے چھوٹے بھائی تھے۔ ۲۲ ربیع الاول شریف ۱۲۷۶ھ تاریخ پیدائش ہے۔ ایک روایت ۴ ربیع الاول شریف کی بھی ملتی ہے۔ جد امجد حضرت علامہ رضا علی خاں کو ولادت کی خبر دی گئی تو اظہار مسرت کرتے ہوئے فرمایا۔

"یہ میرا بیٹا مست ہوگا"

قول بالکل سچ ثابت ہوا۔ عشق رسالت میں ڈوبی ہوئی اپنی نعتیہ شاعری سے حضرت حسن خود بھی مست ہوئے اور دوسروں کو بھی مست اور بے خود کرتے رہے۔ تعلیم و تربیت والد بزرگوار حضرت علامہ نقی علی خاں اور برادر اکبر حضرت فاضل بریلوی سے حاصل کی، عالمانہ شان و عظمت کے حامل تھے اور شعر و سخن سے گہرا لگاؤ رکھتے ہیں۔ بیعت حضرت مولانا سید ابو الحسین احمد نوری علیہ الرحمہ مارہروی سے تھی۔ فاضل بریلوی کی ایماء پر قائم ہونے والے مشہور تعلیمی ادارہ مدرسہ منظر اسلام کا تاریخی نام حسن بریلوی ہی نے تجویز کیا تھا اور آپ ہی اس مدرسہ کے پہلے مہتمم بھی مقرر کئے گئے اور بانی ہونے کا شرف بھی حاصل

داغ کے گھر

شاعری کی ابتداء عموماً عشقیہ و مجازی ہی محرکات کی روشنی میں ہوتی ہے حضرت حسن بریلوی علیہ الرحمہ کا شعری سفر بھی مجازی رنگ و آہنگ سے شروع ہوا۔ اس وقت استاد داغ دہلوی کی شاعری و استادی کی ہر طرف دھوم مچی ہوئی تھی حسن بریلوی کی نظر انتخاب بھی داغ پر گئی اور ایک سال تک رامپور میں رہ کر حضرت داغ سے استفادہ کیا اور ان کی شاگردی اختیار کی لیکن مصنف خمخانۂ جاوید لالہ سری رام لکھتے ہیں۔ "جس زمانے میں حضرت داغ رام پور تھے آپ ان کے شاگرد ہوئے اور ہر سال ایک دو مہینے ان کی خدمت میں رہ کر صحبت سے مستفیض ہوتے رہے۔ (جلد دوم ص ۴۵۰)

شاعری کی ابتداء چونکہ مجازی و رومانی فضا میں ہوئی اس لئے حسن بریلوی علیہ الرحمہ نے داغ کی ضرورت محسوس کی ورنہ بقول منصف خمخانۂ جاوید، نعت گوئی میں اپنے برادر اور بزرگ مولوی احمد رضا خاں صاحب سے مستفیض ہیں"۔ (ص ۴۵۰)

رضا بریلوی کا شاعر

حضرت فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ خود لکھتے ہیں

"مولانا کافی اور حسن میاں مرحوم کا کلام اول سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے ان کو میں نے نعت گوئی کے اصول بتادیئے تھے۔ ان کی طبیعت میں ان کا ایسا رنگ رچا کہ ہمیشہ کلام اسی معیار اعتدال پر صادر ہوتا جہاں شبہ ہوتا مجھ سے دریافت کرلیتے۔"

(الملفوظ حصہ دوم ص۔ ۱۰۸ مطبوعہ کراچی)

حسن اور رام پور

ثابت ہوا کہ مجازی رنگ کے ساتھ ساتھ نعت گوئی سے بھی بالکل ابتدائی دلچسپی تھی۔ ایسی صورت میں مصنف خمخانۂ جاوید کا یہ کہنا کہ "ہر سال ایک دو مہینے ان کی خدمت میں رہ کر مستفیض ہوتے رہے۔" یہ تحقیق مبہم معلوم ہوتی ہے ہر سال کی وضاحت نہ ہونے

پریا تو زیادہ سے زیادہ دو تین سال تک سلسلۂ استفادہ کا گمان کیا جا سکتا ہے۔ یا پھر اس روایت پر بھی اتفاق کیا جا سکتا ہے کہ وہ مستقل سال بھر تک استفادہ کرنے کے بعد رام پور سے لوٹے ہوں کیونکہ حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ یوں بھی برابر رام پور جایا کرتے تھے ان کے اپنے پھوپھا جناب فضل حسن خاں صاحب راج دوارہ رام پور ہی میں رہتے تھے۔ جس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کا ہر سفر استفادہ کے لئے نہیں ہوتا ہوگا یہ اور بات ہے کہ استاد داغ سے تعلقات اور رسم و راہ زیادہ دنوں تک بنے رہے ہوں کیونکہ یہ مشہور واقعہ اسی زمانے کا ہے کہ حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ نے اپنے استاد مرزا داغ دہلوی کو جب اپنے بڑے بھائی حضرت رضا بریلوی کی نعت کا یہ مطلع سنایا۔ ؎

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
ترے دن اے بہار پھرتے ہیں

تو داغ پھڑک اٹھے اور تعریف کرتے ہوئے کہا۔ "مولوی ہو کے ایسے اچھے شعر کہتا ہے۔" اس واقعہ کا ذکر اپنے ایک تاثراتی مضمون میں جناب ماہر القادری نے بھی کیا ہے۔ (دیکھئے ماہنامہ فاران کراچی شمارہ ستمبر ۱۹۷۳ء ص۔ ۴۴) مگر یہ حقیقت ہے کہ استاد داغ سے اصلاح و استفادہ کا سلسلہ اس قدر زور رہا کہ مجازی ورومانی شاعری کی ابتدا ریختگی و بالیدگی تک پہنچی۔

مقام و منصب

اور ثمر فصاحت کے نام سے باقاعدہ ان کا غزلیہ دیوان مرتب ہوا اور اس میدان میں بھی انہوں نے ایسے ایسے فکری و فنی جوہر دکھائے کہ مجھے یہ کہنے میں کوئی تکلیف نہیں کہ ثمر فصاحت کے سیکڑوں اشعار اساتذہ فن سے بہتر ہیں اور فکر و فن کے اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتے ہیں۔ حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی پوری عشقیہ شاعری پر اپنے استاد کا رنگ غالب ہے اسلوب اور لب و لہجہ بھی ملتا جلتا ہے۔ خود کہتے ہیں۔ ؎

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذت سوز و گداز
اے حسن شاگرد ہوں میں داغ سے استاد کا

رضا کا خراج تحسین

مگر گھر کے مذہبی ماحول نے ایسی عشقیہ شاعری کا سلسلہ زیادہ دنوں تک چلنے نہیں دیا اور پھر حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اپنے برادر بزرگ کی ڈگر اپناتے ہوئے نعتیہ شاعری کی طرف ایسا راغب ہوئے کہ پھر تا دم آخر نعت رسول ہی کی عبادت میں مصروف رہے۔ حسن بریلوی کا دیوان " ذوق نعت " نعتیہ شعر و ادب کا قیمتی گنجینہ اور فکری کاوشوں کا لاجواب تحفہ ہے۔ ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا اور حضرت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالٰے عنہ نے قطعۂ تاریخ طباعت کہہ کر خراج تحسین پیش کیا:

نعت حسن آمدہ نعت حسن | حسن رضا باد بریں سلام
ان من الذوق لسحر ھمہ | ان من الشعر لحکمۃ تمام

کلک رضا داد چناں سال آں
یافت قبول از شہ راس الانام ۱۳۲۶ھ

خصوصیات و فن

ذوق نعت میں حمد، مسدس، نعتیہ غزل، سلام، منقبت، قصیدہ، مثنوی، شہادت نامہ، رباعی اور قطعہ سب کچھ موجود ہے۔ ان کا ضخیم نعتیہ دیوان ہر صنف سخن کی طبع آزمائی اور فنی عظمتوں سے معمور نظر آتا ہے۔ مگر وہ بنیادی طور پر غزل ہی کے شاعر تھے ان کے بعض قابل قدر جدید ہیتی تجربوں اور فنی نیرنگیوں نے دنیائے نعت کو ایک دور رس سے روشناس کرایا ہے۔ چودھویں صدی ہجری کے آغاز میں حضرت رضا بریلوی کے بعد حسن بریلوی ہی وہ واحد شاعر ہیں جنہوں نے کسی اعتبار سے نعتیہ شعر و ادب کی زلفیں سنواریں، وسیع امکان پیدا کئے، اور ساتھ ہی معنیٰ خیزی، مضمون آفرینی اور فکری بلندیوں کی تابانیوں سے مجلیٰ کر کے اپنی آواز کو ممتاز بنایا جس کے تحت یہ حقیقت سامنے آئی کہ حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ کی عظیم نعتیہ شاعری اصحاب فکر و فن کے لئے مشعل راہ بنی ذوق شعری کو ایمان افروز حوصلوں کی آنچ میں کس طرح تپایا جا سکتا ہے ایسے حوصلہ شناسوں میں حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ کا بڑا انفرادی مقام ہے وہ اگر ایک طرف عظمت رسالت، اظہار معصیت، التجائے مغفرت اور احساس ندامت جیسے حقائق کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی شاعری کا حق ادا کرتے ہیں تو دوسری طرف عمیق معنویت، فنی تہہ داری، فصاحت و بلاغت اور لطیف طرز اسلوب پر بھی خصوصی زور دیتے ہیں۔ قدم قدم پر منصب رسالت کی رعایت نزاکت و

نفاست اور شرعی احتیاط و پابندی کے باوجود آزاد فکروں کو متاثر کر دینے والی فنی بلاغتوں اور فکری کاوشوں کے قیمتی موتی بکھیر دینا کوئی آسان کام نہیں ہوتا مگر کچھ کر گزر جانے کے ایماق حوصلے نے حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کو ہر اعتبار سے سرخرو کیا۔

نعت گوئی کا عظیم شاعر

اردو کا کوئی بھی عظیم نعت گو ہو حضرت حسن بریلوی سے نہ کسی سے مرعوب نظر آتے ہیں اور نہ ہی کسی شاعر کے سامنے ان کا شعری وقار ہلکا دکھائی دیتا ہے۔ ان کی شاعری قرآن و احادیث، تاریخ و سیر، واقعات و کردار اور تہذیبی عوامل کی ترجمانی سے منور ہے اور پورا دیوان عشق و محبت میں رچے بسے اور مہکتے اشعار سے معطر ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے ان کے رخسار پر ڈھلکے ہوئے سارے آبگینے ان کے دیوان کے صفحات پر بکھر کر رہ گئے ہوں۔ نعت گوئی کو انہوں نے ایک فریضہ ایک عبادت کے طور پر اپنایا اور جذبۂ عقیدت کا اظہار کرتے ہوئے الشعراء تلامیذ الرحمٰن کی صف میں داخل ہونے کی سعادت حاصل کی۔ گنبد خضری کی بھینی بھینی چھاؤں میں دم بھرتا ہوا حضرت حسن کا بے لوث عشق، عظمت حبیب کردگار کو کس والہانہ انداز میں بیان کرتا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمایئے۔

دکھائی جائے گی محشر میں شان محبوبی
کہ آپ ہی کی خوشی آپ کا کہا ہو گا

عزیز بچے کو ماں جس طرح تلاش کرے
خدا گواہ یہی حال آپ کا ہو گا

جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعل پاک حضور
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں

ہوا دل سوختہ کو چاہئے تھی ان کے دامن کی
الٰہی صبح محشر کا گریباں چاک ہو جاتا

خوبیاں ہی خوبیاں

حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری میں مضمون آفرینی کا وقار بہت اعلیٰ ہے اور ان کی شاعری کا یہ وصف نمایاں اور اہم ہے۔ داخلی محرکات و کوائف میں غضب کی بے ساختگی ہے۔ وہ تقدس مآب مشاہدات و تخیلات کو ترتیب دے کر بڑی آسانی سے اشعار کے سانچے میں ڈھال دیتے ہیں اور وکی زور آزمائی سے مبرا ان کے جذبات میں ہر جگہ آمد آمد کا بہاؤ ہے۔ اس جذباتی بہاؤ نے اپنی قدر و قیمت کو کہیں بھی ہلکا نہیں ہونے دیا۔ انتخاب الفاظ یا شوکت الفاظ کی آب و تاب کے ساتھ ساتھ استعارہ و کنایہ اور تمثیلات و تشبیہات کی جلوہ گری بھی ان کی شعری عظمتوں میں اضافہ کرتی ہے۔ زبان و بیان اگرچہ صاف و سلیس ہے۔ مگر فارسی و عربی کی آمیزش کا زور ایک نئی کیفیت و معیار کا تعین کرتا ہے۔ اس کے علاوہ مشکل سے مشکل زمین کو آسان بنا کر اعلیٰ افکار و تخیلات کی دولت سے فزوں دینا یہ بھی حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی پختہ کاری کا نمایاں ثبوت ہے محاوروں کی ماہرانہ استعمال پر تو گویا انہیں مہارت حاصل تھی۔ ویسے جدت نوازی اور معنوی آفرینی ان کی شاعری کا سب سے قیمتی جوہر ہے جو عشق رسالت کی تابانیوں سے مجلیٰ ہے چنانچہ ان جملہ مرکزی و بنیادی اوصاف محاسن کی روشنی میں انہوں نے اپنے شعری و فنی منصب کو کہیں بھی ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ اور نعتیہ شعر و ادب کے دامن کو وسیع کرنے میں غیر معمولی خدمات انجام دیں۔

ایک عظیم محقق کا تاثر

۱۹۸۶ء میں مجھے انٹرویو دیتے ہوئے ایک سوال کے جواب میں معروف محقق قاضی عبدالودود نے کہا تھا کہ

"حسن بریلوی نعت کے بہترین شاعر تھے۔ انہوں نے حضرت حسن کے دو اشعار سنانے کے بعد یہ بھی کہا تھا کہ رضا بریلوی صاحب بھی نعت کے اچھے شاعر تھے۔"

اس تاثر سے اندازہ ہوتا ہے کہ قاضی عبدالودود جیسے مشہور و معروف محقق اور ادیب اپنے دل میں حضرت رضا اور حضرت حسن کے نعتیہ فکر و فن کی کتنی قدر و قیمت رکھتے تھے۔

دیگر صنف سخن

نعتیہ غزلوں کے علاوہ یہی فنی کیفیت دیگر اصناف سخن میں بھی سلامت نظر آتی ہے۔ مثلاً مسدس ذکر معراج اور نغمہ روح" قصیدہ وسائل بخشش"، اور مثنوی ولادت

حضورِ سرور' میں ان کی زور بیانی، فکر آفرینی اور سلاست و روانی پوری طرح نکھری دکھائی دیتی ہے۔ انہیں شعری محاسن سے "شہادت نامہ" سلام اور مناقب بھی آراستہ ہیں۔ ان کے متعدد مناقب شعری حسن اور عظمتوں کے حامل ہیں۔ گویا حضرت حسن جس صنف سخن کی طرف بھی ملتفت ہوئے اپنی پختہ کاری، بالغ نظری، دیدہ وری اور تلاش و جدت کی غیر معمولی چھاپ چھوڑ گئے، ذوقِ نعت میں کمزور اور ڈھیلے اشعار کی تعداد بہت کم ہے۔

آرزوئے زیارت حرمین شریفین

آپ زیارت حرمین شریفین کی آرزو میں تڑپتے رہے۔ فرماتے ہیں۔

جانے والے چل دیئے ہم رہ گئے
اپنی اپنی اے حسن تقدیر ہے

اللہ تعالیٰ نے ان کی دیرینہ آرزو پوری کی اور وفات سے ایک سال قبل مناسک حج اور زیارت گنبد خضریٰ سے مشرف ہوئے دو روایات کے مطابق ۲۲ رمضان المبارک یا ۳ شوال المکرم ۱۳۲۶ ہجری/۱۹۰۸عیسوی کو وفات ہوئی۔ نور اللہ مرقدہٗ "شعر حسن" میں مرید احمد چشتی نے حضرت حسن کے تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔

مشاہیر تلامذہ

ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں۔ حکیم سید برکت علی نامی، منشی دوارکا پرشاد حلم بریلوی، حافظ وباغ احمد محشر، سید محمود علی عاشق، منشی ہدایت یار خاں قیس، منشی اختر حسین اختر، منشی برج موہن کشور فیروز، منشی مظہر حسین مظہر، حکیم سید مسعود غوث فیض، منشی تہور علی تہور، منشی محمد حسین آفر بدایونی اور منشی اعجاز احمد قیصر مراد آبادی وغیرہم صـ لیکن ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کی تصنیف "تذکرہ نعت گویان بریلی" کے مطالعہ سے جن تلامذہ کا ذکر ملتا ہے وہ مرید چشتی کی فہرست سے بالکل مختلف ہے۔ تعجب ہے کہ تلامذہ حسن کی تحقیق میں اتنا فرق کیوں ہوا۔ ادیب نے مندرجہ ذیل تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔

حکیم سید برکت علی نامی، جمیل الرحمٰن جمیل بریلوی، سید محمد فدا علی واثق، محمد ضیاء اللہ خاں ضیاء، حافظ ارشاد علی ارشاد اور حمید اللہ خاں حمید داماد حسن بریلوی؛ ان تلامذہ میں حضرت جمیل بریلوی (متوفی ۱۳۴۲ھ) کی حیثیت بہت اہم اور موقر ہے۔ نعتیہ شعر و ادب کے فروغ میں ایک اہم ستون سمجھے جاتے ہیں۔ "قبالۂ بخشش" کے نام سے ایک ضخیم نعتیہ دیوان ۱۳۴۱ھ میں شائع ہو چکا ہے۔ جو فکر و فن عشق و محبت اور زبان و بیان کا قیمتی یادگار تحفہ ہے

نمونۂ کلام

نہ ہو آرام جس بیمار کو سارے زمانے سے
اٹھا لے جائے تھوڑی خاک ان کے آستانے سے

کوئی فردوس ہو یا خلد ہو ہم کو غرض مطلب
لگایا اب تو بستر آپ ہی کے آستانے سے

تمہارے تو وہ احساں اور یہ نافرمانیاں اپنی
ہمیں تو شرم سی آتی ہے تم کو منہ دکھانے سے

بہار خلد عاشق ہو رہی ہے روئے عاشق پر
کھلی جاتی ہیں کلیاں دل کی تیرے مسکرانے سے

زمیں تھوڑی سی دیدے بہر مدفن اپنے کوچے میں
لگا دے میرے پیارے میری مٹی بھی ٹھکانے سے

پلٹتا ہے جو زائر اس سے کہتا ہے نصیب اسکا
ارے غافل قضا بہتر ہے یاں کے پھر کے جانے سے

تمہارے در کے ٹکڑوں سے پڑا پلتا ہے اک عالم
گزارا سب کا ہوتا ہے اسی محتاج خانے سے

نہ پہنچے ان کے قدموں تک نہ کچھ حسن عمل ہی ہے
حسن کیا پوچھتے ہو ہم گئے گزرے زمانے سے

-(۲)-

کہوں کیا حال زاہد وادیِ طیبہ کی نزہت کا
کہ ہے خلد بریں چھوٹا سا ٹکڑا میری جنت کا

بلاتے ہیں اسی کو جس کی بگڑی وہ بناتے ہیں
کمر بندھنا دیار طیبہ کو کھلنا ہے قسمت کا

نہ کر رسوائے محشر واسطہ محبوب کا یا رب
یہ مجرم دور سے آیا ہے سن کر نام رحمت کا

مرادیں مانگنے سے پہلے ملتی ہیں مدینہ میں
ہجوم جو دنے روکا ہے بڑھنا دست حاجت کا

شبِ اسریٰ ترے جلوے نے کچھ ایسا سماں باندھا
کہ اب تک عرشِ اعظم منتظر ہے تیری رجعت کا

یہاں کے ڈوبتے دم میں ادھر جا کر ابھرتے ہیں
کنارا ایک ہے بحرِ ندامت بحرِ رحمت کا

غنی ہے دل بھرا ہے نعمتِ کونین سے دامن
گدا ہوں میں فقیرِ آستانِ خود بدولت کا

الٰہی بعد مردن پردہ ہائے حائل اٹھ جائیں
اجالا میرے مرقد میں ہو انکی شمع قربت کا

سنا ہے روزِ محشر آپ ہی کا منھ تکیں گے سب
کہاں پورا ہوا مطلب دلِ مشتاقِ رویت کا

ہمیں بھی یاد رکھنا ساکنانِ کوچۂ جاناں
سلامِ شوق پہنچے بے کساں دشتِ غربت کا

حسنؔ سرکارِ طیبہ کا عجب دربارِ عالی ہے
درِ دولت پہ اک میلا لگا ہے اہلِ حاجت کا

-(۳)-

نگاہ لطف کے امیدوار ہم بھی ہیں
لئے ہوئے یہ دلِ بے قرار ہم بھی ہیں

ہمارے دستِ تمنا کی لاج بھی رکھنا
ترے فقیروں میں اے شہریار ہم بھی ہیں

ادھر بھی توسنِ اقدس کے دو قدم جلوے
تمہاری راہ میں مشتِ غبار ہم بھی ہیں

جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعلِ پاکِ رسول
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں

یہ کس شہنشہِ والا کا صدقہ بٹتا ہے
کہ خسروؤں میں پڑی ہے پکار ہم بھی ہیں

تمہاری ایک نگاہِ کرم میں سب کچھ ہے
پڑے ہوئے تو سرِ رہگذار ہم بھی ہیں

حسنؔ ہے جن کی سخاوت کی دھوم عالم میں
انھیں کے تم بھی ہو اک ریزہ خوار ہم بھی ہیں

-(۴)-

عجب کرم شہِ والا تبار کرتے ہیں
کہ ناامیدوں کو امیدوار کرتے ہیں

جو خوش نصیب یہاں خاکِ در پہ بیٹھے ہیں
جلوسِ مسندِ شاہی سے عار کرتے ہیں

سنا کے وصفِ رخِ پاک عندلیب کو ہم
رہینِ آمدِ فصلِ بہار کرتے ہیں

بنائی پشت نے کعبہ کی انکے گھر کی طرف
جنھیں خبر ہے وہ ایسا وقار کرتے ہیں

سگانِ کوچۂ نبی کے نصیب پر قرباں
پٹے بھی جن کے سرِ افتخار کرتے ہیں

کشودِ عقدۂ مشکل کی کیوں میں فکر کروں
یہ کام تو مرے طیبہ کے خار کرتے ہیں

حسنؔ کی جان ہو اس وسعتِ کرم پہ نثار
کہ اک جہاں کو امیدوار کرتے ہیں

-(۵)-

اگر قسمت سے میں ان کی گلی میں خاک ہو جاتا
غمِ کونین کا سارا بکھیڑا پاک ہو جاتا

لبِ جاں بخش کی قربت حیاتِ جاوداں دیتی
اگر ڈورا نفس کا ریشۂ مسواک ہو جاتا

ہوا دل سوختوں کو چاہیے تھی انکے دامن کی
الٰہی صبحِ محشر کا گریباں چاک ہو جاتا

اگر پیوندِ ملبوسِ پیمبر کے نظر آئے
ترا اے حلۂ شاہی کلیجہ چاک ہو جاتا

کماندارِ نبوت قادر اندازی میں یکتا ہیں
دو عالم کیوں نہ ان کا بستۂ فتراک ہو جاتا

نہ ہوتی شاق گر دوری کی جدائی تیرے قدموں کو
قمر اک اور بھی روشن سرِ افلاک ہو جاتا

حسنؔ اہلِ نظر عزت سے آنکھوں میں جگہ دیتے
اگر یہ مشتِ خاک ان کی گلی کی خاک ہو جاتا

-(۶)-

وہ جب تشریف لائے گھر سے در تک
بھکاری کا بھرا ہے دیدے گھر تک

دہائی ناخدائے بے کساں کی!
کہ سیلابِ الم پہنچا کمر تک

الٰہی دل کو دے وہ سوزِ الفت
پھنکے سینہ جلن پہنچے جگر تک

نہ ہو جب تک تمہارا نام شامل
دعائیں جا نہیں سکتیں اثر تک

خدایوں انکی الفت میں گما دے
نہ پاؤں پھر کبھی اپنی خبر تک

نہ کھولیں آنکھیں نگاہِ شوقِ ناقص
بہت پردے ہیں حسنِ جلوہ گر تک

ماخوذ از - نعت کے چند شعراء متقدمین، ص ۱۰۷ تا ۱۱۶

مولانا حسن رضا خاں بریلوی

بحیثیت نعت گو شاعر

مولانا حضور احمد منظری
ایم اے خطیب جامع مسجد [illegible]

ایک موہوم یاد

اس واقعہ کو ایک طویل عرصہ گزر چکا ہے۔ [illegible] میں مادر علمی دار العلوم منظر حق ٹانڈہ سے فارغ التحصیل ہو کر تدریسی زندگی کا آغاز کیا تھا۔ ہنوز فکر و شعور میں کوئی خاص بالیدگی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اور نہ ہی شعر و شاعری سے کوئی فطری لگاؤ تھا۔ بس یونہی تھوڑی سی بہت سخن فہمی کی شد بد تھی۔ اس دور میں میلاد شریف کی ایک متبرک محفل میں شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ وقت مقررہ پر میلاد شریف کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے قرآن کریم کی تلاوت ہوئی۔ اور پھر قدیمی انداز میں چند میلاد خواں حضرات کتاب لے کر میلاد خوانی میں مصروف ہو گئے۔ وہ کبھی روایت پڑھتے اور کبھی کسی شاعر کا نعتیہ کلام۔ میلاد خواں بڑے خوش گلو تھے۔ ان کی آواز میں ایک ایسا درد و سوز تھا جس نے محفل میں محویت و استغراق کا رنگ پیدا کر دیا تھا۔ وہ جب سُر سے سُر ملا کر خوش الحان کے ساتھ نعت شریف پڑھتے تو ایک سماں بندھ جاتا اور سامعین پر وجد و حال کی کیفیت طاری ہو جاتی۔ لیکن میں تقریر کے لئے موضوع کی تلاش میں محو ہونے کے باعث اس وجد آگیں کیفیت کی لذت سے کماحقہٗ لطف اندوز نہ ہو سکا تھا کہ اچانک استاد زمن حضرت مولانا حسن رضا خاں بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی یہ نعت شریف پڑھی جانے لگی۔ جس کے چند اشعار بطور نمونہ پیش خدمت ہیں۔

عجب رنگ پر ہے بہار مدینہ
کہ سب جنتیں ہیں نثار مدینہ

مری خاک یارب نہ برباد جائے
پس مرگ کر دے غبار مدینہ

رگ گل کی جب نازکی دیکھتا ہوں
مجھے یاد آتے ہیں خار مدینہ

رہیں ان کے جلوے بسیں ان کے جلوے
مرا دل بنے یادگار مدینہ

بنا آسماں منزل ابن مریم
گئے لامکاں تاجدار مدینہ

شرف جن سے حاصل ہوا انبیاء کو
وہی ہیں حسن افتخار مدینہ

اس نعت پاک کا پڑھا جانا تھا کہ میں اس طرف پوری درجہ مائل ہو گیا۔ کلام میں تاثیر اور وارفتگی شوق کی وہ چاشنی تھی کہ میں تھوڑی دیر کے لئے خود کو فراموش کر بیٹھا۔ یہ پہلا موقع تھا جب کسی نعت پاک نے مجھ کو اس درجہ مسحور و مسرور کر دیا تھا اور مجھ پر ایک وجدانی کیفیت طاری کر دی تھی۔ یوں تو سیدنا اعلیٰحضرت آبروئے اہل سنت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کے تعلق سے میرے کان استاد زمن کے نام نامی اسم گرامی سے پہلے ہی آشنا تھے۔ اور ایک عظیم المرتبت عالم دین کی حیثیت سے آپ سے بخوبی متعارف نہ تھا۔ مگر آپ ایک

بلند قامت اور منفرد لب ولہجہ کے نعت گو شاعر بھی ہیں
میں اس حقیقت سے بے خبر تھا اور آج ایک عرصۂ دراز
کے بعد آپ کی بارگاہ ذی وقار میں اپنے گلہائے خیالات
وتاثرات سے مزین یہ گلدستہ خراج عقیدت ومحبت کے
طور پیش کرکے ایک دیرینہ تمنا کی تکمیل کر رہا ہوں۔ اس سے
مجھے جس روحانی مسرت کا احساس ہو رہا ہے۔ اس
احساس لطیف کو میرا قلم الفاظ کا پیکر دینے سے عاجز و
قاصر ہے۔

پس منظر

ارباب علم ودانش پر یہ امر مخفی نہیں کہ اصناف سخن میں نعت
اپنے موضوع کے اعتبار سے بے حد نازک اور مشکل
صنف سخن ہے۔ بقول عرفیؔ شیرازی دم شمشیر پر چلنے کے مترادف
ہے۔ ے

ہشدار کہ نتواں بیک آہنگ سرودن
نعت شہ کونین و مدیحۂ کے و جم را
عرفیؔ مشتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بردم تیغ است قدم را

یہی سبب ہے کہ اس دشوار گزار وادی میں قدم رکھنے
کے لئے زبان وبیان پر قدرت کاملہ کے ساتھ بڑی احتیاط
وہوشمندی، عزم وحوصلے، جرأت وہمت اور رسالت مآب
صلے اللہ تعالے علیہ وسلم سے سچی محبت وعقیدت کی
ضرورت ہوتی ہے۔ اس پر بھی ہر آن یہ خوف دامن گیر
رہنا چاہئے کہ کہیں کوئی لغزش نہ سرزد ہو جائے اور
نتیجے میں خرمن ایمان تباہ و برباد ہو کر نہ رہ جائے۔
بایں سبب ایک نعت گو شاعر کے لئے اس راہ میں اپنے
جذبات و احساسات، افکار وخیالات اور عشق وشوق کی
جنوں خیزیوں پر عقل وشریعت کا پہرہ بٹھانا ناگزیر ہوتا ہے
تب کہیں جاکر کوئی ٹھوکر لگے بغیر ایک نعت گو شاعر
کامیابی سے ہم کنار ہوتا ہے اور سعادت ابدی کا مستحق
قرار پاتا ہے۔ نیز اس کا کلام نجات اخروی کا ضامن بھی
ٹھہرتا ہے۔ اس سلسلے میں استاذ زمن حضرت مولانا
حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالے علیہ پر مبدء فیاض کا خاص
فیض وکرم رہا ہے۔ چنانچہ وہ ساری شرطیں جو نعت گو شاعر
کے لئے لازم ہوتی ہیں۔ کم وبیش آپ میں مجتمع ہوگئی تھیں
ایک معزز وممتاز علمی گھرانے میں ادراک وشعور کی آنکھیں
کھولیں۔ مہذب، پاکیزہ اور دینی ماحول میں تعلیم وتربیت
پائی۔ عشق رسول صلے اللہ تعالے علیہ وسلم کی دولت
وراثت ہاتھ لگی۔ والد ماجد مولانا نقی علی خاں و برادر
کلاں اعلیٰ حضرت رضی اللہ تعالے عنہما جیسی عبقری ونابغۂ
روزگار شخصیات کی آغوش علمی میں ذہنی وفکری سمت سفر
کا تعین ہوا۔ یہ سارے خارجی عناصر آپ کی ذات کو
ستودہ صفات بنانے، آپ کے قلب کو سوز وگداز سے پر
کرنے اور آپ کے سینے کو علوم ومعارف کا گنجینہ بنانے
میں بڑے ہی مفید، معین اور موثر ثابت ہوتے۔ ایسے
ماحول اور حالات آپ نے جب نعت گوئی کے میدان
میں قدم رکھا اور خوبیٔ قسمت سے مرزا داغؔ دہلوی جیسا
قادر الکلام اور فصیح اللسان استاد آپ کا مصلح ومربی ٹھہرا
تو پھر آپ نے اس راہ میں وہ گل افشانیاں کیں اور طبع
خداداد کے وہ جوہر دکھلائے کہ اردو کے نعتیہ ادب کا دامن
"ذوق نعت" کی شکل میں ایک ایسے گنجینۂ بیش بہا سے مالا
مال ہو گیا کہ اسے تہی دامنی کا کوئی گلہ باقی نہ رہا

ذوق نعت کی ادبی اہمیت

اردو شعر وادب کو غزل، قصیدہ
مرثیہ، مثنوی و دیگر اصناف سخن میں تو ہر دور میں بتدریج
فروغ حاصل ہوتا رہا۔ لیکن ادب میں نعت کو مستقل
صنف سخن کا درجہ نہ دیئے جانے کے باعث شعراء نے اس
طرف بہت کم توجہ کی۔ نتیجۃً اردو کی پیدائش کے اولین
اور متوسط دور میں اس مقدس اور پاکیزہ صنف نے
کوئی خاص پیش رفت نہ کی۔ لیکن موجودہ صدی عیسوی کا
اولین دور نعت گوئی کے حق میں بڑا ساز گار ثابت ہوا۔
اور اس صنف کو نئی جہت ملی یہ خوشگوار واقعات دراصل
اس وقت رونما ہوا۔ جب سیدنا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا
خاں فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان نے نعت گوئی

اور محبوب خدا صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مدح وستائش
ہی کو اپنی طبع آزمائی کا مرکز قرار دیا۔ چنانچہ اعلیٰ حضرت
رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کے مجموعۂ کلام "حدائق بخشش" اور
استاد زمن کے مجموعۂ کلام "ذوق نعت" ایک طرف
جہاں اردو کے نعتیہ ادب کے دامن کو گوہر مقصود سے
بھر دیا۔ وہیں نعت گو شعراء کو نعت گوئی کا رجحان صحیح
مذاق سلیم اور ذوق لطیف بھی عطا کیا۔ ہر چند کہ اس
دور میں محسن کاکوروی اور دیگر بہت سے نامور اور ممتاز
نعت گو شعراء نکلے ہیں۔ جن کی نعتیہ ادب کی راہ میں مخلصانہ
خدمات سے انکار و اعراض نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن
نعت کو اردو ادب میں مستقلاً ایک صنف سخن کی حیثیت
سے عوام وخواص میں متعارف کرانے اور اردو شعراء
کو پورے اخلاص ومحبت اور ذوق وشوق کے ساتھ نعت
گوئی کی طرف راغب کرنے کی تمام تر جد وجہد اور کامیابی
کا سہرا انھیں دونوں بزرگوں کے سر ہے۔ جس کا
اعتراف مورخین وناقدین نے بھی کیا ہے۔ چوں کہ اس
وقت "ذوق نعت" موضوع بحث ہے۔ اس لئے یہاں صرف
اس کی ادبی حیثیت واہمیت کو اجاگر کیا جائے گا۔

اس سے قبل کہ میں "ذوق نعت" کی ادبی خوبیوں اور
اس کے فنی کمالات کے بارے میں اپنی بساط علمی کے مطابق
کچھ عرض کروں۔ قارئین یہ بات ذہن میں رکھیں کہ
استاد زمن ایک ایسے جید اور متبحر عالم دین تھے جن کے
دل میں شریعت اسلامی کا حد درجہ پاس ولحاظ تھا۔ اور
ایک ایسا عالم دین گداز قلب اور وارفتگی شوق کے ساتھ
پاسبان شریعت کا درجہ رکھتا ہو۔ وہ جب شاعری کے
میدان میں قدم رکھتا ہے تو پھر وہ صرف اور صرف حقیقت
بیانی سے کام لیتا ہے۔ وہ وہی کہتا ہے جو اس کے دل پر
گزرتی ہے۔ وہ وہی بات نظم کرتا ہے جو وہ اپنی مشاہداتی
قوت کے ذریعہ محسوس کرتا ہے۔ اس کی شاعری غزل
اور قصیدہ کی طرح مبالغہ سے پُر، محض تصوراتی اور تخیلاتی
اور سفلی جذبات کی ترجمان نہیں ہوتی۔ بلکہ حقیقت بیانی سے
لبریز اور صداقت وخلوص کا مظہر ہوتی ہے۔ ایک عالم شاعر
یہ روش اس لئے اختیار کرتا ہے کہ وہ جانتا ہے کہ اسلام
کی نگاہ میں وہی شاعر محمود ومقبول اور مستحسن ہے۔ جو صداقت
کی منہ بولتی تصویر ہو۔ اور ایسے ہی حق گو شاعر اللہ اور اس
کے رسول محترم کے نزدیک اجر وثواب اور انعامات
اخروی کے مستحق ہوتے ہیں۔ اور وہ شاعری جو کذب
بیانی اور مبتذل ورکیک خیالات وتصورات سے مملو ہو
وہ اسلام کے نزدیک سخت معیوب ہی نہیں، معتوب اور
لائق مذمت بھی ہے۔ چنانچہ ایسے ہی کذاب شاعر قرآن
کی زبان میں گمراہ اور ہر وادی میں بھٹکنے والے ہیں۔
شاعری کے میدان میں اس امر کا عموماً نعت گو شعراء
ہی خاص لحاظ رکھتے ہیں۔ کیونکہ صنف نعت کی پاکیزگی
اس بات کی متقاضی بھی ہے کہ وہ صداقت اور حقیقت
بیانی کی منہ بولتی تصویر ہو۔

اس پس منظر میں جب ہم "ذوق نعت" کا جائزہ لیتے
ہیں تو پورا مجموعہ اول تا آخر صداقت اور حقیقت بیانی کا
عکاس نظر آتا ہے۔ تصنع، تکلف، جھوٹ یا غیر حقیقت
بیانی کی کہیں ایک ہلکی سی جھلک بھی دکھائی نہیں پڑتی۔
اس مقصدیت کے باوصف سلاست وفصاحت، آمد و
برجستگی، شیرینی وحلاوت، سوز وگداز، شوکت الفاظ،
ندرت تراکیب، تلمیحات وتمثیلات اور صنائع لفظی و
معنوی جیسے اوصاف اور محاسن شعری آپ کے کلام میں
بدرجۂ اتم پائے جاتے ہیں۔ جنھوں نے "ذوق نعت" کی
ادبی حیثیت کو بلند سے بلند تر کرنے میں نمایاں رول ادا
کیا ہے۔ ذیل میں چند اشعار قلمبند کئے جاتے ہیں
جن میں مذکورہ بالا خوبیاں اپنی تمام تر رعنائیوں کے
ساتھ جلوہ گر ہیں۔ یہ اشعار فکر وفن کی بلندی کو چھونے
کے ساتھ حبیب کبریا صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے آپ
کی والہانہ عقیدت ومحبت کے بھی عمدہ نمونے ہیں۔
ملاحظہ فرمائیں۔

دل کے آئینہ میں جو تصویر جاناں لے چلا
محفل جنت کی آرائش کا ساماں لے چلا

تسلیم میں سر، وجد میں دل، منتظر آنکھیں
کس پھول کے مشتاق ہیں مرغان حرم آج

ان کے گدا کے در پہ ہے یوں بادشہ کی عرض
جیسے ہو بادشاہ کے در پر گدا کی عرض

نہ کیوں کر ہو اس ہاتھ میں سب خدائی
کہ یہ ہاتھ تو ہاتھ ہے کبریا کا

جب تری یاد میں دنیا سے گیا ہے کوئی
جان لینے کو دلہن بن کے قضا آئی ہے

خاک مدینہ پر ہے اللہ موت دے
وہ مردہ دل ہے جس کو نہ ہو زندگی عزیز

فکر و فلسفہ

جیسا کہ اوپر مذکور ہوا۔ استاد زمن نے ایک ممتاز ترین علمی گھرانے میں شعور و آگہی کی آنکھیں کھولیں تھیں۔ اور اپنے عہد کے جلیل القدر علمائے دین کے آگے زانوئے تلمذ تہ کرنے اور ان کے فیض صحبت سے مستفیض ہونے کا موقع نصیب ہوا تھا۔ اس لئے یہ امر لازمی تھا کہ آپ عالمانہ فکر و شعور کے حامل ہوتے۔ چنانچہ آپ کے اسی عالمانہ فکر و شعور کا نتیجہ ہے کہ "ذوق نعت" میں بہت سے ایسے اشعار بھی ملتے ہیں۔ جو فکر انگیز ہونے کے ساتھ فلسفیانہ رنگ و آہنگ میں بھی ڈوبے ہوئے ہیں عموماً علمی و فلسفیانہ مضامین خشک ہوتے ہیں۔ اسی لئے انکو اشعار کے قالب شعریت کو برقرار رکھتے ہوئے ڈھالنا بڑا مشکل کام ہوتا ہے۔ آپ نے اس سمت بھی اپنی قادر الکلامی کے ایسے انمٹ اور لافانی نقوش چھوڑے ہیں جو ارباب فکر و نظر سے خراج تحسین وصول کئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اس نوع کے چند اشعار ضیافت طبع کے لئے حاضر خدمت ہیں۔ پڑھیں اور استاد زمن کی جودت فکر کو داد دیں۔ ے

چار اضداد کی کس طرح گرہ باندھی ہے
ناخن عقل سے کھلتا نہیں عقدہ تیرا

سچ ہے انسان کو کچھ کھو کے ملا کرتا ہے
آپ کو کھو کے تجھے پائے گا جویا تیرا

اونچی ہو کر نظر آتی ہے ہر اک شئی چھوٹی
جا کے خورشید بنا چرخ پہ ذرہ تیرا

خدا اگر نا ہوتا جو تحت مشیت!!
خدا ہو کر آتا یہ بندہ خدا کا

آخری شعر مفہوم و مقصد کے اعتبار سے بڑا ہی اچھوتا اور معنی خیز ہے۔ صحیح بات تو یہ ہے کہ اردو زبان کا نعتیہ ادب آج تک ایسے بلند پائے کا شعر پیش کرنے سے قاصر رہا ہے۔ اس شعر میں استاد زمن علیہ الرحمہ نے جس حسن و خوبی اور کمال چابک دستی کے ساتھ علم کلام کا سہارا لے کر اور اس حقیقت کو سامنے رکھتے ہوئے کہ ع

بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

آقائے نامدار سید الاخیار و ابرار روحی فداہ علیہ التحیۃ و الثنا کی تعریف و توصیف کی ہے۔ وہ آپ ہی کا حق تھا۔

عشق رسول

ایک مومن کامل کی پوری زندگی حقیقی معنوں میں عشق رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے عبادت ہوتی ہے۔ اور یہ جذبہ عشق اس کے قلب کو ایسا گداز عطا کرتا ہے۔ اور شمع نبوت کا ایسا والہ و شیدا بنا دیتا ہے کہ پھر اس کے نزدیک دنیائے فانی کی رعنائیاں گلشن ہستی کی رنگینیاں اور بہشت بریں کی عقل و قیاس سے ماورا زیبائیاں سب کی سب بے معنی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے لئے یہ ساری دلربا و دلکش چیزیں اپنی کشش کھو بیٹھتی ہیں۔ اسے اگر سکون ملتا ہے تو مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کے ذکر و تذکرہ میں اسے اگر کسی چیز میں کشش محسوس ہوتی ہے تو گلزار طیبہ کے خاروں میں۔ اگر ذرہ بربط ہستی پر کوئی نغمہ چھیڑتا ہے تو وہ نغمہ صرف رسول اقدس صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی مدحت سرائی کا آبشار ہوتا ہے۔ اس کا خانۂ دل اگر کسی جلووں سے معمور ہوتا ہے تو صرف پیارے نبی صلی اللہ تعالےٰ

علیہ وسلم کے جمال جہاں آرا کے جلووں سے ہے۔ اسے اگر کسی شئی پر فخر و ناز ہوتا ہے تو وہ صرف سرمایۂ عشق رسول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم ہے۔ کیونکہ وہ جانتا ہے کہ یہی سرمایۂ عشق دنیا میں بھی اس کے کام آنے والا ہے۔ قبر و حشر میں بھی، میزان و پل صراط پر بھی، اگر وہ تڑپتا ہے تو صرف محبوب خدا صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی یاد میں۔ کیونکہ یہ تڑپ ایسی لذت بخش اور روح پرور ہوتی ہے کہ وہ ایک لمحہ بھی اس لذت حیات بخش سے محروم نہیں ہونا چاہتا۔ استاد زمن علیہ الرحمہ ایک ایسے ہی عاشق رسول تھے۔ تاجدار نبوت صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا عشق آپ کے سینے میں کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ غالباً یہی سبب ہے کہ آپ کے نعتیہ کلام کا ایک ایک شعر صداقت، سادگی اور جوش کے ساتھ آپ کے آپ انیس بے کساں صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم سے والہانہ لگاؤ اور وارفتگیٔ شوق کا مظہر بھی ہے۔ ذیل میں برکتہً و نمونتہً ایک مکمل نعت پیش کی جا رہی ہے۔ جس میں کیف و سرور بھی ملے گا، جذبۂ عشق کی حرارت بھی ملے گی۔ اور صمرالنور دان عشق رسول کے زخمی دلوں کی تسکین کا سامان بھی ملے گا۔ ملاحظہ فرمائیں۔

شیر گلشن کون دیکھے دشت طیبہ چھوڑ کر
سوئے جنت کون جائے در تمہارا چھوڑ کر

سرگزشت غم کہوں کس سے تیرے ہوتے ہوئے
کس کے در پر جاؤں تیرا آستانہ چھوڑ کر

کون کہتا ہے دل بے مدعا ہے خوب چیز
میں تو کوڑی کو نہ لوں انکی تمنا چھوڑ کر

کس تمنا پر جئیں یارب اسیران قفس
آچکی باد صبا باغ مدینہ چھوڑ کر

بخشوانا مجھ سے عاصی کا روا ہوگا کسے
کس کے دامن میں چھپوں دامن تمہارا چھوڑ کر

حشر میں ایک ایک منہ تکتے پھرتے ہیں عدو
آفتوں میں پھنس گئے ان کا سہارا چھوڑ کر

مر کے جیتے ہیں جو ان کے در پہ جاتے ہیں حسنؔ
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر

خلاصہ کلام " ذوق نعت "، استاد زمن حضرت مولانا حسن رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کی کیف و نشاط سے معمور نعتوں، دلکش و دلآویز سلاموں، ایمان افروز حمد و منقبت اور چند بلند پایہ قطعات و رباعیات پر مشتمل ایک ایسا گراں قدر اور بیش بہا مجموعۂ نعت ہے جو فنی و شعری اوصاف و محاسن کا مکمل آئینہ دار ہونے کے باعث قابل قدر ادبی سرمایہ کی حیثیت رکھتا ہے جس کی ادبی اہمیت و افادیت سے صرف نظر کرنا کسی بھی انصاف پسند مورخ یا نقاد کے لئے ممکن نہیں ۔!!

ص ۱۹۰ کا بقیہ

میرے بھائی جن کو کہتے ہیں رضا
جو ہیں اس در کے گدا اچھے میاں

مجھ کو میرے بھائیوں کو حشر تک
ہو نہ غم کا سامنا اچھے میاں

ہم غلاموں کے جو ہیں لخت جگر
خوش رہیں سب دائما اچھے میاں

حضرت حسن بریلوی کی مذہبی اسلامی شاعری میں حمد باری تعالےٰ، نعت حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم، ذکر شہادت، داستان اہلبیت، مناقب صحابہ و اولیائے کرام روافض و خوارج، وہابیہ اور عقائد فاسدہ والوں کا رد اور ابطال اور اپنے عقائد صحیحہ کا اظہار واضح طور پر موجود ہے۔ حسن بریلوی کی یہی وہ خوبیاں ہیں جو دشمنان دین اور گمراہوں کے چشم و دل میں خار مغیلاں کی طرح پہلے بھی کھٹکتی رہیں اور آج بھی کھٹکتی ہیں۔ اسی لئے ان تذکرہ نویسوں نے جو باطل عقیدہ اور گمراہ نظریات کے حامل تھے حضرت حسن کے ذکر سے بالکل ہی پہلو تہی کی۔ لیکن اپنے لوگوں پر ہے جن لوگوں نے خاموشی کی اختیار کی اور اپنے قلم کو حرکت دینے کی زحمت بھی گوارہ نہیں کی۔ خدا کرے اب بھی وہ جمود و تعطل کو ختم کریں اور اپنے اسلاف کی سوانح اور حالات پر خامہ فرسائی کی سعادت حاصل کریں۔

اُستاذِ زمن کی نعتیہ شاعری کی ایک جھلک

مولانا محمد قمر الزماں مصباحی مظفر پوری مدیر مسئول ماہنامہ نور مصطفےٰ پٹنہ

جس طرح چمن میں رنگ برنگ کے پھول کھلتے ہیں اور رونق چمن کے ضامن ہوتے ہیں۔ اسی طرح گلشن شعر و سخن میں بھی نوع بنوع اور قسم ہا قسم کے پھول کھلے جو اپنی عطر بیزی، دلفریبی، دلکشی، دلآویزی اور پاکیزہ خوشبو سے پورے ماحول کو معطر کرتے رہے۔

حضور پُرنور شافع یوم النشور صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کے حضور نظم میں مدح وستائش اور تعریف و توصیف کی روایت بہت پرانی ہے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ سے لے کر حضرت حسن رضا بریلوی علیہ الرحمۃ تک شعراء ذوی الاحترام کی ایک طویل فہرست نظر آتی ہے جو اپنے اپنے عہد گرامی میں آفتاب و ماہتاب بن کر افق شاعری پر جگمگاتے رہے اور نعت کی شکل میں عشق و عقیدت، الفت و محبت اور لب ولہجہ کی انفرادیت کے ساتھ کیف و سرور اور نغمہ و ترنم کا وجد آفریں انقلاب برپا کرتے رہے۔

استاذ زمن حضرت علامہ حسن رضا بریلوی قدس سرہٗ ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء مطابق ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ کو ایک اعلیٰ خاندان اور علمی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ آپ کے والد گرامی امام الفقہاء حضرت علامہ مفتی نقی علی خان علیہ الرحمہ بہت بلند پایہ فقیہ اور زبردست عالم دین تھے۔ اس لئے تبحر علمی فکر و خیال کی تابانی اور شعور و آگہی کا سرمایہ آپ کو ورثہ میں ملا تھا آپ اپنے وقت کے جید عالم و فاضل ہونے کے ساتھ ساتھ صاحب تصانیف کثیرہ اور اپنے عہد کے معروف و مقبول شاعر بھی تھے۔ بہت ہی جگر کاوی اور جاں سوزی سے ایک مدت تک شعر و ادب کے گیسو کو سنوارتے رہے۔ "ثمر فصاحت" اور "ذوق نعت" کے مطالعہ سے یہ بات اظہر من الشمس ہو کر سامنے آتی ہے کہ آپ کو تمام اصناف سخن پر یکساں مہارت اور قدرت حاصل تھی۔ آپ کی شاعری آپ کی فکری توانائی، فن کی پختگی اور تخیل کی پاکیزگی کی غماز اور محمد عربی صلی اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم سے والہانہ عشق و وارفتگی کی مکمل ترجمان ہے۔ حسین کنایات، خوبصورت استعارات بلیغ تشبیہات، زبان کی سادگی و پرکاری، اسلوب بیان کی رعنائی، الفاظ کی موزونیت اور مضامین کی جامعیت آپ کے کمال فن کا بین ثبوت ہیں۔

پروردگار عالم نے جہاں آپ کو بہت سی خوبیاں بخشی تھی وہیں عشق رسول اللہ صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم کی وافر دولت بھی حصہ میں آئی تھی۔ اور عشق کے سوز کو جب زبان مل گئی تو شعر کے پیکر میں ڈھلتا چلا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کی شاعری روایتی نہیں بلکہ مکمل عشق کی زبان اور دل کی آواز ہے جو سوزش محبت بن کر عمر بھر یاد رسول میں تڑپنے کا مزہ دیتی رہی اور آپ نے اس تڑپ کو صرف جان سے زیادہ عزیز رکھا بلکہ سینے سے لگا کر اس سے آخرت کا سامان فراہم کرتے رہے یہ ان کا عشق ہی تو ہے کہ کوئے نبی سے دور رہ کر انھیں اپنی زندگی پھیکی اور بے نور معلوم ہو رہی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ع

ان کے در پہ موت آجائے تو جی جاؤں حسن
ان کے در سے دور رہ کر زندگی اچھی نہیں

اس گلی سے دور رہ کر کیا مریں ہم کیا جئیں
آہ ایسی موت ایسی زندگی اچھی نہیں

بلاشبہ آپ کی شاعری تصنع اور بناوٹ سے منزہ
اور پاک ہے۔ آپ کے کلام میں صداقت کی خوشبو اور رسول
ہاشمی صلے اللہ تعالےٰ علیہ وآلہ وسلم سے سچی محبت و شیفتگی
اور حقیقی سوز و گداز کا اہم عنصر ہر جگہ موجود ہے۔ زبان و بیان
کی دلبری، فکر و خیال کی بلندی اور تقدیس ذہن کی شیفتگی
کے ساتھ رموز و اسرار، حقائق و معارف اور عشق و محبت کے
چشمے ابلتے ہیں۔ ایک جگہ یوں فرماتے ہیں۔ ؎

نمازیں سب ادا ہو جائیں گی اس ایک سجدہ میں
نیاز عشق سر اٹھنے نہ پائے پائے جاناں سے

یہ سچ ہے کہ نعت گوئی کی راہ کانٹوں کا فرش ہے۔ جس پر
حسن و خوبی کے ساتھ چلنا اسی شاعر کا حصہ ہے جس کا ملکہ
فن شعور و آگہی کی توانائیوں سے لبریز ہو۔ شریعت پر گہری
نظر ہو۔ طبع مستقیم اور ذوق سلیم کا مالک ہو۔ شاعری کے جملہ
اصناف پر عمیق نگاہی کے ساتھ ساتھ عشق رسول اس کے
ضمیر کی آواز اور دل کی دھڑکن ہو۔

شرعی نقطہ نظر سے استاذ زمن کی شاعری کا جائزہ لیا جائے
تو آپ کی شاعری ہر شرعی گرفت سے محفوظ اور ہر طرح کے
سقم سے پاک ہے۔ اعلیٰحضرت عظیم البرکت امام احمد رضا
قدس سرہٗ فرماتے ہیں کہ "حسن میاں مرحوم کا کلام اول سے
آخر تک شریعت کے دائرہ میں ہے، ان کو میں نے نعت گوئی
کے اصول بتادیے تھے۔ ان کی طبیعت میں ان کا ایسا رنگ
رچا کہ ہمیشہ کلام اسی معیار اعتدال پر صادر ہوتا جہاں شبہ ہوتا
مجھ سے دریافت کر لیتے ایک غزل میں یہ شعر خیال میں آیا ؎

خدا کرنا ہوتا جو تحت مشیت
خدا ہو کے آتا یہ بندہ خدا کا

میں نے کہا ٹھیک ہے یہ شرطیہ ہے جس کے لیے مقدم
اور تالی کا امکان ضروری نہیں۔ اللہ عزوجل فرماتا ہے۔

قل ان کان للرحمٰن ولد فانا اول العابدین ۵

اے محبوب تم فرمادو کہ اگر رحمٰن کے لیے کوئی بچہ ہوتا تو اسے سب
سے پہلے میں پوجتا۔ ہاں شرط و جزا میں علاقہ چاہیے۔ وہ آیہ
کریمہ کی طرح یہاں بھی بر وجہ حسن حاصل ہے۔"
(ملفوظات شریف حصہ دوم ص ۴۴)

یہ تحریر پر تنویر علم و فضل کے اس مہر منیر کی ہے۔ جس کی
علمی شوکت اور فکری جلالت کا ڈنکا عجم سے لے کر عرب
تک بج رہا ہے۔ جن کی شخصیت دیگر علوم و فنون کی طرح
میدان شاعری میں بھی پیشوا اور امام کی حیثیت رکھتی ہے۔
ان کے اس مبارک تحریر کے اجالے میں استاذ زمن علامہ
حسن بریلوی قدس سرہٗ کی ذات شعر و سخن کے میدان میں بہت
ہی بلند و بالا نظر آتی ہے۔

آپ اپنے نعتیہ کلام کی اصلاح اپنے برادر گرامی وقار
عالم اہلسنت مجدد دین و ملت امام احمد رضا علیہ الرحمہ سے لیا
کرتے تھے ایک جگہ مقطع میں اسی کی طرف اشارہ کرتے
ہوئے کہتے ہیں۔ ؎

بھلا ہے حسن کا جناب رضا سے
بھلا ہو الٰہی جناب رضا کا

آپ اپنی غزل کی اصلاح مرزا داغ دہلوی سے لیا کرتے
تھے۔ مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ "شاگردان مرزا داغ
میں حسن مرحوم بریلوی کا پایہ شاعری بہت بلند تھا۔ وہ بجائے
استاذ خود مستند تھے۔" (اردوئے معلی)

اس تحریر سے بھی حضرت حسن بریلوی قدس سرہٗ کی شاعرانہ
صلاحیت، فنی بصیرت، ادبی لطافت اور علمی کر و فر کی خوب
خوب تائید ہوتی ہے۔

آپ کا غزلیہ دیوان ہو یا نعتیہ، ان میں سے ہر ایک آپ
کے سوز و کرب، درد و اضطراب کا غماز و جذبات صادقہ کا
بہترین مرقع، اور واردات عشق کا ایک پر بہار چمن ہے
جس میں آپ نے رسول گرامی وقار صلے اللہ تعالےٰ علیہ
وآلہ وسلم سے بے پناہ عشق و عقیدت اور والہانہ محبت کے
ایسے ایسے پھول کھلائے ہیں کہ جس کی خوب صورتی، زیب و
زینت اور حسن و دلبری پر تاج محل کی رعنائی سو جان سے
قربان ہوا چاہتی ہے۔ ان کے عشق کا بانکپن آپ بھی ملاحظہ
کیجیے۔ ؎

خار صحرائے نبی پاؤں سے کیا کام تجھے
آ مری جان مرے دل میں ہے رستہ تیرا

اس شعر میں جہاں تغزل کی بھرپور چاشنی موجود ہے وہیں

اسلوب بیان کی دلکشی، زبان کی سادگی، عقیدت کی سرشاری
محنت کی لالہ کاری اور عشق کی نغمگی کی ایک دنیا آباد ہے۔
ڈاکٹر ابواللیث صاحب لکھتے ہیں۔

" نعت گوئی کی فضا جتنی وسیع ہے اتنی ہی اس
میں پرواز مشکل ہے۔ پرواز سے پہلے یہ دیکھنا
پڑتا ہے کہ فضا ساز گار ہے کہ نہیں اگر ہمت
پرواز مشکل مقام پر پہونچا دے تو اڑنے والے
کا یہ کمال ہونا چاہیئے کہ وہ اور کامیابی کے ساتھ
وہاں سے گزر جائے۔

(لکھنؤ کا دبستان شاعری ص ۴۹۷)

اس تحریر کے تناظر میں جب ہم استاذ زمن حضرت
علامہ حسن بریلوی قدس سرہ کی شاعری کا مطالعہ کرتے ہیں تو آپ
کی شخصیت ہر زاویے سے کامل و مکمل و اکمل نظر آتی ہے۔ اور
ایک بلند پایہ شاعر کی حیثیت سے ابھر کر نگاہوں کے سامنے
آتی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ عشق کے بہاؤ میں فن شاعری
کا کوئی اصول مجروح ہوا ہو یا شریعت کے تقدس کو جراحت
پہونچی ہو۔ بلکہ آپ کی شاعری عشق رسول کا مکمل شرح و بیان
ہونے کے باوجود حد شرع کو تجاوز بھی نہیں ہے اور ہر شعر میں
فن عروض کی کامل جلوہ گری بھی موجود ہے۔

عروض و قوافی کی روشنی میں اگر آپ کی شاعری کا تجزیہ
کیا جائے تو صنعت تلمیح بھی دیکھنے کو ملتی ہے اور صنعت تضاد
بھی، صنعت تلمیع بھی اور صنعت اقتباس بھی۔

صنعتِ تلمیح:۔ متکلم کا اپنے کلام میں کسی آیت یا حدیث
یا کسی مشہور واقعہ یا کسی کہاوت کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہو۔
استاذ زمن فرماتے ہیں۔

جو رکھتا ہے جمالِ مَنْ رَاٰنی
اسی موتھ کی صفت ہے وَالضُّحٰی خاص

جو کچھ تیری رضا ہے خدا کی وہی رضا
جو کچھ تیری خوشی ہے خدا کو وہی عزیز

وہ گریہ استن حنانہ کا آنکھوں میں پھرتا ہے
حضوری نے بڑھایا تھا جو پایا اوج منبر کا

سوزن گم شدہ ملتی ہے تبسم سے تیرے
شام کو صبح بناتا ہے اجالا تیرا

الٰہی تشنۂ کام ہجر دیکھیں دشت محشر میں
برسنا ابر رحمت کا چھلکنا حوض کوثر کا

حسن کیوں پاؤں توڑ بیٹھے ہو طیبہ کا رستہ لو
زمین ہند سرگرداں رکھے گی آسماں ہو کر

صنعتِ تلمیع:۔ کلام میں کسی دوسری زبان کا استعمال کرنا
یا شعر کا ایک مصرعہ ایک زبان میں ہو اور دوسرا مصرعہ
دوسری زبان میں ہو۔ استاذ زمن فرماتے ہیں۔

من رآنی فقد رای الحق ...!
حسن یہ حق بنا ہوا تیرا..!

سبقت رحمتی علی غضبی!
تو نے جب سے سنا دیا یا رب

ہے انا عند ظن عبدی بی
میرے ہر درد کی دوا یا رب

صنعتِ اقتباس:۔ قرآن کی ایک آیت یا اس کا
جزو یا حدیث کا ٹکڑا لایا جائے۔ استاذ زمن لکھتے ہیں۔

گدا خوش ہو خیر لکَ کی صدا سے
کہ دن دونی ہے بڑھتی دولت کسی کی

فترضٰی نے ڈالی ہیں باہیں گلے میں
کہ ہو جائے راضی طبیعت کسی کی

رفعنا لکَ ذکرکَ پر تصدق!
سب اونچوں سے اونچی ہے رفعت کسی کی

اترنے لگے ما رمیت ید اللّٰہ
چڑھی ایسی زوروں پہ طاقت کسی کی

ورفعنا لکَ ذکرکَ کے چمکتے خورشید
لامکاں تک ہیں اجالے تیری زیبائی کے

کشف راز مَن رآنی سے یوں ہوا
تم ملے تو حق تعالیٰ مل گیا

کہیں گے اور نبی اذھبوا الیٰ غیری
میرے حضور کے لب پر انا لہا ہوگا

صنعتِ تضاد:۔ ایک ہی شعر میں دو لفظ ایک جنس کا

باقی ص ۶۸

سید وجاہت رسول قادری صدر ادارہ تحقیقات امام احمد رضا۔ کراچی پاکستان

حضرت حسن بریلوی کا ذوق نعت گوئی

حسن نعت و چنیں شیریں بیانی
جسکی جاں ہو اس دست کرم پہ نثار
تو خوش باشی کہ کردی وقت ما خوش

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں حضرت حسن بریلوی علیہ الرحمۃ ایک منفرد مقام کے حامل ہیں۔ اردو کے چوٹی کے غزل گو شعراء میں آپ کا شمار ہوتا ہے۔ آپ داغ دھلوی مرحوم کے خاص شاگرد اور صحیح جانشین تھے۔ آپ کی عشقیہ شاعری پر تبصرہ کرتے ہوئے اردو کے مشہور نقاد اور مصنف لالہ سری رام لکھتے ہیں:

آپ کا عاشقانہ کلام آپ کے بعد طبع ہوا جو فی الحقیقت بہت اچھا ہے، صفائی، سادگی، بندش اور شوکت الفاظ کے علاوہ پرورد اور موثر بھی ہے، طرز بیان میں سادگی کے ساتھ تیکھا پن غضب کا ہے تعقید اور آورد کا شروع سے آخر تک نام و نشان بھی نہیں ہے، اکثر مصرعِ ثانی کی نسبت مصرعِ اولیٰ کے الفاظ کو الٹ پلٹ کر اس خوبی سے مصرعِ ثانی کا مضمون پیدا کر لیتے ہیں کہ تعریف نہیں کی جاسکتی۔ بول چال اور محاورات میں بھی حرف گیری کی کم گنجائش ہے۔ الغرض آپ کا مذاق شعر پاکیزہ اور اسلوب بیان قابل تعریف ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نواب فصیح الملک مرزا داغ دھلوی کے تلامذہ میں آپ ایک امتیازی درجہ رکھتے۔۔۔ اور کچھ عجب نہیں کہ اگر زندگی مستعار وفا کرتی اور یہ مشغلہ قائم رہتا تو ان کے نام کو جلا دیتے۔" [۱]

ایک بلند رتبہ شاعر ہونے کے علاوہ حسن رضا بریلوی کا شمار ہندوستان کے جید علماء میں بھی ہوتا ہے، انہوں نے علوم دینیہ، عقلیہ اور نقلیہ کی تکمیل اپنے والد ماجد خاتم الفقہاء علامہ نقی علی خاں علیہ الرحمۃ سے اور پھر اپنے برادر گرامی امام احمد رضا خاں محدث بریلوی علیہ الرحمۃ سے کی۔ طریقت میں آپ کو حضرت مولانا علامہ سید ابو الحسین احمد نوری مارہروی قدس اللہ سرہ العزیز سے قادریہ سلسلہ میں بیعت و اجازت و خلافت حاصل تھی۔ ایک روایت کے مطابق اپنے برادر بزرگ اعلیٰ حضرت احمد رضا خاں محدث بریلوی سے بھی اجازت و خلافت آپ کو حاصل تھی۔ [۲]

حسن بریلوی کی عظمت شاعری کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ

آپ بلبل ہند فصیح الملک نواب مرزا داغ دھلوی مرحوم کے خاص تلامذہ سے تھے، ایک مدت تک ریاست رامپور میں رہ کر استاد کے گلشن سخن سے گل چینی فرماتے رہے، ۳؎ چنانچہ ایک جگہ آپ فخریہ فرماتے ہیں ؂

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذت سوز و گداز
اے حسنؔ شاگرد ہوں میں داغ سے استاد کا

داغ دھلوی کو بھی آپ سے خاص شفقت و محبت کا تعلق تھا اور اسی تعلق کی بناء پر آپ کو "پیارے شاگرد" کہہ کر مخاطب کرتے تھے جس کا اظہار جناب حسنؔ بریلوی اپنے شعر میں یوں فرماتے ہیں! ؂

"پیارے شاگرد" تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزہ کہیئے

○ اس وقت کے اردو شعر و ادب کے عظیم نقاد اور رئیس المتغزلین قسم کے شعراء نے آپ کی شاعری کی تحسین کی ہے اور آپ کے ذوق سخن کو خراج عقیدت پیش کیا ہے، لالہ سری رام ایم۔ اے دھلوی کا تبصرہ آپ کی نظروں سے گذرا اسی طرح رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی (م۔ ۱۳۷۱ھ / ۱۹۵۱ء) نے ان کے شاعرانہ کمالات پر ایک مقالہ قلمبند کیا جو اردوئے معلیٰ میں شائع ہوا ۴؎

○ تیسرے یہ کہ نعتیہ شاعری میں اپنے برادر بزرگ حسان الھند واصف شاہِ ھدیٰ امام احمد رضا خاں رضا بریلوی سے آپ کو خاص شرف تلمذ حاصل تھا، حسان الھند نے خود حسنؔ بریلوی کے نعتیہ کلام کو ان الفاظ میں سراہا ہے

"ان کو میں نے نعت گوئی کے اصول بتائے تھے، ان کی طبعیت میں ان کا ایسا رنگ رچا کہ ہمیشہ کلام اس میعار اعتدال پر صادر ہوتا۔ جہاں شبہہ ہوتا، مجھ سے دریافت کر لیتے" ۵؎

پھر فرماتے ہیں۔

"سوا دو کلام مولانا کفایت علی کافی م ۱۲۷۴ھ اور حسنؔ بریلوی کے، کسی کلام میں قصداً نہیں سنتا، مولانا کافیؔ اور حسنؔ میاں مرحوم کا کلام اوّل سے آخر تک شریعت کے دائرے میں ہے" ۶؎

مزید بیان کرتے ہیں۔

"غرض ھندی نعت گویوں میں ان دو کا کلام ایسا ہے، باقی اکثر دیکھا گیا ہے کہ قدم ڈگمگا جاتا ہے اور حقیقتاً نعت شریف لکھنا نہایت مشکل ہے کہ لوگ نہایت آسان سمجھتے ہیں، اس میں تلوار کی دھار پر چلنا ہے اگر بڑھتا ہے تو الوھیت میں پہنچ جاتا ہے اور کمی کرتا ہے تو تنقیص ہوتی ہے" ۷؎

فن نعت گوئی سے متعلق امام احمد رضا بریلوی قدس اللہ سرہ العزیز کا تبصرہ بالکل صحیح ہے کہ موضوع اور فن کے اعتبار سے نعت شریف ایک سب سے اہم موضوع سخن ہے، ایک ذرا سی لغزش یا فن کی ایسی رعایت جو حدِ ادب سے بے نیاز بنانے والی یا بے خبر کرنے والی ہو، متاعِ ایمان کو متاعِ کاسد بنا کر رکھ دیتی ہے،

بقول عرفی شیرازی :- ؎

عرفی متشاب ایں رہِ نعت است نہ صحرا

ہشیار رہ بردم تیغ است قدم را

غرض کہ حسن بریلوی نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی وہاں کے ماحول فضاؤں میں محبت الٰہی اور عشق رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کے ایمان پرور نغمات رچے بسے تھے، شیفتگی رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی خوشبوؤں سے وہاں کے گلی کوچے معطر معطر تھے، اور جس برادر گرامی قدر کی صحبت و رہنمائی اُن کو نصیب ہوئی وہ رسول مکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے شیدائی کہ فنافی الرسول کے مقام پر فائز تھے اور ایسے عاشق صادق اور گدائے غاشیہ بردار کہ جن کی غیرت عشق احتمال کے درجے میں بھی توہین رسول کا کوئی مخفی سے مخفی پہلو بھی برداشت کرنے کو تیار نہ تھی، دم آخریں اپنے عقید تمندوں اور وارثوں کو جو وصیت کی وہ بھی یہی تھی کہ :

” جس سے اللہ اور رسول کی شان میں ادنیٰ توہین پاؤ پھر وہ تمہارا کیسا ہی پیارا کیوں نہ ہو، فوراً اس سے جدا ہو جاؤ، جس کو بارگاہِ رسالت میں ذرا بھی گستاخ دیکھو پھر وہ کیسا ہی بزرگ معظم کیوں نہ ہو اپنے اندر سے دودھ کی مکھی کی طرح نکال کر پھینک دو “ ؎۹

اسی عظیم ہستی نے جناب حسن کی تربیت کی اور نعت گوئی کے آداب اور محبت رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں شائستگی گفتار کے انداز سکھائے یہی وجہ ہے کہ آپ کے کلام کا ہر شعر ذوق و مستی اور عشق رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وسلم) میں ڈوبا ہوا اور اس کے ساتھ ہی ساتھ لذتِ زبان و بیان اور شائستگی گفتار کا بہترین نمونہ ہے جناب حسن نے اپنے برادر محترم رضا بریلوی کی کرم گستریوں کا اعتراف اپنے ایک دعائیہ مقطع میں یوں کیا ہے ؎

بھلا ہے حسن کا جناب رضا سے

بھلا ہو الٰہی جناب رضا کا

زبان و بیان کی شائستگی کا انداز حضرت حسن رضا کے اس شعر میں ملاحظہ ہو ؎

جلوۂ یار ادھر بھی کوئی پھیرا تیرا

حسرتیں آٹھ پہر تکتی ہیں رستا تیرا

آپ نے دیکھا کہ بارگاہ رسالت کا ادب انہیں محبوب رب العالمین کو ان کے اسم گرامی کے ساتھ ندا نہیں کرنے دیتا، بلکہ وہ ”جلوۂ یار“ کو مخاطب کرتے ہیں، سبحان اللہ! اور ایسا کیوں نہ ہو کہ ان کی نظروں میں صحرائے مدینہ کا بھی وہ ادب ہے کہ اس کے خار بھی ان کو اپنے دل و جان سے زیادہ عزیز ہیں ؎

خارِ صحرائے نبی، پاؤں سے کیا کام تجھے

آمری جاں مرے دل میں ہے رستا تیرا

اگر نعت گو شاعر انداز بیان میں طرفگی پیدا کر دکھائے تو یہ اس کا کمال شاعری ہے۔ حسن بریلوی کے نعتیہ کلام کی یہ خوبی ہے کہ وہ زبان و بیان کی تمام خوبیوں کے ساتھ شعر کہتے ہیں، روزمرہ اور محاورات کا کثرت سے استعمال کرتے ہیں، سلیقہ اور نظم و ضبط کے ساتھ انداز بیان کی شوخی اور شائستگی گفتار کے جلوے بھی جابجا دکھاتے ہیں مگر زبان و بیان پر قدرت کا یہ عالم

سے کہ عالم دیوانگی اور کیفیتِ جذب و مستی میں بھی
ان حدود سے تجاوز نہیں کرتے جو اربابِ ایمان و
شریعت نے اس راہ میں متعین کر دی ہیں۔ چند مثالیں
ملاحظہ ہوں ان اشعار کو پڑھ کر ان کی تمنائے دل
کی داد دیجئے:۔

موت اس دل کو جو بھر نام وطن کا لیتا
خاک اس سر پہ جو اس در سے کنارا کرتا

ان کے صدقے میں عذابوں سے چھٹے
کام اپنا نام ان کا ہو گیا

ظاہر ہیں حسن احمد مختار کے معنی
کونین پر سرکار کا قابو نظر آیا

یہ بیٹھا ہے سکہ تمہاری عطا کا
کبھی ہاتھ اٹھنے نہ پایا گدا کا

ان کے جلوؤں میں ہیں یہ دلچسپیاں
جو وہاں پہنچا وہیں کا ہو گیا

محاورات کے استعمال میں بے ساختہ پن اور آمد
کی شان بھی دیکھئے:۔

اگر قسمت سے میں ان کی گلی میں خاک ہو جاتا
غمِ کونین کا سارا بکھیڑا پاک ہو جاتا

اگر پیوند ملبوسِ پیمبر کے نظر آتے
ترا اے حلۂ شاہی کلیجہ چاک ہو جاتا

حسن اہل نظر عزت سے آنکھوں میں جگہ دیتے
اگر یہ مشتِ خاک ان کی گلی میں خاک ہو جاتا

حشر میں ایک ایک کا منہ تکتے پھرتے ہیں عدو
آفتوں میں پھنس گئے ان کا سہارا چھوڑ کر

بہاریں تازہ رہتیں کیوں خزاں میں دھجیاں اڑتیں
لباسِ گل جو ان کی بلگی پوشاک ہو جاتا

ہاتھ خالی کوئی پھرا نہ پھرے
ہے خزانہ بھرا ہوا تیرا

حسن ہے بے مثل صورت لاجواب
میں فدا، تم آپ اپنا ہو جواب

آدابِ نعت کو ملحوظِ خاطر رکھتے ہوئے
اندازِ بیاں کی شوخی پیدا کرنا ایک مشکل امر ہے
لیکن جناب حسن یہ مشکل بھی کس آسانی سے طے کرتے
ہیں:

تجلی گاہِ جاناں تک اجالے سے پہنچ جائے
جو تو اے توسنِ عمرِ رواں چالاک ہو جاتا

قیدیوں کی جنبشِ ابرو سے بیڑی کاٹ دو
ورنہ جرموں کا تسلسل سوئے زنداں لے چلا

گل نہ ہو جائے چراغِ زینتِ گلشن کہیں
اپنے سر میں مت ہوائے دشتِ جاناں لے چلا

دیکھ کر ان کا فروغِ حسن پا
مہر ذرہ چاند تارا ہو گیا

ہمیشہ رہروانِ طیبہ کے زیرِ قدم آئے
الٰہی کچھ تو ہو اعزاز میرے کاسۂ سر کا

محبوب کے قدموں یا اس کے در پہ سر دینا تو سنا ہے
لیکن مشتاقانِ دیارِ محبوب کے قدموں میں کاسۂ
سر کا نذرانہ پیش کر کے اعزاز حاصل کرنے کی انوکھی
تمنا، حسن بریلوی کے عشق کی ایجاد و کمال ہے
حضرت حسن بریلوی کے نعتیہ کلام میں زبان کی سادگی
و سلاست کا حسن، طرزِ ادا کا بانکپن اور اندازِ بیان کی
جدت و ندرت کے بارے میں ادیب شہیر حضرت
شمس بریلوی رقمطراز ہیں:۔

" صفائی زبان میں انہوں نے اپنے استاد داغ دہلوی

کی پوری پوری تقلید کی ہے اور یہ ان کا کمال شاعری ہے کہ نعت شریف میں انھوں نے سادگی زبان اور محاورے کی چاشنی کو برقرار رکھا ہے ورنہ نعت گوئی کے لیے شکوہ الفاظ اور جدت تراکیب ضروری لوازم ہیں،، لے

حضرت حسن کی نعتیہ شاعری میں جدت فکر اور ندرت تخیل کی معنوی خصوصیات بھی جا بجا پائی جاتی ہیں:

قرآں کے حواشی سے جلالین نکھی ہے
مضموں یہ خط عارض جاناں سے نکالا

آسماں گر ترے تلوؤں کا نظارا کرتا
روز اک چاند تصدق میں اتارا کرتا

اس چہرۂ پر نور کی وہ بھیک تھی جس نے
مہر و مہ و انجم کو پر انوار بنایا

کمند رشتۂ عمر خضر پہنچ نہ سکے
بلند اتنا ہے ایوان بارگاہ رفیع

کر گیا آخر لباس لالہ و گل میں ظہور
خاک میں ملتا نہیں خون شہیدان جمال

یہ تمام اشعار جدت فکر اور ندرت خیال کے حسن معنوی کی مثال آپ ہیں۔ حسن بریلوی کا نعتیہ دیوان "ذوق نعت" ایسے متعدد اشعار سے بھرا پڑا ہے ان کے مقام کو سمجھنے کے لیے صرف آخری شعر پر غور کریں تو جو ندرت اور مضمون آفرینی اس شعر میں نظر آرہی ہے وہ کسی بھی نعتیہ شاعر کے اسی قسم کے مضمون کے بیان میں شاید ہی نظر آئے غالب خستہ نے بھی اس سے ملتا جلتا شعر کہا تھا ؎

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

لیکن حسن بریلوی نے ،، خون شہیدان جمال ،، کو لباس لالہ و گل " پہنا کر جو اعزاز و اکرام بخشا ہے اس کا جواب نہیں اور ساتھ ہی یہ عقیدہ بھی دیا کہ عاشق صادق کبھی مرتا نہیں بلکہ وہ جمال حقیقی میں فنا ہو اس سے حیات دوام حاصل کرلیتا ہے اور جمال حقیقی کا پرتو بن جاتا ہے حقیقت یہ ہے کہ حسن بریلوی کا نعتیہ کلام شعری حسن و جمال کی تمام مسلمہ خوبیوں سے آراستہ پیراستہ ہے اور اردو نعتیہ شاعری کے شاہکار کی حیثیت سے دنیائے شعر و ادب کے سامنے فخریہ پیش کیا جاسکتا ہے، صنائع و بدائع " کی مثالیں بھی حسن رضا بریلوی کی نعتیہ شاعری میں بکثرت ملتی ہیں۔ صنائع لفظی میں انھوں نے صنعت عکس، جسکو " رد العجز علی الصدر و رد الصدر علی العجز۔ " بھی کہتے ہیں، کو بڑی خوبی چابکدستی سے استعمال کیا ہے کہ بے ساختہ داد نکلتی ہے چند نمونے ملاحظہ فرمائیں

کونین بنائے گئے سرکار کی خاطر
کونین کی خاطر تمھیں سرکار بنایا

دیواروں کو آئینہ بناتے ہیں وہ جلوے
آئینوں کو جن جلوؤں نے دیوار بنایا

جو بندہ خدا کا وہ بندہ تمہارا
جو بندہ تمہارا وہ بندہ خدا کا

وہ جب تشریف لائے گھر سے در تک
بھکاری کا بھرا ہے در سے گھر تک

کلام حسن کا ایک امتیاز یہ بھی ہے کہ یہ پاکیزہ اور لطیف تشبیہوں اور استعاروں سے بکثرت مزین ہے،

تشبیہات

قبلہ کا بھی کعبہ رخ نیکو نظر آیا
کعبہ کا بھی قبلہ خم ابرو نظر آیا۔

ہے حسنِ گلوئے مہِ بطحا سے روشن
اب مہرِ سرِ ان کے گریبان سے نکلا

اے نظمِ رسالت کے چمکتے ہوئے مقطع
تو نے ہی اُسے مطلعِ انوار بنایا

ہے خاک پہ نقشِ کفِ پا تمہارا
آئینہ ہے بے غبار آقا

استعارات

اگر اس خندۂ دنداں نما کا وصف موزوں ہو
ابھی لہرا اٹھے بحرِ سخن سے چشم گوہر کا

سجدے کو جھکا جائے براھیم میں کعبہ
جب قبلۂ کونین کا ابرو نظر آیا

دیکھو رضواں دشتِ طیبہ کی بہار
میری جنت کا نہ پائے گا جواب

صدقے ترے اے مردمکِ دیدۂ یعقوب
یوسف کو تری چاہ نے کنعاں سے نکالا

الحاصل یہ کہ خارجی اور داخلی اعتبار سے جناب حسن بریلوی کی نعتیہ شاعری میں وہ تمام پہلو اور خصوصیات موجود ہیں جو قادر الکلام اور استادِ فن شاعر کے یہاں تصور کی جا سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہمعصروں نے ان کو "استادِ زمن" کے خطاب سے نوازا اور بہت سے نامور شعراء نے آپ سے اصلاح لی اور متعدد شعراء نے آپ کے آگے زانوئے ادب تہہ کیا بریلی، رامپور، بدایوں اور اس کے گرد و نواح میں آپ کے کافی تلامذہ موجود تھے، ان میں بعض کا ذکر آر۔ بی مظہری نے اور بعض کا لالہ سری رام دہلوی ایم۔ اے نے اپنی تصنیف خمخانۂ جاوید میں کیا ہے[1] جناب حسن رضا بریلوی کے یہاں ایسے اشعار بھی بکثرت ملتے ہیں جن میں آیاتِ قرآنی اور احادیث و اخبار سے اقتباس کیا ہے، لیکن ان کے درکِ معانی کے لئے ایسے شعور کی ضرورت ہے جو قرآن و حدیث و اخبار و آثار پر گہری نظر رکھتا ہو یہ میرا منصب و مقام نہیں اسلئے محض چند مثالوں پر اکتفا کرتا ہے۔

کیا خبر ہے کہ "علی العرش" کے معنی کیا ہیں
کہ ہے عاشق کی طرح عرش بھی جویا تیرا

"ارنی" گوئے سرِ طور سے پوچھے کوئی
کس طرح غش میں گراتا ہے تجلی تیرا

ان کی پاکی کا خدائے پاک کرتا ہے بیاں
آئینہ تطہیر ہے ظاہر ہے شانِ اہلبیت

"قل" کہکر اپنی بات بھی سب سے ترے سنی
اللہ کو ہے اتنی تری گفتگو پسند

وہ جس رہ سے گذرتے ہیں بسی رہتی ہے مدت تک
نصیب اس گھر کے جس گھر میں وہ ٹھہریں مہماں ہو

منزلِ رشد کے نجوم اصحاب
کشتیِ خیر داماں آلِ رسول

جلوہ شانِ الٰہی کی بہاریں دیکھو
"قد رأ الحق" کی شرح زیارت ان کی

آخر میں گذارش ہے کہ حضرت حسن رضا بریلوی اس خانوادہ کے چشم و چراغ ہیں جو علم و فن اور فضل و شرف کے اعتبار سے بلند مقام کا حامل ہے جن میں ایسی شخصیات نے جنم لیا جو اپنے اپنے دور میں علم و فضل کے آفتاب ماہ تاب بن کر چمکے اور ایک زمانے کو مستنیر اور منور کیا، علامہ کاظم علی خاں علامہ رضا علی خاں علامہ نقی علی خاں امام احمد رضا خاں، علامہ حامد رضا خاں مفتی اعظم ہند مصطفیٰ رضا خاں ہر ایک شخصیت علم و فضل

کے اعتبار سے ایسی بھاری بھرکم ہے کہ ہر ایک تحقیق تدقیق کا ایک مستقل عنوان ہے۔ حسنؔ بریلوی بھی ایسی خانوادے کے ایک ایسے ہی نیر تاباں ہیں۔ دیکھئے جاؤ تو ع

این خانہ ہمہ آفتاب است

ایسے عالم و فاضل شاعر کے کلام پر نقد و نظر کا کام شعری ادب پر گہری نظر، علوم عقلیہ و نقلیہ پر کامل دسترس، علوم اسلامیہ سے گہرا شغف اور وسعت علمی کا متقاضی ہے۔ فقیر کو اپنی علمی اور بے مائیگی، اور شعور و آگہی کی بے بضاعتی کا احساس ہے، محض تعمیل حکم اور حصول برکت کے لئے چند سطریں سپرد قلم کی ہیں، ضرورت اس بات کی ہے کہ اس مبارک خانوادہ کی علمی شخصیات خصوصاً علامہ نقی علی خاں، علامہ رضا علی خاں، علامۃ الدھر امام احمد رضا خاں، مولانا حسن رضا خاں، علامہ حامد رضا خاں، مفتی اعظم ہند علامہ مصطفےٰ رضا خاں علیہم الرحمۃ کی حیات اور علمی کارناموں پر سیر حاصل مقالات محققین فن سے تحریر کروائے جائیں، عالمی جامعات میں ان پر ڈاکٹریٹ کے لئے ترغیب دی جائے اور ان کے علمی ادبی شعری شہ پاروں کو ایک منضبط طریقہ کار کے تحت اور جدید تقاضوں کے ساتھ شائع و طبع کروا کر اہل علم و دانش تک پہنچایا جائے۔ اور مسلسل جدوجہد کر کے اسکول و کالج اور جامعات کے نصاب میں علم و فن کی فروغ کے اعتبار سے داخل نصاب کروا یا جائے

ماہنامہ "سنی دنیا" اور اس کے فاضل مدیر جناب شہاب الدین صاحب اختر القادری زید مجدہٗ قابل صد مبارک ہیں کہ انہوں نے استاذِ زمن حضرت حسنؔ بریلوی کی نعتیہ شاعری پر ایک تحقیقی اور علمی کاوش کا آغاز کیا ہے

میں بارگاہ الٰہی میں دعا گو ہوں کہ اللہ ان کی اس عظیم جدوجہد کو اور میری اس حقیر کاوش کو قبول فرمائے اور استاذ زمن حضرت حسنؔ رضا حسنؔ بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان کی بارگاہِ رسالت مآب (صلی اللہ علیہ وسلم) میں عقیدت کیشوں کے ثمرات خیر و برکات سے ہم سب کو حصہ عطا فرمائے اور "ذوقِ نعت" کی برکتوں سے ہم قلب و نگاہ مجلیٰ و مصفیٰ کر دے۔

دعا خدا سے غم عشق مصطفےٰ کی ہے
حسنؔ یہ غم ہے نشاط و سرور کی رونق

ــــ ٥٥ ماخذ ٥٥ ــــ

(۱) خمخانۂ جاوید، ج ۲۔ ص ۱۵۱ مطبوعہ دہلی ۱۹۱۱ء

(۲) زبانی روایت حضرت علامہ تقدس علی خان (۳) پروفیسر ڈاکٹر مجید اللہ قادری / محمد صادق قصوری، خلفاء اعلیحضرت حاشیہ ص ۲۲۴، مطبوعہ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی ۱۹۹۲ء (۴) پروفیسر ڈاکٹر مسعود احمد حیات مولانا احمد رضا خاں بریلوی ص ۱۵۲ مطبوعہ سیالکوٹ ۱۹۸۱ء

(۵) ایضاً ص ۱۵۲ (۶) ایضاً ۱۵۳ (۷) ایضاً ص ۱۵۲

(۸) مولانا کوثر نیازی، امام احمد رضا خاں بریلوی ایک ہمہ جہت شخصیت، ص ۶ (۹) حسنین رضا خاں وصایا شریف مطبوعہ مبارکپور

(۱۰) شمس بریلوی، مقدمہ ذوق نعت، بعنوان "حضرت حسن رضا بریلوی کی نعت گوئی اور ان کے دیوان ذوق نعت پر ناقدانہ نظر" ص ۱۲ مطبوعہ مدینہ پبلشنگ کراچی

(۱۱) ۱- خمخانۂ جاوید ج ۲۔ ص ۹۸ مطبوعہ دہلی
۲- آربی مظہری، امام احمد رضا دنیائے صحافت میں، ص ۱۳، مطبوعہ مرکزی مجلس رضا لاہور ۱۹۸۳ء

حسن داغ کے پیارے شاگرد

ڈاکٹر اسعد بدایونی ——— مسلم یونیورسٹی علیگڑھ

"داغ کے اہم تلامذہ" اسعد بدایونی کی ایک کتاب کا نام ہے جسے مکتبہ جامعہ دہلی، علیگڑھ اور بمبئی نے شائع کیا ہے۔ یہ کتاب دراصل اسعد بدایونی کا مقالہ ہے جس پر علیگڑھ مسلم یونیورسٹی نے انہیں ۱۹۸۵ء میں ایم۔ فل کی ڈگری دی ہے۔

اس میں بدایونی صاحب نے داغ دہلوی کے گیارہ اہم تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں۔ اعلیٰحضرت امام احمد رضا کے برادر اوسط حضرت علامہ حسن رضا خاں حسن بریلوی کو انہوں نے تلامذہ داغ میں تیسرے نمبر پر جگہ دی ہے۔ اوّل اور دوم نمبر پر بیخود بدایونی اور بیخود دہلوی کو رکھا ہے۔

اس مقالہ میں حضرت علامہ حسن علیہ الرحمہ کی بہاریہ شاعری کے نمونے پیش کئے گئے ہیں۔ حضور علامہ حسن رضا خاں صاحب کو شاعری ومنقبت کی حیثیت سے لوگ زیادہ جانتے ہیں۔ اور شاعر بہار وشاعر غزل کی حیثیت سے کم ہی لوگ واقف ہیں۔

حضرت حسن نے داغ دہلوی کی بہاریہ شاعری میں تلمذ اختیار کی مگر نعتیہ شاعری میں ان کے استاد برادر اکبر امام شعر وسخن حضور اعلےٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی قدس سرہٗ العزیز ہیں۔ حضور اعلےٰ حضرت نے حضرت کافی اور حضرت علامہ حسن علیہما الرحمہ ہی کی نعتیہ شاعری کو سراہا ہے۔ بس کہ جن کے یہاں کوئی شرعی خامی بالکل نہیں ہے۔ داغ دہلوی نے حضور اعلےٰ حضرت کے اشعار سنکر بڑی تعریف کی تھی۔ اور ایک مولوی کے اتنے اچھے اشعار پر اظہار حیرت بھی کیا تھا۔ داغ بے چارے عظمت امام سے واقف ہی کیا تھے۔ داغ دہلوی نے حضرت حسن علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری کی بھی تعریف کی ہے۔ اور یہاں تک کہا ہے کہ "اگر میں نعتیہ شاعری کرتا تو حسن کو اپنا استاد بناتا۔"

داغ دہلوی حضرت حسن کی بہاریہ شاعری کے بھی بہت مداح تھے اور اپنے تلامذہ میں انھیں سرفہرست رکھا ہے۔ وہ ان کا احترام بھی کرتے تھے۔ یوں تو سبھی تذکروں اور تواریخ میں حضرت حسن رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ کا ذکر ہے۔ مگر شاعر بہار ہی کی حیثیت سے۔ خمخانہ جاوید از لالہ سری رام جلد دوم ص ۴۵۰ پر ان کا ذکر بہتر انداز میں ملتا ہے۔ حضرت حسن کی بہاریہ شاعری بھی خرافات وخرابات سے بے کر پاک ہے۔ اب ذیل میں اسعد بدایونی کا مضمون ملاحظہ کریں۔

توضیحی نوٹ

حسن بریلوی ۱۹؍ اکتوبر ۱۸۵۹ء میں بریلی شریف میں پیدا ہوئے۔ ان کے مورث اعلےٰ عہد مغلیہ میں قندھار سے ہندوستان آئے اور دہلی میں سکونت پذیر ہوئے اس کے بعد بریلی میں مستقل سکونت اختیار کی۔ حسن کے والد کا نام مولانا محمد نقی علی خاں تھا۔ حسن کے شجرہ نسب اور ان کے بزرگوں کے بارے میں لطیف حسین ادیب رقم طراز ہیں۔ آپ کا شجرۂ نسب مندرجہ ذیل ہے۔

حسن رضا خاں بن مولانا محمد نقی علی خاں بن حضرت مولانا رضا علی خاں بن حضرت مولانا کاظم علی خاں بن حضرت مولانا شاہ محمد اعظم خاں بن حضرت محمد سعادت یار خاں بن حضرت محمد سعید اللہ خاں۔

مولانا محمد سعید اللہ کے آباء و اجداد کا اصل وطن قندھار،

مولانا سعید اللہ خاں شاہانِ مغلیہ کے عہد میں وارد ہندوستان ہوئے اور بادشاہِ وقت سے شش ہزاری منصب ملا۔ محمد سعادت یار خاں صاحب محمد شاہ بادشاہ کے وزیر اعظم تھے۔ دہلی میں بازار سعادت گنج اور سعادت خاں کی نہر ان کے نام سے ہی منسوب تھیں۔ اعظم خاں صاحب تارک الدنیا ہو گئے تھے۔ محلہ معماران بریلی میں شاہزادے کا تکیہ انہیں کی نسبت سے مشہور ہے اور وہیں ان کی قبر ہے۔ حافظ محمد کاظم علی خاں صاحب بدایوں کے تحصیلدار تھے۔ انہیں آٹھ گاؤں معافی کے عطا ہوتے تھے۔

حضرت مولانا شاہ رضا علی خاں صاحب کا شمار صوفیائے کرام میں تھا۔ حضرت مولانا نقی علی خاں صاحب عالم دین اور صوفی منش بزرگ تھے۔ جن کے فیض تربیت سے حسن بریلوی مستفید ہو کر مشہور و معروف ہوئے۔ (چند شعرائے بریلی ص۔ ۱۴۲)

حسن کی تعلیم و تربیت کا آغاز خاندانی بزرگوں کے درس سے ہوا۔ علوم مروجہ میں مہارت حاصل کرنے کے ساتھ معقولات و منقولات کی تعلیم بھی حاصل کی اور پھر خود علم دین کی درس و تدریس کا سلسلہ شروع کر دیا۔ موزوں طبع تھے شعر و شاعری کی طرف بچپن سے جھکاؤ تھا۔ داغ کی مقبولیت اور شہرت کا زمانہ تھا اور وہ رام پور میں قیام پذیر تھے۔ حسن کسی سلسلے میں رام پور گئے۔ جہاں داغ سے ملاقات ہو گئی اور ان کی شاگردی اختیار کر لی۔ حسن نے داغ کی شاگردی سے بہت فیض اٹھایا اور مسلسل مشق و ممارست کی وجہ سے کچھ عرصہ بعد خود مرتبۂ استادی حاصل کر لیا۔

حسن کے تلامذہ کی تعداد بھی اچھی خاصی ہے۔ ان کے چند شاگردوں کے نام یہ ہیں۔ جمیل الرحمٰن خاں جمیل، قاضی محمد خلیل میرا، سید محمود علی عاشق، دوار کا پرشاد حلیم اور رام غلام کیفی (چند شعرائے بریلی ص۔ ۱۴۲)

حسن رضا خاں کو شعر و ادب کے ساتھ ساتھ صحافت سے بھی دلچسپی تھی ان کا ذاتی پریس بھی تھا۔ جس سے اس کی نگرانی "بہارِ بے خزاں" نام کا ماہانہ اور "روز افزوں" نام کا ہفتہ وار اخبار شائع ہوتے تھے حسن نے ردّ وہابیت اور مختلف دینی موضوعات پر کتابیں بھی لکھیں۔

(چند شعرائے بریلی ص۔ ۱۴۳)

ان کے مطبع کا نام مطبع اہل سنت تھا۔ ان کے بڑے بھائی مولوی احمد رضا خاں اعلیٰ حضرت اپنے زمانے کے مشہور مذہبی رہنما تھے۔ حسن نے بڑے بھائی کی پیروی کی اور ان کے عقائد و نظریات کی ترویج و اشاعت میں حصہ لیا۔ حسن بریلوی کا انتقال ۱۹۰۹ء میں ہوا۔

حسن نے دو دیوان یادگار چھوڑے ہیں۔ ایک عشقیہ شاعری کا دیوان جو "ثمر فصاحت" کے نام سے ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا۔ اور دوسرا نعتیہ کلام کا جو "ذوق نعت" کے نام سے ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا۔ ۱۳۲۵ھ میں حسن مع اہل و عیال سعادت حج سے مشرف ہوئے اور واپسی پر غزل گوئی ترک کر کے صرف نعت و منقبت کو اپنا مشغلہ بنا لیا۔ نعت گوئی میں حسن نے اپنے بڑے بھائی سے مولانا احمد رضا خاں سے اصلاح لی۔ (خمخانۂ جاوید ص ۴۲۲)

حسن بریلوی ایک راسخ العقیدہ مذہبی شخص تھے۔ اور اپنے زمانے کے [illegible] عزت و احترام میں ان کا شمار ہوتا تھا۔ ان کے مذہبی نظریات و خیالات کا اظہار ان کی نعتیہ شاعری میں ہوا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری مرزا داغ کی کامیاب تقلید ہے۔ حسن بریلوی کے مجموعۂ کلام کے نام یعنی "ثمر فصاحت" سے ہی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ان کے نزدیک شعر کا معیار کیا رہا ہوگا۔ داغ کے اثر سے اور ان کے تلامذہ کی کثیر تعداد کے سبب سارے ملک میں جس قسم کی شاعری کو فروغ حاصل ہوا۔ وہ خاصتاً فصاحت و بلاغت اور زبان و محاورے پر مبنی تھی۔ اس عہد کی شاعری میں زبان کی نزاکت اور ٹھیٹ اردو کا ٹھاٹ ہے۔ یعنی داغ کے تلامذہ کے کلام میں عربی و فارسی کی غیر مانوس تراکیب بہت کم نظر آتی ہیں۔ داغ کے بیشتر تلامذہ آخر عمر تک اسی رنگ میں رنگے رہے اور زبان و محاورے کے کھیل دکھانا ہی ان کا کارنامہ قرار پایا۔ حسن بریلوی کی شاعری بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ ان کے کلام میں وہ تمام عناصر بدرجہ اتم موجود ہیں جو اس زمانے میں سکۂ رائج الوقت کی حیثیت رکھتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ساتھ ان کی غزلوں میں مضمون آفرینی کی کوشش بھی نظر آتی ہے اور سوقیت و عریانیت سے پہلو تہی کرنے کا رجحان بھی۔ جب کہ داغ کہیں بھی کھیل کھیلنے سے باز نہیں آتے اور ہر جگہ رندی و ہوسناکی کا تذکرہ بے جھجک کر جاتے ہیں۔ حسن کی اس احتیاط کا سبب بادی النظر میں ان کی مذہبی تربیت

نظر آتی ہے۔

موت بھی کیا جانے کچھ عیار ہے
کیوں نہیں آتی ترے بیمار تک

آئینہ تمہارے نقش پا کا
خورشید کو دے سبق جلا کا
او وصل میں منہ چھپانے والے
یہ بھی کوئی وقت ہے حیا کا

اے عاشقو نوید کہ سنتے ہیں آج وہ
افسانہ دل جلوں کا زبان چراغ سے

تربت بنوں نظر آئی جو وحشت میں حسن
میں چڑھانے کو گل چاک گریباں لے چلا

مندرجہ بالا اشعار میں مروجہ مضامین کو تھوڑی سی ندرت کے ساتھ پیش کرنے کی شعوری کوشش کا اظہار ہوتا ہے۔ پامال مضامین کو نئے اور اچھوتے ڈھنگ سے استعمال کرنا بڑے شاعروں کا کام ہے۔ حسن کے یہاں یہ کوشش نظر آتی ہے۔ مگر ان کے اشعار اس پائے کو نہیں پہونچتے جس کے سبب انہیں بڑے شاعروں میں شامل کیا جاسکے۔ البتہ ایسے اشعار کی بنا پر انہیں قادر الکلام شاعر تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

حسن رضا خاں کی غزلوں میں ایک خاص قسم کا انداز بھی موجود ہے جو کچھ کچھ مکالماتی ہے۔ اس انداز تخاطب کے سبب بھی ان کے کلام میں ایک نوع کی دلکشی پیدا ہو گئی ہے۔

آپ کہتے ہیں کہ جا دیکھ لیا دل تیرا
کہئے تو اپنے سوا دل میں مرے کیا دیکھا
دیکھنا یہ ہے کہ ہم نے تمہیں کیا چاہا
پوچھنا یہ ہے کہ تم نے ہمیں کیا دیکھا

(مل گیا دل نکل گیا مطلب
آپ کو اب کسی سے کیا مطلب

حسن رضا کے کلام میں چھوٹی بحروں کی غزلیں ایک خاص قسم کی موسیقیت اور روانی کی حامل ہیں۔ ان میں بھی حسن کی قادر الکلامی اور مشتاقی کے جوہر نظر آتے ہیں۔ زبان کی نزاکت جو ان کی خصوصیت ہے یہاں بھی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔

چھپ گیا یار خود نما ہو کر
رہ گئی چشم شوق وا ہو کر
کیا کہوں کیا ہے میرے دل کی خوشی
تم چلے جاؤ گے خفا ہو کر

قتل کرنے کی وہ جلدی تھی تمہیں
اب تڑپنا نہیں دیکھا جاتا
دیکھنے ہی کے لئے ہیں آنکھیں
ان سے کیا کیا نہیں دیکھا جاتا

حسن رضا خاں کی شاعری بنیادی طور پر غزل کی شاعری ہے اور ان کی غزل گوئی قدیم دبستان سخن کی تمام خوبیاں یعنی صحت زبان، محاورہ، شوخی، معاملہ بندی، اور عاشقانہ مضامین کی حامل ہے جو اپنی جگہ جڑے ہوئے نگینوں کی طرح چمکتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ داغ کے شاگردوں نے تراش خراش اور اسے ملک کے طول و عرض میں پھیلانے کی جو خدمت انجام دی اس سے انکار نا ممکن ہے۔ حسن رضا نے بھی زبان داغ کی توسیع و ترویج میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور استاد کے رنگ سخن کو اپنے کلام میں سمونے میں دوسرے شاگردوں سے پیچھے نہیں رہے۔ اسی لئے ان کا شمار داغ کے ممتاز شاگردوں میں کیا جاتا ہے۔ جب بھی داغ کے رنگ سخن کی بہتر پیروی کرنے والوں کی فہرست بنائی جائے گی۔ حسن بریلوی کا نام شامل کرنا ناگزیر ہو گا۔ م

قطعہ

اے فکر و فن میں جس کی ذات عالی بے مثال
وہ شہنشاہ تغزل دین کا ماہ کمال
ایسا شاعر آج کوئی دوسرا اشرف کہاں
جس کی ہر اک نعت سے ظاہر ہو طیبہ کا جمال

از: حکیم قدرت اللہ اشرف نوری بریلوی

حضرت حسن بریلوی کی فکری تگ وتاز

مولانا سراج احمد القادری بستوی
ریسرچ اسکالر یونیورسیٹی آف کانپور

جس وقت میں اپنے P.h.D کے مقالہ کی Detail Synopsis (مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی نعتیہ شاعری) اپنے نگراں استاذ محترم پروفیسر سید ابو الحسنات حقی صدر شعبہ اردو کانپور یونیورسٹی کانپور کی مدد سے بنا رہا تھا تو درمیان میں میرے نگراں محترم نے فرمایا کہ مولانا احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے چھوٹے بھائی مولانا حسن رضا خاں صاحب بریلوی بھی نعت کے بہت بڑے شاعر گزرے ہیں تم نے ان کا نعتیہ دیوان دیکھا ہے کہ نہیں۔؟ میں نے عرض کیا حضور میں نے ابھی ان کا نعتیہ دیوان تو دیکھا نہیں ہے۔ ہاں ان کی اکثر و بیشتر نعتیں مذہبی رسالوں اور میگزینوں میں ضرور دیکھی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ تم ان کی نعتوں کو دیکھو تو تمہیں معلوم ہوگا کہ وہ کتنے بڑے شاعر تھے۔

بات آئی اور گزر گئی مگر اپنا اثر چھوڑ گئی یوں تو میں نے پہلے ہی طے کیا تھا کہ جس وقت اپنی تھیسیس (Thesis) قلم بند کروں گا تو استاذ زمن حضرت حسن بریلوی کے نعتیہ دیوان ذوق نعت کا مطالعہ ضرور کروں گا اور نعت گو کی حیثیت سے آپ کا درجہ بھی ضرور متعین کروں گا۔ اس طرح کے میرے پہلے ہی سے خیالات و نظریات تو تھے ہی مگر استاذ محترم کے اشتیاق دلانے پر میرا جذبہ شوق جاگ اٹھا اور میں اسی وقت سے استاذ زمن حضرت حسن بریلوی کے نعتیہ دیوان ذوق نعت کا متلاشی ہوگیا۔ فوری ہی ایک اسلامی کتب خانہ پر پہونچا۔ اور صاحب دوکان سے میں نے موصوف کا نعتیہ دیوان ذوق نعت طلب کیا۔ انہوں نے مجھے دیا اور میں اسے لے کر شوق اشتیاق میں ڈوبا ہوا اپنی منزل پر پہونچا۔ اور قدرے اطمینان کا دم بھرنے کے بعد اس کے مطالعہ میں جٹ گیا۔ جس وقت میں ان کے دیوان کا مطالعہ کر رہا تھا اس وقت میرے حیرت و استعجاب کا عجیب و غریب عالم تھا۔ یقین جانیں کہ بعض بعض اشعار میں قوت فکر کی جولانی و بلندی اس غضب کی ہے کہ حضرت رضا بریلوی کی یاد تازہ کرتے ہیں۔ اسی وقت اچانک مجھے حضرت رضا بریلوی کی وہ بات یاد آئی جسے آپ نے استاذ زمن حضرت بریلوی کے متعلق فرمایا ہے۔

فرماتے ہیں ___

میں اپنے چھوٹے بھائی حسن میاں یا حضرت کافی مرادآبادی کا کلام سنتا ہوں (اس لئے کہ ان کا کلام میزان شریعت میں تلا ہوا ہوتا ہے) اگرچہ حضرت کافی کے یہاں لفظ رعنا کا استعمال بھی موجود ہے۔ اگر وہ اپنی اس غلطی پر آگاہ ہوجاتے تو یقیناً اس لفظ کو بدل دیتے۔

(معارف رضا صـ ۱۶۵ شمارہ ۱۹۸۶ء ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی پاکستان)

اسی درمیان محترم شہاب الدین صاحب، مدیر اعلیٰ ماہنامہ سنی دنیا بریلی شریف کا ارسال کردہ سنی دنیا کا تازہ شمارہ باصرہ نواز ہوا۔ میں نے اس کو بڑے ہی ذوق و شوق کے ساتھ دیکھنا شروع کیا۔ سب سے پہلے تو نظر اس کے مضامین و قلم کاروں کی فہرست پر گئی، پھر دھیرے دھیرے ایک ایک ورق کو پلٹنا شروع کیا۔ جس وقت میں مذکورہ شمارہ کی ورق گردانی کر رہا تھا تو اس کے درمیان میں مجھے استاد

زمن حضرت حسن بریلوی" پر استاد زمن نمبر کے اشاعت پذیر ہونے کا اعلان نظر آیا۔ جس میں ادیبوں اور قلم کاروں سے مقالات و مضامین طلب کئے گئے تھے۔ اس نمبر کی اشاعت کے اعلان سے مجھے ازحد مسرت ہوئی۔ ایسا محسوس ہوا کہ محترم شہاب الدین صاحب نے اس نمبر کے اشاعت کرنے کا بیڑا اٹھا کر مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہو۔ گویا کہ موصوف نے میرے دل کی بات کہہ دی۔ اس لئے میں اس کمی کو بڑی شدت سے محسوس کر رہا تھا۔ استاد زمن حضرت حسن بریلوی جیسی بلند و بالا عظیم المرتبت شخصیت کہ جس کو داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں گنا جاتا ہو۔ جس کی تعریف و توصیف شاعر غزل حسرت موہانی نے کی ہو اور یہ سب تو اپنی جگہ پر ہیں۔ جس کے کلام کے بارے میں حضرت رضا بریلوی جیسا سخنور، سخن داں، سخن شناس اور نعت کا سب سے بڑا نقاد و مبصر یہ کہے کہ میں ان کے کلام کو سنا پسند کرتا ہوں۔ ان کے اشعار میزان شریعت میں تلے ہوئے ہوتے ہیں۔ وہ ہماری نظروں سے اس طرح غائب و اوجھل ہو رہا تھا کہ جس کی ہستی کے نقوش زریں بھی ہمارے ذہنوں سے مٹنے کی دہلیز پر پہونچ چکے تھے۔ مگر محترم شہاب الدین صاحب نے اس نمبر کے نکالنے کا اعلان فرما کر ان کے علمی و ادبی کاموں کو ہمارے قوت حافظہ پر چڑھا دینے کا جو لائق صد ستائش کام کیا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے کہ جیسے کوئی شخص جوئے شیر لانے پر آمادہ ہو اور پھر لا بھی دے۔

میرا بیٹا مستان

استاد زمن حضرت حسن بریلوی ۴ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ میں بریلی کی دھرتی پر متولد ہوئے۔ آپ کی ولادت باسعادت سے متعلق ملک العلماء حضرت علامہ ظفر الدین بہاری رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنی کتاب حیات اعلیٰ حضرت میں اس طرح کی ایک حکایت نقل فرمائی ہے۔

ملاحظہ ہو ـــــ

جناب علی محمد خاں صاحب اعلیٰ حضرت کے بھانجے فرماتے ہیں کہ میری والدہ مرحومہ اعلیٰ حضرت کی بڑی بہن تھیں کہ جب اعلیٰ حضرت پیدا ہوئے تو میرے والد ان کو جناب دادا صاحب قدس سرہٗ العزیز کی خدمت میں لئے گئے دیکھ کر گود میں لیا اور فرمایا یہ میرا بیٹا بہت بڑا عالم ہوگا اور جب منجھلے میاں مولوی حسن رضا خاں صاحب رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ پیدا ہوئے۔ ان کو دیکھ کر فرمایا میرا یہ بیٹا مستان ہوگا۔

(حیات اعلیٰ حضرت ص۲۱-۲۲، قادری بک ڈپو بریلی شریف)

آپ خط کشیدہ عبارت کو بار بار پڑھیں اور دل کی گہرائیوں میں اتر کر سوچیں یہ کسی ایسے ویسے کے منہ سے نکلے ہوئے دعائیہ کلمات نہیں تھے بلکہ ایک خدا رسیدہ مرد درویش کی زبان سے نکلے ہوئے دعائیہ کلمات تھے، جو بارگاہ رب العزت میں مقبول و مستجاب ہوئے۔ اور وہی ہوا جو آپ نے فرمایا تھا یعنی مستان، جناب ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب نے اپنی کتاب نعت کے چند شعرائے متقدمین میں اس فرمان پاک پر ایک ناقدانہ نظر ڈالی ہے۔ فرماتے ہیں۔ قول بالکل سچ ثابت ہوا۔ عشق رسالت میں ڈوبی ہوئی اپنی نعتیہ شاعری سے حضرت حسن خود بھی مست ہوتے۔ اور دوسروں کو بھی مست اور بے خود فرماتے رہے

(نعت کے چند شعرائے متقدمین ص۱۰۱ مطبع الہ آباد)

حضرت حسن بریلوی نے جملہ علوم متداولہ کی تعلیم و تکمیل رئیس الاتقیاء والد محترم جناب حضرت علامہ مفتی نقی علی خاں صاحب قبلہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس فرمائی۔ مگر زیادہ تر استفادہ اپنے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت مجدد دین و ملت مولینا احمد رضا محدث بریلوی سے کیا۔ اور ارادت و سلوک کی تعلیم سیدی ابوالحسین احمد نوری میاں رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ سے حاصل کی۔

سخن طرازی

یہ بات مسلمات سے ہے کہ سخن طرازی کے محرک عشقیہ عناصر ہیں۔ چاہے وہ حقیقی ہوں یا مجازی حضرت حسن بریلوی کی سخن طرازی سے متعلق وقت و عمر کا تعین غیر مناسب ہے۔ اس لئے کہ استاد زمن حضرت حسن بریلوی الشعراء تلامیذ الرحمٰن کے تحت ایک فطری شاعر تھے۔ سخنوری کی گھٹی آپ کو روز اول ہی پلادی گئی تھی۔ جب ہی تو آپ کے جد گرامی نے دیکھتے ہی پہلی نظر میں بھانپ لیا تھا کہ یہ بچہ آگے چل کر کیا ہونے والا ہے۔ محاورے کی زبان میں ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات۔ اسی لئے برجستہ فرمایا تھا کہ میرا یہ بیٹا آگے چل کر مستان ہوگا

استاذ زمن حضرت حسن بریلوی نے شعر وشاعری کا آغاز بچپن ہی میں شعور کی آنکھ کھولنے کے بعد سے کر دیا تھا۔ مگر ابتدا میں آپ کو عشق مجازی یعنی غزلیات کا چسکا لگا ہوا تھا اسی لئے صنف غزل ہی میں شعر کہتے تھے اور اصلاح مشہور زمانہ شاعر داغ دہلوی سے لیتے تھے۔ ایک زمانے تک غزل کہتے رہے۔ حتیٰ کہ اس صنف میں آپ کا ایک مکمل دیوان ثمر فصاحت تیار ہو گیا۔ اور آپ کا شمار داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں ہونے لگا۔ شاعر غزل جناب حسرت موہانی نے داغ دہلوی سے شاگردی اور ایک بلند پایہ شاعر ہونے کی حیثیت سے اس طرح آپ کو خراج تحسین پیش کیا ہے۔ فرماتے ہیں

شاگردان مرزا داغ میں حسن مرحوم بریلوی کا پایہ شاعری بہت بلند تھا وہ بجائے خود استاد مستند تھے۔ (معارف رضا ص۱۱۱ شمارہ ۱۹۸۸ء ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی پاکستان)

مگر جب آپ کی طبیعت اس صنف میں شعر کہتے کہتے بھر گئی اور آپ اس کی کم مائیگی اور کھوکھلے پن سے آگاہ ہوئے تو آپ نے سرمدی سرمایہ حمد و نعت کی طرف اپنی توت فکر کو موڑا اور اصلاح داغ دہلوی کے بجائے حضرت رضا بریلوی سے لینے لگے۔ ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں

بھلا ہے حسن کا جناب رضا سے
بھلا ہو الٰہی جناب رضا کا۔ حسن بریلوی

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ استاذ زمن حضرت حسن بریلوی نے صنف نعت میں اپنا استاذ داغ دہلوی کو کیوں نہیں بنایا جب کہ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے کلی طور سے اپنا استاذ داغ دہلوی ہی کو بنایا تھا۔ خواہ وہ ان کی نعتیں ہوں یا انقلابی منظومے، میرے اپنے خیال میں کسی حد تک اس کا جواب یہی ہوگا کہ نفس الامر میں صنف نعت ایسی مقدس اور باعظمت صنف ہے کہ جس کی تقدیس و پاکی اپنا مثل نہیں رکھتی۔ حضرت رضا بریلوی اپنے نعتیہ دیوان حدائق بخشش میں نعت نبیٔ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی رفعت طرازی سے متعلق فرماتے ہیں۔

طوبیٰ میں جو سب سے اونچی نازک سیدھی نکلی شاخ
مانگوں نعت نبی لکھنے کو روح قدس سے ایسی شاخ

میں سمجھتا ہوں کہ اس شعر کا یہی مطلب ہے کہ خیالات کی پاکی کے ساتھ ساتھ نعت نبیٔ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے لئے ایسے قلم کا استعمال کیا جائے جو خیالات کی بلندی سے تنزیہہ و پاکی کا بہت ہی مشابہ ہو اور یہ باتیں داغ کے یہاں مفقود تھیں۔ وہاں تو شراب و کباب عشوہ و ادا ذہن و دماغ میں بچا بسا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر اقبال کے کلام میں غیر شرعی باتیں جا بجا پائی جاتی ہیں۔ جن کے بارے میں خود نبیٔ اکرم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ممانعت فرمائی ہے۔ جیسے لفظ یثرب کا استعمال اس کے بارے میں سرکار دوعالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم ارشاد فرماتے ہیں

یقولون یثرب وھی المدینۃ۔ (بخاری ومسلم)

لوگ اسے یثرب کہتے ہیں حالانکہ یہ مدینہ ہے۔ شاعر مشرق ڈاکٹر اقبال نے لفظ یثرب کا استعمال کثرت سے فرمایا ہے۔ ملاحظہ ہو

تو اے مولائے یثرب! آپ میری چارہ سازی کر
مری دانش ہے افرنگی مرا ایمان ہے زناری

میں نے سو گلشن جنت کو کیا اس پہ نثار
دشت یثرب میں اگر زیر قدم خار آیا

خاک یثرب از دو عالم خوشتر است
اے خنک شہرے کہ آنجا دلبر است

آہ یثرب دیس ہے مسلم کا ماویٰ ہے تو
نقطۂ جاذب تاثر کی شعاعوں کا ہے تو

بات سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ شاعر مشرق موصوف نے لفظ یثرب کا استعمال جا بجا کیوں فرمایا جب کہ خود انہوں ہی نے کسی مقام پر یہ فرمایا ہے ـــ باخدا دیوانہ باش و با محمد ہوشیار۔

ممکن ہے کہ کوئی میرے اس سوال کا جواب بایں طور دینے کی کوشش کرے کہ شاعر مشرق موصوف کوئی مذہبی عالم تو تھے نہیں۔ اس لئے لفظ یثرب کا استعمال ہو گیا ہوگا تو میں اس کا جواب بڑے ہی مودبانہ اور سلیقے سے اس طرح عرض کرنا چاہوں گا کہ یہ راہ نعت بنی ہے۔ "اس راہ پر گامزن ہونے

سے قبل خود ان کو اپنے ہی قول کو جھانک کر دیکھ لینا چاہیئے تھا اور عرفی کا یہ شعر تو بہت ہی مشہور رہے ۔

شتاب عرفی شتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را ۔ عرفی

میں اپنے قارئین پر یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ جب سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لئے لفظ یثرب کا استعمال روا نہیں رکھا تو کیونکر وہ اپنی عظمت شان کے لئے کسی ایسے لفظ کا استعمال جائز قرار دیتے جو کہ معنوی حیثیت سے ذرا بھی ہلکا ہوتا۔ یہی وجہ کہ جب حضرت کعب بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنا مشہور قصیدہ لے کر بارگاہ رسالت مآب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوئے اور سنانا شروع کیا جب اس شعر پر پہنچے

ان الرسول لنور یستضاء بہ
مہند من سیوف اللہ مسلول

نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے حضرت کعب بن زہیر کو اپنی ردائے مبارک عطا فرمائی سبحان اللہ زہے نصیب مگر ساتھ ہی ساتھ نبی کریم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت کعب بن زہیر کو اس شعر پر ٹوکا اس لئے کہ پہلے آپ نے مہند من سیوف اللہ مسلول کی جگہ مہند من سیوف الہند کا لفظ استعمال فرمایا تھا۔ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا میں سیوف الہند نہیں بلکہ سیوف اللہ ہوں۔ مطلب یہ تھا کہ راہ نعت نبی یہ وہ راہ ہے جہاں لوگوں کو نفس گم کر دینا چاہیئے۔ حضرت کعب بن زہیر نے لفظ ہند کا استعمال صرف اس لئے فرمایا تھا کہ اس زمانہ میں ہندوستان کی تلوار پورے دنیا میں سکہ جمائے ہوئے تھی۔

انشاء پردازی

جہاں استاد زمن حضرت حسن بریلوی ایک بلند پایہ شاعر تھے وہیں پر وہ ایک عبقری سے ادیب و انشاء پرداز بھی، نیز جہاں پر حضرت رضا بریلوی نے استاد زمن حضرت حسن بریلوی کی شاعرانہ عظمتوں کا اعتراف اور اس کی تائید و تصدیق فرمائی ہے وہیں پر حضرت حسن بریلوی کی انشاء پردازی کو بھی بہ قلب صمیم اعتراف فرمایا ہے۔

فرماتے ہیں۔ کسی سائل نے (مجھ سے) پوچھا کہ محرم کی مجالس میں جو مرثیہ خوانی ہوتی ہے سننا چاہیئے یا نہیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا مولانا شاہ عبد العزیز محدث دہلوی کی کتابیں جو عربی میں ہیں یا میرے بھائی حسن میاں مرحوم کی کتاب آئینۂ قیامت میں صحیح روایات ہیں انہیں سننا چاہیئے۔ باقی غلط روایات کے پڑھنے سے نہ پڑھنا اور نہ سننا بہتر ہے۔

(ذوق نعت ص۲ اشرفی کتاب گھر سنبھل مراد آباد)

دیگر خدمات

جہاں پر استاد زمن حضرت حسن بریلوی نے شاعری کرکے فن شاعری کو عروج و ارتقاء سے ہمکنار کیا وہیں آپ نے انشاء پردازی، تصنیفی تالیفی و تحقیقی کام کرکے نثری سرمایہ کو وہ کمال فروغ عطا کیا کہ جس کی مثال خود آپ ہیں۔

حضرت حسن بریلوی نے تصنع سے سخت نفرت و گریز کیا ہے اور نیچری چیزوں کو بروئے کار لانے کی انتھک کوشش کی ہے یہی وجہ ہے کہ ان کا کلام اول جلول باتوں سے پاک ہے اور اثر و تاثیر کے لحاظ سے قوی

حضرت حسن بریلوی کی ادبی خدمات تو مسلم ہے ہی اس کے علاوہ ان کی طبیعت کی بالیدگی مذہبیات کی طرف زیادہ مائل تھی۔ جب حضرت رضا بریلوی کی کوششوں سے دینی ادارہ دار العلوم منظر اسلام وجود میں آیا تو حضرت حسن بریلوی نے اس کا تاریخی نام تجویز فرمایا اور آپ ہی اس کے سب سے پہلے مہتمم بھی مقرر ہوئے۔ نیز بریلی میں مطبع اہلسنت وجماعت کی تاسیس کا سہرا بھی آپ ہی کے سر ہے جس میں آپ کی متعدد تصانیف اشاعت پذیر ہو چکی ہیں۔ اور آپ ایک ہفتہ وار اخبار "روز افزوں" کے نگراں بھی تھے جس کو آپ کے ارشد تلامذہ میر محمود علی عاشق اور احمد بریلوی نکالتے تھے

تصنیفات و تالیفات

استاد زمن حضرت حسن بریلوی نے اپنے خامہ تحقیق انیق کو متعدد موضوعات پر اٹھایا ہے اور جس سمت آگئے ہیں سکے بٹھا دیتے ہیں، خواہ آپ کی نثری تصنیفات ہوں یا شعری۔ وہ ہر میدان کے شہسوار تھے۔ ان کی اشہب فکر کی تگ و تاز کو لوگ حیرت بھری نظروں سے دیکھتے رہ جاتے ہیں۔ مگر استاد زمن حضرت

حسن بریلوی کی تصنیفات کی تعداد میں اختلاف ہے۔ بعض روایات کے اعتبار سے آپ کی کل تصنیفات کی تعداد سات ہے اور بعض کے اعتبار سے گیارہ۔ مگر میں گیارہ کی تعداد کو سات پر اہمیت و فوقیت دیتا ہوں۔

اور محقق عصر عزت مآب جناب ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب ایم۔ اے، پی۔ ایم۔ ڈی۔ نے اپنی کتاب نعت کے چند شعرائے متقدمین میں استاد زمن حضرت حسن بریلوی کی تصنیفات و تالیفات کی تعداد گیارہ بتائی ہے۔ نیز موصوف نے آپ کی بعض کتابوں کے طبع پذیر ہونے کا بھی ذکر کیا ہے۔ آپ فرماتے ہیں کہ ہند و پاک میں اب تک ذوق نعت کے پچیس سے زائد ایڈیشن شائع ہو کر ارباب علم و دانش سے داد و تحسین وصول کر چکے ہیں۔ اور شاعر عظیم المرتبت جناب نظر لدھیانوی صاحب نے تو باقاعدہ موصوف کی شاعری پر قلم اٹھا کر استاد زمن حضرت حسن بریلوی کو مقام ثریا پر پہونچا دیا ہے۔ اور اتنا بہتر آپ کے کلام کا ادبی و تحقیقی جائزہ لیا ہے کہ جس کی اکثر و بیشتر پذیرائی اس کے قدر دانوں نے کی ہے۔ آپ کا وہ جائزہ ۱۹۷۸ء میں رضا پبلیکیشنز لاہور سے شائع ہوا تھا۔

تلامذہ

جب میں اس مقالہ کو قلم بند کرنا شروع کیا تو مجھے اس کے شروع ہی میں یہ دقت در پیش ہوئی کہ بعض کتابوں میں استاد زمن حضرت حسن بریلوی کو حضرت رضا بریلوی کا منجھلا بھائی تحریر ہے۔ اور بعض کتابوں میں آپ کو حضرت رضا بریلوی کا چھوٹا بھائی۔ جیسے کہ امام احمد رضا نمبر میں استاد زمن حضرت حسن بریلوی کو حضرت رضا بریلوی کا سب سے چھوٹا بھائی تحریر ہے۔ جب کہ حقیقت یہ ہے کہ حضرت حسن بریلوی حضرت رضا بریلوی کے چھوٹے بھائی نہیں بلکہ منجھلے بھائی تھے۔ سب سے بڑے حضرت رضا بریلوی اور اس کے بعد حضرت حسن بریلوی اور پھر حضرت مولینا محمد رضا خاں صاحب تھے۔ التباس جو ہو رہا تھا وہ حضرت مولینا محمد رضا خاں صاحب قبلہ رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کے بارے میں اور غالباً اسی وجہ سے تسامح امام احمد رضا نمبر کے مرتب سے بھی ہوا۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ مولینا حسن رضا خاں صاحب حضرت رضا بریلوی کے منجھلے ہی بھائی تھے

جس کی تائید ملک العلماء علامہ ظفر الدین بہاری رضی اللہ تعالےٰ عنہٗ کی مشہور زمانہ تصنیف "حیات اعلیٰ حضرت" اور ذوق نعت (نعتیہ ادب استاد زمن حضرت حسن بریلوی) اور مکتوبات امام احمد رضا محدث بریلوی وغیرہ کتب معتبرہ سے ہوتی ہے۔

اسی طرح سے آپ کی ذات سے متعلق اختلافات کی ایک کڑی ڈاکٹر سید شمیم گوہر صاحب نے بھی اجاگر کی ہے فرماتے ہیں

"شعر حسن" میں مرید احمد چشتی نے حضرت حسن کے جن تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ ان کے اسماء یہ ہیں۔ حکیم سید برکت علی نامی، منشی ہدایت یار خاں قیس، منشی اختر حسین اختر، منشی برج موہن کشور، منشی مظہر حسین مظہر، حکیم سعید، حکیم سید مسعود غوث فیقی، منشی تہور علی تہور، منشی محمد حسین اثر بدایونی، منشی اعجاز احمد قیصر مرادآبادی، حافظ و حاجی احمد حشر، سید محمود علی عاشق، منشی دوارکا پرشاد حلم بریلوی، لیکن ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کی تصنیف تذکرہ نعت گویان بریلی کے مطالعہ سے جن تلامذہ کا ذکر ملتا ہے وہ مرید چشتی کی فہرست سے بالکل مختلف ہے۔ تعجب ہے کہ تلامذہ حسن کی تحقیق میں اتنا فرق کیوں ہوا۔ ادیب نے مندرجہ ذیل تلامذہ کا ذکر کیا ہے۔ حکیم سید برکت علی نامی، جمیل الرحمٰن جمیل بریلوی، سید محمد فدا علی وامق، محمد ضیاء اللہ خاں ضیاء، حافظ ارشاد علی خاں ارشاد اور حمد اللہ خاں حمد داماد حسن بریلوی۔ ان تلامذہ میں حضرت جمیل بریلوی متوفی ۱۳۷۲ھ کی حیثیت بہت اہم اور موقر ہے نعتیہ شعر و ادب کے فروغ میں ایک اہم ستون سمجھے جاتے ہیں۔ قبالۂ بخشش کے نام سے ایک ضخیم دیوان ۱۳۴۱ھ میں شائع ہو چکا ہے

(نعت کے چند شعرائے متقدمین ص ۱۱۳-۱۱۴ مطبع الہ آباد)

ذوق نعت پر سرسری نظر

اس وقت میرے پاس حضرت حسن بریلوی کی تصنیفات و تالیفات سے صرف آپ کا نعتیہ دیوان ذوق نعت ہی ہے۔ اس لئے صرف ذوق نعت ہی سے آپ کی شاعری سے متعلق کچھ باتوں کو پیش کیا جائے گا۔ حضرت حسن بریلوی کا یہ نعتیہ دیوان حمد

باری تعالٰے سے شروع ہوتی ہے۔ جس کا پہلا شعر ہے۔

ہے پاک رتبہ فکر سے اس بے نیاز کا
کچھ دخل عقل کا ہے نہ کام امتیاز کا

اس شعر کا مفہوم بالکل واضح ہے۔ جن لوگوں نے منطق کی معیاری کتاب "ملا حسن" کا مطالعہ کیا ہے اور ان کے گوشۂ ذہن میں ولایحد ولایتصور کی بحث کا اگر معمولی بھی حصہ محفوظ ہوگا تو وہ اچھی طرح سے اس شعر کے مفہوم، ان کی گہرائی و گیرائی تک پہونچ سکتے ہیں۔ جس کا آسان سا مفہوم یہ ہوگا کہ مالکِ بے نیاز کی ذات ایسی ارفع و اعلیٰ ہے کہ آدمی اس کا خیال نہیں لاسکتا۔ اس لئے کہ آدمی جو اپنے ذہن میں تصور کرے گا وہ محیط ہوگا۔ کیوں؟ اس لئے کہ انسان کی قوت فکر خود ہی محیط ہے اور جب کسی محیط میں کسی چیز کا وجود ہوگا تو ایسا غیر ممکن ہے کہ وہ محیط نہ ہو۔ لہٰذا آدمی اس کا تصور کر نہیں سکتا۔ اور اب اگر کوئی یہ سوال کرے کہ کیوں اس کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔ تو عقلی طور پر اس کی مقدس بارگاہ میں اس طرح کا سوال بیکار ہے اس لئے کہ وہ ذات ایسی ذات ہے جہاں کم وکیف کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ وہاں تو صرف امنا و صدقنا ہے۔ حضرت رضا بریلوی فرماتے ہیں۔

پوچھتے کیا ہو عرش پر یوں گئے مصطفےٰ کہ یوں
کیف کے پر جہاں جلیں کوئی بتائے کیا کہ یوں

اس مقدس بارگاہ کا یہ عالم ہے کہ جہاں کم وکیف کے پر خود جلا کرتے ہیں۔ اس کے بعد پھر ایک اور حمد ہے جس کا پہلا شعر ہے

فکر اسفل ہے میری مرتبہ اعلیٰ تیرا
وصف کیا خاک لکھے خاک کا پتلا تیرا

اس کا مطلب بایں طور ہے کہ، کہ اے مالک بے نیاز اگر ہم تیرا تصور وخیال ہی فرمائیں تو میری فکر اور تیرے بلند و بالا مرتبے میں کوئی یکسانیت نہیں ہے۔ اور اگر ہم تیرا تصور فرما کر تیری مدح وستائش میں کوئی کلمہ لکھیں بھی تو کما حقہٗ نہیں لکھ سکتے۔ اس لئے کہ ہماری تخلیق مٹی سے ہوئی ہے۔ اور مٹی کی خصلت اس کے مرتبہ اس کے مزاج میں نیچے کی طرف جھکاؤ ہے۔ جیسا کہ کلیہ ہے کل شئی یرجع الی اصلہ تو جو ہمارے مزاج میں جھکاؤ ہے۔ اس کی بناء پر ہم تیری عظمت شان کے لئے جن بھی کلمات رفیعہ کا استعمال فرمائیں گے وہ غیر موزوں اور غیر مناسب ہی ہوں گے۔ اور تیری ذات اس سے بہتوں گنا بلند و بالا ہے۔ اس کے بعد آگے چل کر اسی حمد پاک میں ارشاد فرماتے ہیں

طور ہی پر نہیں موقوف اجالا تیرا
کون سے گھر میں نہیں جلوہ زیبا تیرا

خیرہ کرتا ہے نگاہوں کو اجالا تیرا
کیجئے کون سی آنکھوں سے نظارہ تیرا

سات پردوں میں نظر اور نظر میں عالم
کچھ سمجھ میں نہیں آتا یہ معما تیرا

سچ ہے انسان کو کچھ کھو کے ملا کرتا ہے
آپ کو کھو کے تجھے پائیگا جویا تیرا

مضمون کی طوالت کے خوف سے اس کے بعد آپ کے نعت اور منقبت کے چند اور اشعار پیش کر رہا ہوں۔ حضرت حسن بریلوی کی علو فکر ملاحظہ ہو۔

لامکاں میں نظر آتا ہے اجالا تیرا
دور پہنچایا ترے حسن نے شہرہ تیرا

کس کے دامن میں چھپے کس کے قدم پر لوٹے
تیرا سگ جائیں کہاں چھوڑ کے ٹکڑا تیرا

پاؤں مجروح ہیں منزل ہے کڑی بوجھ بہت
آہ گر ایسے میں پایا نہ سہارا تیرا

نیک اچھے ہیں کہ اعمال ہیں ان کے اچھے
ہم بدوں کے لئے کافی ہے بھروسا تیرا

خار صحرائے نبی پاؤں سے کیا کام تجھے
آ مری جان مرے دل میں ہے رستہ تیرا

اے مدینے کی ہوا دل مرا افسردہ ہے
سوکھی کلیوں کو کھلا جاتا ہے جھونکا تیرا

اور آخر میں کتنا ہی پیارا رویہ اختیار کیا ہے جو ایک آقا اور بندے کے مابین ہوا کرتا ہے۔ فرماتے ہیں۔

مرے آقا ہیں وہ ابر کرم اے سوز الم
ایک چھینٹے کا بھی نہ ہوگا نہ دہرا تیرا

اور اسی نعت پاک کے بعد سلطان الہند حضرت خواجہ غریب
نواز رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی شان میں ایک بڑی پیاری منقبت
ہے جس کی رقم طرازی سے متعلق حضرت استاذ زمن نے
خود اس نعت پاک کے مقطع میں اشارہ فرمادیا ہے۔ پہلے
مقطع ملاحظہ ہو اس کے بعد منقبت ۔۔۔

اب حسن منقبت خواجہ اجمیر سنا
طبع پر جوش ہے رکتا نہیں خامہ تیرا

اس منقبت کا آغاز اس طرح ہوتا ہے ۔۔۔

خواجہ ہند وہ دربار ہے اعلیٰ تیرا
کبھی محروم نہیں مانگنے والا تیرا

خاص کر اس شعر میں استاذ زمن حضرت حسن بریلوی کی
فکری تگ و تاز ملاحظہ ہو ۔۔۔

خفتگان شب غفلت کو جگا دیتا ہے
سالہا سال وہ راتوں کا نہ سونا تیرا

میری عقل حیران ہے اور فیصلہ نہیں کر پا رہی ہے کہ آپ
کے کلام سے کسی کو ترک کیا جائے اور کسی کو نقل کیا جائے
اگر دل کی کوئی پوچھے تو اس وقت میرا دل یہی کہہ رہا ہے
کہ آپ کا پورا کا پورا دیوان نقل کر دوں۔ لیکن ایسا کر
نہیں سکتا۔ آہا! کیا ہی پیارا شعر ہے ملاحظہ ہو فرماتے ہیں۔

کیا مہک ہے کہ معطر ہے دماغ عالم
تختۂ گلشن فردوس ہے روضہ تیرا

اس منقبت کے بعد پھر نعتیہ کلام شروع ہوگئے ہیں ۔۔۔

بلا لیتے ہیں اس کو جس کی بگڑی یہ بناتے ہیں
کمر بندھنا دیار طیبہ کو کھلنا ہے قسمت کا
الٰہی بعد مردن پردہ ہائے حائل اٹھ جائیں
اجالا مرے مرقد میں ہو انکی شمع تربت کا
وجود پاک باعث خلقت مخلوق کا ٹھہرا
تمہاری شان وحدت سے ہوا اظہار کثرت کا

بالکل منہ بولتا ہوا شعر ۔۔۔

اگر دم بھر تصور کیجئے شان پیمبر کا
زباں پر شور ہو بے ساختہ اللہ اکبر کا

وہ شفاعت کو چلے ہیں پیش حق
عاصیو تم کو مبارک باد ۔
تم ذات خدا سے نہ جدا ہو نہ خدا ہو
اللہ کو معلوم ہے کیا جانیے کیا ہو
یوں جھک کے ملے ہم سے کمینوں وہ جبکو
اللہ نے اپنے ہی لئے خاص کیا ہو ۔

حدیث کے مفہوم کی جلوہ فرمائی ملاحظہ فرمائیں ۔۔۔

اپنا عزیز وہ ہے جسے تو عزیز ہے
ہم کو ہے وہ پسند جسے آئے تو پسند
قبر میں خوب کام آتی ہے
بیکسوں کی ہے یار غار درود

نیک آرزوؤں و خواہشوں کا اندازہ دیکھئے کتنا پیارا اور
دلفریب انداز ہے۔ فرماتے ہیں ۔۔۔

بیٹھتے اٹھتے جاگتے سوتے
ہو الٰہی مرا شعار درود
جان نکلے تو اس طرح نکلے
تجھ پر اے غمزدوں کے یار درود

آخر میں استاذ زمن حضرت حسن بریلوی کی ایک بہت
ہی مشہور نعت پاک کے چند اشعار پیش کر کے اپنی گفتگو
کا سلسلہ تمام کرنا چاہتا ہوں ۔۔۔

سیر گلشن کون دیکھے دشت طیبہ چھوڑ کر
سوئے جنت کون جائے در تمہارا چھوڑ کر
سرگزشت غم کہوں کس سے ترے ہوتے ہوئے
کس کے در پر جاؤں تیرا آستانہ چھوڑ کر
ایسے جلوے پر کروں میں لاکھ حوروں کو نثار
کیا غرض کیوں جاؤں جنت کو مدینہ چھوڑ کر
مر کے جیتے ہیں جو ان کے در پہ جاتے ہیں حسن
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر

یقیناً حضرت حسن بریلوی نے جب اپنے آپ کو رسول
علیہ الصلوٰۃ والسلام کے حوالے کر دیا تو وہ زندہ جاوید ہو
گئے اور ہمیشہ کی زندگی پا گئے اور آنے والی نسلیں اسی
طرح ان کی مقدس روح کو خراج عقیدت پیش کرتی

باقی ص ۔۔۔

حضرت حسن بریلوی کی نعتیہ شاعری
"ذوق نعت" کے آئینہ میں

مولانا شبنم کمالی پرنسپل جامعہ امانیہ لوام دربھنگہ (بہار)

ہندوستان کے مشہور و معروف شہر بریلی" کا خانوادۂ رضویہ، خوف خدا، حب رسول، محبت غوث اعظم اور اولیائے کرام کی الفت کے باعث عرصۂ دراز سے ایک امتیازی خصوصیت کا حامل رہا ہے علم وفضل، زہد و تقوی، پابندیٔ شرع اور عظمت سادات کرام نے اس خاندان ذی شان کو صاحب عقل و خرد کے لئے مینارۂ نور ثابت کیا ہے خصوصیت کے ساتھ ہادیٔ اعظم، رسول مکرم، نبی محترم خاتم الانبیاء سید المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کی مدحت سرائی حضور کے لئے جذبۂ جاں نثاری سرکار کے علوئے شان کے ذکر رفعت و مراتب کے والہانہ اور فدا کارانہ بیان نے خاندان رضویہ کے اسلاف و اخلاف کو طرۂ امتیاز بخشا ہے۔ خواہ وہ بیان اثباتی انداز میں ہو یا دشمنوں کی ہرزہ سرائیوں پر مدافعانہ صورت میں ہو چاہے وہ نظم کی شکل میں ہو یا نثر کے پیرایہ میں ہو۔ اسی خانوادۂ علمیہ کے ایک روشن چراغ یا یوں کہہ لیجئے کہ اسی آسمان علم وادب کے ایک نیر تاباں اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قادری بریلوی علیہ الرحمۃ والرضوان ہیں۔

امام احمد رضا کی وسعت علمی، سطوت و دانائی اور دریائے افکار وفنون کی گہرائی و گیرائی کا سکہ قلوب عالم پر ثبت ہو چکا ہے۔ ان کے نعتیہ کلام کی فصاحت و بلاغت، ان کے طرز بیان کی لطافت و سلاست، ان کے خیال کی معنویت و مقصدیت اور ان کی شاعرانہ عظمت کو تمام اہل فن نے تسلیم کر لیا ہے۔ ان کے بارے میں قادر الکلام ماہر فن استاذ الشعراء کو بھی اس شعر کی تصدیق کرنی پڑی ہے

ملک سخن کی شاہی تمکو رضا مسلم
جس سمت آگئے ہو سکے بٹھا دیے ہیں

اسی عبقری شخصیت علوم و فنون کے ہمالہ اور مسلم الثبوت شاعر حضرت امام احمد رضا کے برادر اوسط کا نام نامی حسن رضا خاں حسن بریلوی ہے حضرت علامہ حسن رضا خاں رحمۃ اللہ علیہ کی ولادت ۱۹ اکتوبر ۱۸۵۹ء کو بریلی میں ہوئی اور وفات ۱۹۰۸ء میں ہوئی

معیار نعت گوئی

حضرت حسن بریلوی اس معاملہ میں یقیناً بڑے ہی خوش نصیب ہیں کہ ان کی نعتیہ شاعری نعت حضور کے معیار پر شایان شان اترتی ہے نہ یہاں شاعرانہ مبالغہ آمیزی ہے نہ جولانی طبع کی بے راہ روی نہ فکر کی لاپروائی ہے اور نہ فن کی بے اعتدالی تشبیہات ہوں یا تمثیلات اگر چہ وہ ندرت خیال اور جودت فکر کا مرقع ضرور ہیں، لیکن آداب رسالت کے دائرہ سے سر مو بھی منحرف نظر نہیں آتیں۔

تنقیص مراتب یا عامیانہ منازل کا تو یہاں وہم و گمان بھی پیدا نہیں ہو سکتا کیونکہ اسے ہر صاحب علم اور اہل بصیرت کفر سمجھتا ہے، پھر ایسی بات اس خانوادہ کے کسی بھی اہل علم سے کیسے ممکن ہو سکتی ہے جو عظمت و رفعت رسول اللہ کا نقیب ہو اس لئے یہاں نہ بڑھانے کی بات ہے نہ گھٹانے کا سوال بلکہ حقیقت بیانی ہی مقصود اعلیٰ ہے۔ پھر یہ امر بھی درجہ تقدیم میں ہے کہ نعتیہ شاعری کے لئے جذبۂ ایمانی اور علوم شرعی کے ساتھ صحیح معنوں میں محبت رسول بھی ہو۔ اور منقبت کے لئے ایمان کے ساتھ اولیائے کرام سے عقیدت قلبی بھی ہو۔ اور یہ تمام باتیں حضرت حسن کی ذات گرامی میں بدرجۂ احسن پائی جاتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے "الملفوظ" میں حضرت حسن کی نعتیہ شاعری کی تعریف کی ہے اور اسے سراہا ہے۔ اعلیٰ حضرت نے جس کی نعتیہ شاعری کو پسندیدگی کی سند عطا فرمادی اور

منوال شریعت پر درست بتایا اس کی خوبی اور بہتری میں کیا کلام ہوسکتا ہے۔

امام الشعراء کے مقتدی

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے نعتیہ کلام اور حضرت حسن بریلوی کے کلام کے ساتھ موازنہ کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ کلام اعلیٰ حضرت میں فصاحت و بلاغت بہ درجۂ اتم پائے جانے کے ساتھ ساتھ جامعیت، روحانیت، سلاست و سادگی اور سب سے بڑھ کر معیار ادب اور عشق رسول کا والہانہ جذبہ جو طرۂ امتیاز رکھتا ہے، وہ کسی بھی نعت گو شاعر میں اس انداز میں نہیں پایا جاتا۔ اعلیٰ حضرت اس رنگ میں منفرد ہیں۔ اگر بعد والوں نے اپنے کلام میں اس کا قدرے اظہار بھی کیا ہے تو ان کی حیثیت تابعین یا ناقلین کی ہے۔ اس انداز فکر اور ادب شناسی میں بھی اعلیٰحضرت اپنے ہم عصر اور بعد والے تمام نعت گو شاعروں کے امام ہیں۔ امام احمد رضا واقعی امام الشعراء کہلانے کے صحیح مستحق ہیں۔ اور حسن بریلوی اپنی نعتیہ شاعری میں اسی امام کے مقتدی ہیں۔

بہاریہ شاعری

حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی شاعری کا ابتدائی دور بہاریہ شاعری میں گذرا۔ غزل کے جو بھی فکری اور فنی مطالبات ہیں ان کو عروج و ارتقار کی منزل تک پہونچانے میں وہ مشغول رہے۔ پھر کامیابی و کامرانی نے ان کے نقش قدم کو اس طرح چوما کہ وہ اپنی حیات ہی میں استاذ فن، ماہر شعر و سخن اور صاحب فصاحت و بلاغت شمار کیے جانے لگے۔ اس وقت داغ دہلوی رام پور میں رہتے تھے وہیں ان سے ملاقات ہوئی تو داغ دہلوی سے اپنے غزلیہ کلام کی اصلاح لینے لگے تھے پھر داغ دہلوی کے ارشد تلامذہ میں حسن بریلوی کو امتیازی خصوصیت حاصل ہو گئی۔ پھر وہ دور بھی آیا کہ داغ دہلوی ان کی بہاریہ شاعری کی بہت زیادہ تعریف کرنے لگے اور اپنے تلامذہ میں ان کو نمایاں مقام دینے کے ساتھ ساتھ ان کا احترام بھی کرنے لگے۔

حسن بریلوی نے داغ کی پیروی رنگ اور فن میں ضرور کی ہے لیکن فکر و خیال میں ان کا مقام داغ سے بالکل ہی الگ تھلگ ہے اس لئے کہ رندانہ سوقیانہ اور عامیانہ انداز حضرت حسن کی بہاریہ شاعری میں بھی نہیں پایا جاتا جبکہ داغ کے کلام میں ایسی باتیں جابجا مل جاتی ہیں۔ اس کی وجہ ان کا ایک علمی، دینی مذہبی خانوادہ سے تعلق ہونا اور خود بھی صاحب علم و فضل راسخ العقیدہ مذہبی شخصیت ہونا ہے۔ یہ بات داغ کے یہاں نہیں تھی۔

حضرت حسن کی بہاریہ شاعری کا دیوان "ثمر فصاحت" کے نام سے ان کی حیات ہی میں سنہ ۱۹۰۰ء میں شائع ہوا اور اہل فکر و نظر میں مقبول ہوا۔

نعتیہ شاعری

۱۳۲۵ھ میں حضرت حسن بریلوی اپنے اہل و عیال کے ساتھ حرمین شریفین کی زیارت اور حج کی سعادت سے شرف یاب ہوئے۔ اگرچہ اس کے پہلے بھی گاہے بگاہے نعت کہی لیکن حج سے واپسی کے بعد غزل گوئی کو مکمل ترک کر دیا اور صرف نعت رسول، منقبت اور مذہبی عقائد پر مشتمل شاعری ہی کو اپنا وظیفۂ حیات اور وسیلۂ نجات بنا لیا۔ نعت گوئی میں اپنے بڑے بھائی اعلیٰ حضرت امام احمد رضا سے اصلاح اور مشورہ لیا۔ حضرت داغ اس کی دوا نہیں تھے۔ پھر شاعری کی اس مقدس صنف کا مزاج بھی جداگانہ ہے۔ یہ نعتیہ رنگ خاص خانوادۂ رضویہ اور اس سے متعلقین ہی کا ہو سکتا تھا۔

جب داغ دہلوی نے حضرت حسن کے نعتیہ کلام کو دیکھا تو اس کی تعریف کی اور بقول معتبر یہ بھی کہا کہ اگر میں نعتیہ شاعری کرتا تو حسن کو اپنا استاد بناتا۔ جب داغ دہلوی حضرت حسن کے بارے میں ایسا خیال رکھتے تھے تو پھر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کے نعتیہ دیوان کو دیکھ لینے کے بعد ان کا کیا ارشاد ہوتا۔ ویسے اعلیٰ حضرت کے بعض کلام کو دیکھ کر پسندیدگی

اور حیرت کا اظہار تو ضرور کیا تھا۔

حسن بریلوی اپنی شاعری کی ابتداء سے عہد شباب اور حج بیت اللہ سے پہلے تک غزل کے ایسے شاعر تھے کہ بعد میں ان کی حیثیت خود ایک مسلم الثبوت استاد کی ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ جب نعتیہ شاعری کی طرف قلبی اور فکری توجہ وقف کر دی اور مکمل طور سے اس کی طرف مشغول ہو گئے تو نعتیہ شاعری میں بھی شوکتِ الفاظ، سطوتِ خیال اور رفعتِ مضامین کے ساتھ ساتھ ادب کے پیرایہ میں رنگ تغزل بھی واضح اور نمایاں نظر آنے لگا۔ ان کے کلام میں زبان کی صحت، محاورات کا استعمال، اظہار محبت و عقیدت کا والہانہ انداز بیان کی شائستگی کے ساتھ پورے طور پر موجود ہے۔

ذوق نعت

ان کی نعتیہ شاعری کا دیوان "ذوق نعت" کے نام سے سنہ ۱۹۰۷ء میں پہلی مرتبہ شائع ہوا اس وقت وہ حیات تھے۔ ظاہر ہے اپنی آنکھوں کے سامنے اپنا مطبوعہ دیوان دیکھ کر انھیں خوشی ضرور ہوئی ہوگی، ورنہ بہت سے شعراء اس کا ارمان دل میں لئے ہوئے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں۔ ابھی میرے سامنے ذوق نعت کا ایک نسخہ موجود ہے۔ میں شروع سے آخر تک اسے دیکھ گیا ہوں۔ اسے دیکھ کر ان کی فنی مہارت، قادر الکلامی اور فکر کی پختگی کا دل سے معترف ہونا پڑا۔ گلشن افکار اور چمنستان خیال کے اس مجموعہ میں ایک بندۂ مومن کے قلب و نظر کی تسکین کا سبھی سامان موجود ہے۔ شاعر محترم نے اپنی نعتیہ شاعری میں جن افکار و خیالات کا اظہار کیا ہے اور جس انداز میں اپنے قلبی تاثرات کو صفحاتِ قرطاس پر پیش کرنے کی سعادت حاصل کی ہے، ہر ایک کی جلوہ نمائی تو ممکن نہیں پھر بھی جو باتیں نمایاں نظر آتی ہیں ان کا عکس جمیل سامنے رکھنے کی سعی تو ضرور کرونگا۔ اللہ کامیاب فرمائے۔

حمد باری تعالیٰ

"ذوق نعت" میں نعتوں سے پہلے دو حمد موجود ہیں جن میں شاعر نے خلاق کائنات اللہ عزوجل کی بارگاہ میں تعریف و ثنا کے کچھ پھول پیش کئے ہیں۔ لیکن حمد کے شعروں میں بھی عام شاعروں سے ان کا انداز جداگانہ نظر آتا ہے۔ قدیم روش سے ہٹ کر نیا اسلوب اختیار کر کے بعد والے لوگوں کو ایک نئی راہ دکھائی ہے ملاحظہ فرمائیں۔ دونوں سے صرف تین تین شعر حاضر ہیں۔

اس بے کسی میں دل کو مرے ٹیک لگ گئی
شہرہ سنا جو رحمت بے کس نواز کا
مانند شمع تیری طرف لو لگی رہے
دے لطف میری جان کو سوز و گداز کا
تو بے حساب بخش کہ ہیں بے شمار جرم
دیتا ہوں واسطہ تجھے شاہ حجاز کا

فکر اسفل ہے مری مرتبہ اعلیٰ تیرا
وصف کیا خاک لکھے خاک کا پتلا تیرا
پھر نمایاں جو سر طور ہو جلوہ تیرا
آگ لینے کو چلے بندۂ شیدا تیرا
چار اضداد کی کس طرح گرہ باندھی ہے
ناخن عقل سے کھلتا نہیں عقدہ تیرا

آگ، ہوا، پانی، مٹی یہ چار عنصر ہیں جو ایک دوسرے کی ضد ہیں پھر ان چاروں ضدوں کو اللہ تبارک و تعالیٰ نے یکجا کر کے انسان کی تخلیق فرمائی۔ عقل انسانی اس ترکیب اور حکمت کو سمجھنے سے قاصر ہے۔ اسی بات کی طرف آخری شعر میں اشارہ کیا گیا ہے۔

تقسیم عنوانات

نعتیہ شاعری کا مرکزی خیال اور محور خصوصی حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے۔ اسی مرکز کے گرد اور اسی دائرہ میں پوری نعتیہ شاعری بقدر ظرف نظر تجلیوں کا اکتساب کرتی رہتی ہے۔ ذوق نعت میں بھی یہی باتیں اپنے رنگ خصوصی اور انداز خاص کے ساتھ موجود ہیں۔ ہم ان کو تقریب فہم کے لئے چند عنوانات میں تقسیم کر سکتے ہیں۔ ہم ہر عنوان کے تحت

روز اک چاند تصدق میں اتارا کرتا

واہ اے عطرِ خدا ساز مہکنا تیرا
خوبرو ملتے ہیں کپڑوں میں پسینہ تیرا

یہاں بھی پہلے شعر میں تلمیح ہے پھر حسنِ حضور کی عکاسی دونوں شعروں میں واضح ہے تیسرے شعر میں "عطرِ خدا ساز" ایک نئی اور نادر تشبیہ ہے دو شعر اور بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

بزمِ خوباں کو خدا نے پہلے دی آرائشیں
پھر مرے دولہا کو سوئے بزمِ خوباں لے چلا
تو ہی نے تو مصر میں یوسف کو یوسف کردیا
تو ہی تو یعقوب کی آنکھوں کا تارا ہوگیا

اگر نورِ محمدی کا صدقہ اور حسنِ حضور کا جلوہ نہ ہوتا تو حسن و جمال کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس مضمون کو دلکش انداز میں باندھنے کی سعی جمیل کی گئی ہے۔

ذکرِ سراپائے حضور

مندرجہ ذیل اشعار میں جن اعضائے مقدسہ کا ذکر کیا گیا ہے ہر ایک کی تشریح طویل ہوجائے گی۔ ان پر میں نے وضاحتی نشان لگاتے ہوئے پہلو میں تحریر بھی کردیا ہے۔ ہر ایک شعر پر توجہ کرکے شعر کی خوبیوں اور حسنِ بیان کا اندازہ لگایا جاسکتا ہے ؎

شعر	
گلزار کو آئینہ کیا منہ کی چمک نے	منہ
آئینہ کو رخسار نے گلزار بنایا	رخسار
روئے مولیٰ سے اگر اٹھتا نقاب	
چرخ کھاکر غش میں گرتا آفتاب	رو (چہرہ)
دیکھنے والوں کے دل ٹھنڈے کئے	
عارضِ انور ہے ٹھنڈا آفتاب	عارض
سر سے پا تک ہر ادا ہے لاجواب	
خوبرویوں میں نہیں تیرا جواب	سراپا
ان کے درِ دنداں کا وہ صدقہ تھا کہ جس نے	
ہر قطرۂ نیساں درِ شہوار بنایا	دنداں
یہ گردن پر نور کا پھیلا ہے اجالا	
یا صبح نے سر ان کے گریباں سے نکالا	گردن

شعر	
ابروئے پرخم سے پیدا ہے ہلالِ ماہِ عید	ابرو
مطلعِ عارض سے روشن بدرِ تابانِ جمال	عارض
تصور لطف دیتا ہے دہانِ پاک سرور کا	دہان
بھر آتا ہے پانی میرے منہ میں حوضِ کوثر کا	
یا خدا دیکھوں بہارِ خندۂ دنداں نما	دنداں
برسے کشتِ آرزو پر ابرِ نیسانِ جمال	
لبِ جاں بخش کی قربت حیاتِ جاوداں دیتی	لب
اگر ڈورا نفس کا ریشۂ مسواک ہوجاتا	
ان کے گیسو نہیں رحمت کی گھٹا چھائی ہے	گیسو
ان کے ابرو نہیں دو قبلوں کی یکجائی ہے	ابرو
زلفِ حضور عارضِ پرنور پر نثار	زلف
کیا نور بار شام ہے کیا جلوہ بار صبح	عارض

مذکورہ اشعار میں تشبیہات دلکش بھی ہیں، اور جدید بھی۔ مثلاً آفتاب کا چرخ کھاکر غش میں گرنا۔ عارضِ انور کو ٹھنڈا آفتاب کے ساتھ تشبیہ دینا۔ دُرِ دنداں کے صدقے ہر قطرۂ نیساں کا درِ شہوار بن جانا حضور کے گریبان سے صبح کے سر نکالنے گردنِ پرنور کے پھیلتے ہوئے اجالا کی تشبیہ دینا۔ ابروئے پرخم کی ہلالِ ماہِ عید کے ساتھ تشبیہ دینا۔ دہانِ پاک کے تصور سے منہ میں حوضِ کوثر کا پانی بھر آنا۔ خندۂ دنداں نما کی بہار سے کشتِ آرزو پر ابرِ نیسانِ جمال کی بارش کی تمنا کرنا۔ پھر یہ آرزو کتنی نادر اور جدید ہے کہ میری روح کا تار، نفس کا ڈورا اگر حضور کی مسواک کا ریشہ (تنکا) ہوجاتا تو حضور کے جان بخشنے والے لب کی قربت حیاتِ جاوداں عطا کرتی۔ دونوں ابرو کو دو قبلوں کی یکجائی سے تشبیہ دینا سب سے بڑی پیاری پیاری تشبیہات ہیں۔ اس سلسلہ کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

جلوہ موئے محاسن چہرۂ انور کے گرد
آبنوسی رحل پر رکھا ہے قرآنِ جمال

یہ ایسی نادر اور جاں فزا تشبیہ ہے کہ پڑھتے جائیے۔ ساتھ ہی دل، دماغ اور زبان کو ذکر و تصور سے شادکام بناتے جائیے۔ چہرۂ انور کی قرآن

صرف چند اشعار ہی پیش کر رہے ہیں تاکہ طوالت بھی نہ ہو اور قاری کے لئے آسانی بھی ہو۔ آئیے اب عنوانات اور ہر عنوان کے ضمن میں چند اشعار آپ ملاحظ فرمائیے۔

ذکر ولادت حضور

حضرت حسن بریلوی نے اس عنوان کے تحت تین مکمل نعتیں بھی کہی ہیں اور بعض نعتوں میں ولادت کا ذکر آیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر حضور کی ولادت باسعادت نہیں ہوتی تو کائنات کو خلقت کا وجود نہیں ملتا اس لئے ولادت کے بعد سب کچھ ہے اور حضور سرور عالم کی ذات گرامی ہی اصل وجود ہے۔ حضرت سعدی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب "بوستاں" میں حضور کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے۔

تو اصل وجود آمدی از نخست
دگر ہر چہ موجود شد فرع تست

پھر ایک راسخ العقیدہ شاعر ذکر ولادت رسول سے محروم کیسے رہتا۔ اب حسن بریلوی کے اشعار پیش نظر رکھیں ؎

دونوں جہاں کی شاہی دولہن تھی
پایا دولہن نے دولہا صبح شب ولادت
چاندی مفلسوں کی باندی ہے خوش نصیبی
آیا کرم کا داتا صبح شب ولادت
قربان اے دوشنبے تجھ پر ہزار جمعے
وہ فضل تو نے پایا صبح شب ولادت

ان تین اشعار میں ندرت فکر اور جودت خیال پر نگاہ خاص کے بعد آپ بھی تعریف کرنے میں حق بجانب ہوں گے۔ پھر دوشنبہ پر ہزار جمعوں کا قربان کرنا بھی ایک خاص رنگ ہے جس کی اہمیت سے اہل علم بخوبی واقف ہیں۔ پھر یہ اشعار اور ان میں فصاحت و بلاغت کا انداز دیکھئے ؎

کیا مژدۂ جاں بخش سنائے گا قلم آج
کاغذ پہ جو سو ناز سے رکھتا ہے قدم آج
نذرانہ میں سر دینے کو حاضر ہے زمانہ
اس بزم میں کس شاہ کے آتے ہیں قدم آج
تعظیم کو اٹھے ہیں ملک تم بھی کھڑے ہو
پیدا ہوئے سلطان عرب شاہ عجم آج

حضور کی ولادت باسعادت کی تاریخ بارہویں ربیع الاول ہے جو متحقق بھی ہے اور مسلّم بھی۔ اس کی اہمیت کو شاعر عالی وقار اس طرح واضح کرتے ہیں

عدو ولادت شیطاں کے دن منائے خوشی
کہ عید عید ہماری ہے بارہویں تاریخ
حسن ولادت سرکار سے ہوا روشن
مرے خدا کو بھی پیاری ہے بارہویں تاریخ

ان مذکورہ اشعار میں بدعقیدوں اور منکرین تعظیم نبی پر زجر و توبیخ مقصود ہے۔ انداز دلکش ہے پھر یہ دو شعر بھی زیب نظر بنائیے ؎

پیدائش محبوب کی شادی میں خدا نے
مدت کے گرفتاروں کو زنداں سے نکالا
صدقے ترے اے مردمک دیدۂ یعقوب
یوسف کو تری چاہ نے کنعاں سے نکالا

حسن وجمال حضور

حضور کے حسن وجمال کے بیان میں بھی انکا انفرادی رنگ نمایاں ہے ؎

جو اک گوشہ چمک جائے تمہارے ذرۂ در کا
ابھی منہ دیکھتا رہ جائے "آئینہ سکندر کا"
اگر جلوہ نظر آئے کف پائے منور کا
ذرا سا منہ نکل آئے "ابھی خورشید محشر کا"

پہلے شعر میں "منہ دیکھتے رہ جانا" محاورہ ہے اور اور آئینہ سکندر تلمیح ہے۔ دوسرے شعر میں "ذرا سا منہ نکل آنا" محاورہ ہے۔ محاوروں اور تلمیح کے ساتھ جو انداز بیان میں طمطراق اور دبدبہ کا اظہار ہے وہ بھی لائق ستائش ہے ؎

سوزن گم شدہ ملتی ہے تبسم سے ترے
شام کو صبح بناتا ہے اجالا تیرا
آسماں گر ترے تلووں کا نظارہ کرتا

جمال کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور چہرہ کے گرد حضور کے خوبصورت بالوں کو آبنوسی رحل سے مشابہ کیا گیا ہے۔ رحل وہ بھی آبنوسی سیاہ لیکن سفیدی کی پوری چمک دمک لئے ہوئے کتنی پیاری تشبیہ ہے جس رحل پر قرآن رکھا ہوا اس کا لطف صحیح معنوں میں وہی حاصل کر سکتے ہیں جنہوں نے کتاب روئے احمد کی تلاوت فرمائی ہو۔ اسی طرح ایک ایک شعر قابل قدر ہے۔

رفعت مدارج و مقام حضور

اس عنوان پر بھی بہت سے اشعار لکھے ہیں لیکن چند شعر پیش نظر رکھیں ؎

اونچے اونچوں کو ترے سامنے ساجد پایا
کس طرح سمجھے کوئی رتبۂ اعلیٰ تیرا
اونچی ہو کر نظر آتی ہے ہر اک شے چھوٹی
جا کے خورشید بنا چرخ پہ ذرہ تیرا
جو ذرے آتے ہیں پائے حضور کے نیچے
چمک کے مہر کو وہ شرمسار کرتے ہیں
حسن یوسف دم عیسیٰ پہ نہیں کچھ موقوف
جس نے جو پایا ہے پایا ہے یہ دولت انکی

اختیارات حضور

اس عنوان کے تحت جو اشعار پیش کئے جا رہے ہیں وہ سلاست بیان اور سادگی کی عکاسی کرتے ہیں ان اشعار سے شاعر محترم کے حسن عقیدہ کا علم بھی ہوتا ہے

اللہ اللہ شہ کونین جلالت تیری
فرش کیا عرش پہ جاری ہے حکومت تیری
یہ نہیں ہے کہ فقط ہے یہ مدینہ تیرا
تو ہے مختار دو عالم پہ ہے قبضہ تیرا
کنجی تمہیں دی اپنے خزانوں کی خدا نے
محبوب کیا مالک و مختار بنایا
عالم کے سلاطین بھکاری ہیں بھکاری
سرکار بنایا تمہیں سرکار بنایا
کیوں نہ ہو مالکِ ملکِ خدا ملکِ خدا

سب تمہارا ہے خدا ہی جب تمہارا ہوگیا

سخاوت حضور

مندرجہ ذیل اشعار میں سادگی بلاغت کے ساتھ نمایاں نظر آتی ہے ؎

کیوں اپنی گلی میں وہ روادار صدا ہو
جو بھیک لئے راہ گدا دیکھ رہا ہو
آتا ہے فقیروں پہ انہیں پیار کچھ ایسا
خود بھیک دیں اور خود کہیں منگتا کا بھلا ہو
مرادوں سے تمہیں دامن بھر دوگے نامرادوں کے
غریبوں بے کسوں کا اور پیارے کون والی ہے
مرادیں مانگنے سے پہلے ملتی ہیں مدینہ میں
ہجوم جود نے روکا ہے بڑھنا دست حاجت کا

ذکر محشر اور امید کرم

حشر اور محشر کا ذکر دوسرے شاعروں کی طرح ان کے کلام میں بھی آیا ہے۔ مگر یہاں ایک خصوصیت یہ ہے کہ ان کے یہاں نہ خوف و اضطراب کا ذکر ہے اور نہ اپنی پریشانی اور بدحالی کا تذکرہ نہ آہ و بکا کی صدائیں ہیں اور نہ یاس و ناامیدی کا انداز۔ بلکہ یہاں ایک ایسے بندۂ مومن کا انداز ہے جس کو اپنے آقا کی شفاعت پر یقین کامل ہو۔ اپنے لئے اور دوسرے صحیح العقیدہ مومن گنہگاروں کے لئے بھی۔ اس یقین کے بعد وہ خوف محشر سے بے فکر نظر آتے ہیں اور عرصۂ محشر کو وہ سب سے الگ تھلگ ایک دوسرے ہی انداز سے دیکھتے ہیں۔ ذکر محشر میں ان کا جو شعر بھی نظر آئے گا وہ اپنے اسلوب بیان اور نظریۂ فکر کے اعتبار سے بڑا ہی پیارا تسلی بخش اور مطمئن ساز دکھائی دے گا۔ ملاحظہ فرمایئے۔

فقط اتنا سبب ہے انعقاد روز محشر کا
کہ انکی شان محبوبی دکھائی جانے والی ہے
چلین پائیں گے تڑپتے ہوئے دل محشر میں
غم کسے یاد رہے دیکھ کے صورت تیری
ہوا دل سوختوں کو چاہئے تھی انکے دامن کی
الٰہی صبح محشر کا گریباں چاک ہو جاتا

مجمع حشر میں گھبرائی ہوئی پھرتی ہے
ڈھونڈنے نکلی ہے مجرم کو شفاعت تیری
روز محشر کے عالم کا دشمنوں کو خوف ہو
دکھ ہمارا آپ کو کس دن گوارہ ہو گیا
بزم محشر منعقد کر مہر سامانِ جمال
دل کے آئینوں کو مدت سے ہے ارمانِ جمال
بزم محشر میں حسینانِ جہاں سب جمع ہیں
پر نظر تیری طرف اٹھتی ہے اے جانِ جمال

آپ نے ان مذکورہ اشعار کو دیکھنے کے بعد خود ہی یہ اندازہ کر لیا ہوگا کہ حضرت حسن بریلوی کا محشر اور انعقادِ محشر کے بارے میں کیسا نظریہ اور کیسا خیال ہے یہ نظریہ وفورِ محبت اور عقیدت کی بنا پر ہے۔ اسی عقیدت و محبت نے دل کو خوفِ محشر سے دور اور اطمینان و سکون سے بھرپور کر دیا ہے۔ اس ضمن میں چار اشعار اور بھی پیش نظر رکھیں ان میں محشر کا نقشہ بہت سادگی کے ساتھ کھینچا گیا ہے جو حقیقت پر مبنی ہے اور حدیث حضور کے مطابق ہے ؎

تمہارا نام مصیبت میں جب لیا ہوگا
ہمارا بگڑا ہوا کام بن گیا ہوگا
عزیز بچہ کو ماں جس طرح تلاش کرے
خدا گواہ یہی حال آپ کا ہوگا
کہیں گے سارے نبی اذھبوا الیٰ غیری
مرے حضور کے لب پر انا لہا ہوگا
غلام ان کی عنایت سے چین میں ہونگے
عدو حضور کا آفت میں مبتلا ہوگا

شاعری کی تمنائے دل

تمنا کس دل میں نہیں ہوتی۔ شاعر کا دل بھی تمناؤں سے خالی نہیں ہوتا۔ مگر بارگاہ رسول میں شاعر کی تمنا عام انسانوں کے ساتھ خواہش و آرزو سے الگ ہوتی ہے۔ حضرت حسن بریلوی بھی دربار رسالت میں اپنی اولی آرزو اور خواہش قلبی کا اظہار کرتے ہیں لیکن انداز نہایت پاکیزہ اور قابل قدر ہے۔ ان کی آرزو کو جان کر ہر بندۂ مومن کا دل بھی یہی آرزو کرنے کا مشتاق بن جاتا ہے۔ اس آرزو میں وسعت افکار اور طہارت خیال کا عنصر غالب ہے۔ تمنائیں ملاحظہ کیجئے ؎

اتنی مدت تک ہو دید مصحفِ عارض نصیب
حفظ کر لوں ناظرہ پڑھ پڑھ کے قرآن جمال
میں تصدق جاؤں اے شمس الضحیٰ بدر الدجیٰ
اس دل تاریک پر بھی کوئی لمعان جمال
جلوۂ یار ادھر بھی کوئی پھیرا تیرا
حسرتیں آٹھ پہر تکتی ہیں رستہ تیرا
جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعل پاک حضور
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں
دل درد سے بسمل کی طرح لوٹ رہا ہو
سینہ پہ تسلی کو ترا ہاتھ دھرا ہو
گر وقت اجل سر تری چوکھٹ پہ جھکا ہو
جتنی ہو قضا ایک ہی سجدہ میں ادا ہو

اظہارِ عجز

بارگاہ سید ابرار صلی اللہ علیہ وسلم میں ہر بندۂ مومن جو صاحب دل بھی ہو اپنے کو عاجزانہ اور گدایانہ پیش کرتا ہے۔ عاجزی اور انکساری کا جو انداز سرور کائنات کے دربار عالی وقار میں حضرت حسن نے پیش کیا ہے وہ بھی ادب و احتیاط کے ساتھ محاسن شاعری سے خالی نہیں یہاں جدت بھی ہے اور ندرت خیال بھی، فصاحت بھی ہے اور بلاغت بھی ملاحظہ کیجئے ؎

خدا تار رگ جاں کی اگر عزت بڑھا دیتا
شراک نعل پاک سید لولاک ہو جاتا
ہمیشہ رہ روانِ طیبہ کے زیر قدم آئے
الٰہی کچھ تو ہو اعزاز میرے کاسۂ سر کا
روسیہ ہوں منھ اجالا کر دے اے طیبہ کے چاند
اس اندھیرے پاکھ کا یہ تیرگی اچھی نہیں
ترے صدقے جائے شاہا یہ ترا ذلیل کتا
ترے در پہ بھیک لینے کبھی شہر یار آئے
خدا سگان نبی سے یہ مجھ کو سنوادے

ہم اپنے کتوں میں تجھ کو شمار کرتے ہیں
دو عالم مہماں تو میزباں خوانِ کرم جاری
ادھر بھی کوئی ٹکڑا میاں کبھی کتا ہوں ترے در کا

شہر محبوب اور دشت مدینہ سے محبت

محبوب کی ہر شئی محبوب ہوتی ہے چاہے وہ اسکی ذات ہو یا اس سے متعلق کوئی بھی چیز، صحرا ہو یا دشت، گھر ہو یا در، گلی ہو یا شہر پھول ہو یا خار، ہر ایک کا ذکر اور سب ہے محبت اس کے لئے قرار وسکون کا سبب ہوتی ہے۔ حضرت حسن کی شاعری میں شہر محبوب اور دیار حبیب سے محبت کا عنصر بھی نمایاں ہے۔ ہر ایک کا ذکر بڑے ہی دل کش اور بڑے ہی پیارے انداز میں فرماتے ہیں۔ چند شعر اس ضمن میں بھی پیش نظر رکھیں ؎

مطاف کعبہ کا عالم دکھایا تونے طیبہ میں
ترا گھر بیچ میں چاروں طرف اللہ کا گھر ہے
قریب طیبہ بخشے ہیں تصور نے مزے کیا کیا
مرا دل ہے مدینہ میں مدینہ دل کے اندر ہے
نصیب دوستاں انکی گلی میں گر سکونت ہو
مجھے ہو مغفرت کا سلسلہ ہر تار بستر کا
ذرہ کوئے حبیب اللہ رے تیرے نصیب
پاؤں پڑ کر عرش کی آنکھوں کا تارا ہوگیا
نہ ہو آرام جس بیمار کو سارے زمانے سے
اٹھا لے جائے تھوڑی خاک انکے آستانے سے

ان مذکورہ اشعار میں جودتِ خیال جدید اسلوب فکر اور حسنِ مضامین کے ساتھ حقیقت بیانی بھی واضح اور نمایاں ہے۔ اس ضمن میں کچھ اور اشعار بھی زینت نگاہ بنائیں ؎

کیا کرے وصف کوئی دشت مدینہ تیرا
پھول کی جان نزاکت میں ہے کانٹا تیرا
خار صحرائے نبی پاؤں سے کیا کام تجھے
آمری جان مرے دل میں ہے رستہ تیرا
خاک طیبہ کی اگر دل میں ہو وقعت محفوظ
عیب کوری سے رہے چشم بصیرت محفوظ

غور کیجئے عقیدت مندی، نیاز کیشی کے ساتھ انداز سخن، تخاطب حسین اور حقیقت بیانی کا منفرد انداز اشعار میں واضح ہے۔ یہاں تصنع اور الفاظ کی جادوگری ہرگز نہیں بلکہ عقیدت و محبت کا والہانہ اظہار ہے۔ دو شعر اور بھی ملاحظہ فرمائیں ؎

سیر گلشن کون دیکھے دشت طیبہ چھوڑ کر
سوئے جنت کون جائے در تمہارا چھوڑ کر
مر کے جیتے ہیں جو انکے در پہ جاتے ہیں حسن
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر

اصلاح عقیدہ

صرف ہندوستان ہی نہیں بلکہ بہت سے دوسرے ممالک میں بھی حسن عقیدہ اور اصلاح قلب کی نعمتیں شہر بریلی کے خانوادۂ عالیہ رضویہ سے تقسیم ہوتی رہیں۔ بالخصوص اگر اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی ذات گرامی اور بالعموم اگر خانوادہ اور اس سے متعلقین دیگر مقتدر ہستیاں نہ ہوتیں تو بد عقیدگی کے جراثیم پورے معاشرۂ اسلامیہ میں سرایت کرنے والے ہی تھے۔ اس خانوادۂ رضویہ کے تقریباً ہر فرد نے بر قدر علم و استطاعت مسلمانوں کو مسلمان باقی رکھنے کے لئے حق و باطل کے فرق کو واضح کیا اور ہر شخص نے اپنی اپنی حیثیت اور وسعت کیمطابق حسن عقیدہ کی حفاظت اور باطل عقیدہ کی اصلاح کے لئے جان و دل سے کوششیں کیں۔ خصوصاً مقام سرور انبیاء اور مراتب اولیائے عظام کو آئینہ تاباں کی طرح بلکہ چمکتے ہوئے سورج کی طرح منور اور درخشاں کردیا حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے پریس کے ذریعہ ماہانہ رسالہ "بہار بے خزاں" اور ہفتہ وار اخبار "روز افزوں" تو شائع ہی کیا ساتھ ہی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ بھی جاری رکھا۔ لیکن یہاں میری بحث ان کی نعتیہ شاعری میں اصلاح عقیدہ سے ہے صرف چار شعر ملاحظہ فرمائیں ؎

ترے رتبہ میں جس نے چون و چرا کی
نہ سمجھا وہ بد بخت رتبہ خدا کا

اس بدلگام کو خرِ دجال جانیے
منہ آئے ذکر پاک کو سن کر جو خر دماغ

یہ عبادت زاہد بے حب دوست
مفت کی محنت ہے سب برباد ہے
بندۂ سرکار ہو پھر کر خدا کی بندگی
ورنہ اے بندے خدا کی بندگی اچھی نہیں

کشف راز نجدیت

اس عنوان سے ایک نظم ہے جس میں پہلے تو نجدیوں وہابیوں سے خطاب فرما کر ان کی اصلیت کو بے نقاب کیا ہے اس کے بعد آخر میں صحیح العقیدہ سنی مسلمانوں کو نصیحت فرمائی ہے اور بدعقیدوں کی صحبت سے اجتناب کی تاکید کی ہے۔ اس طویل نظم سے چند شعروں کا انتخاب پیش ہے ؎

نجد یا سخت ہی گندی ہے طبیعت تیری
کفر کیا شرک کا فضلہ ہے نجاست تیری
علم شیطاں کا ہوا علم نبی سے زائد
پڑھوں لاحول نہ کیوں دیکھ کے صورت تیری
ان کی تعظیم کریگا نہ اگر وقت نماز
ماری جائے گی ترے منہ پہ عبادت تیری
کھلے لفظوں میں کہے قاضی شوکاں مددے
یا علی سن کے بگڑ جائے طبیعت تیری

مرے پیارے، مرے اپنے، مرے سنی بھائی
آج کرنی ہے مجھے تجھ سے شکایت تیری
حشر کا دن نہیں جس روز کسی کا کوئی
اس قیامت میں جو فرمائیں شفاعت تیری
ان کے دشمن کو اگر تو نے نہ سمجھا دشمن
وہ قیامت میں کریں گے نہ رفاقت تیری

تمہید ذکر معراج

اسی ذوق نعت،، میں معراج نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تمہید کے طور پر ایک نظم کے چند بند موجود ہیں۔ نظم نہایت مرصع ہے اس میں شوکت الفاظ اور معنویت کے ساتھ زور بیانی حقیقی پیرایہ میں واضح نظر آتی ہے صرف ایک بند حاضر ہے ؎

معراج کی یہ رات ہے رحمت کی رات ہے
فرحت کی آج شام ہے عشرت کی رات ہے
ہم تیرہ اختروں کی شفاعت کی رات ہے
اعزاز ماہ طیبہ کی رویت کی رات ہے
پھیلا ہوا ہے سرمۂ تسخیر چرخ پر
یا زلف کھولے پھرتی ہیں حوریں ادھر ادھر

ذکر شہادت

اس عنوان پر بھی چند نظمیں ہیں۔ فصاحت و بلاغت کا کیا کہنا وہ تو اپنی جگہ مسلم ہے مگر الحمد للہ افراط و تفریط کے عیب سے بھی بالکل پاک ہے۔ حق گوئی اور درست بیانی ان نظموں کا عنصر خاص ہے۔ میر انیس لکھنوی اور مرزا دبیر لکھنوی کے لئے آئینہ اصلاح بھی ہے۔ یہ دونوں حضرات وہ ہیں جنہوں نے مرثیہ میں اس قدر زور بیانی اور کہیں کہیں اس قدر مبالغہ آمیزی سے کام لیا ہے کہ حقیقت کا دامن کوسوں دور چھوٹا ہوا نظر آتا ہے۔ لیکن حسن بریلوی کے یہاں مستند روایتوں سے حقیقت کا اظہار ہی مقصد اول ہے۔ ایک نظم کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

رزم کا میداں بنا ہے جلوہ گاہ حسن و عشق
کربلا میں ہو رہا ہے امتحان اہلبیت
پھول زخموں کے کھلائے ہیں ہوائے دوست نے
خون سے سینچا گیا ہے گلستان اہلبیت
اے شباب فصل گل یہ چل گئی کیسی ہوا
کٹ رہا ہے لہلہاتا بوستان اہلبیت
سر شہیدان محبت کے ہیں نیزوں پر بلند
اور اونچی کی خدا نے قدر و شان اہلبیت
بے ادب گستاخ فرقہ کو سنادے اے حسن
یوں کہا کرتے ہیں سنی داستان اہلبیت

اسی ذکر شہادت کے عنوان پر دوسری نظم کے چند شعر اور بھی ملاحظہ فرمائیں۔ تشبیہات نئی اور عمدہ ہیں۔ زخموں کی تشبیہ ان کھڑکیوں سے دینا جس سے جنت

کی ہوائیں آتی ہوں، فرشتوں کے پر کا پنکھا بننا، زخموں کے پھولوں کو رنگین گلدستوں سے تشبیہ دینا بڑی ہی عمدہ تشبیہات ہیں جو فصاحت و بلاغت اور انداز بیان کی نوعیت و دل کشی بھی تسلیم شدہ ہے ؎

گلا کٹوا کے بیڑی کاٹنے آئے ہیں امت کی
کوئی تقدیر تو دیکھے اسیران مصیبت کی
شہید ناز کی تفریح زخموں سے نہ کیونکر ہو
ہوائیں آتی ہیں ان کھڑکیوں سے باغ جنت کی
ہوائے یار نے پنکھے بنائے پر فرشتوں کے
سبیلیں رکھی ہیں دیدار نے خود اپنے شربت کی
سجے ہیں زخم کے پھولوں سے وہ رنگین گلدستے
بہار خوشنمائی پر ہے صدقے روح جنت کی
ادھر لپٹیں اٹھیں حسن ازل کے پاک جلووں سے
ادھر چمکی تجلی بدر تابان رسالت کی
حسن سنی ہے پھر افراط و تفریط اس سے کیونکر ہو
ادب کے ساتھ رہتی ہے روش اہل سنت کی

رباعیات

"ذوق نعت" کے آخری دو صفحات میں بارہ رباعیاں بھی موجود ہیں رباعی کہنا بھی ایک خاص فن ہے۔ اس فن میں حسن بریلوی بدرجۂ احسن کامیاب ہیں صرف ایک رباعی ذوق نظر کی تسکین کے لئے پیش ہے ؎

جو لوگ خدا کی ہیں عبادت کرتے
کیوں اہل خطا کی ہیں حقارت کرتے
بندے جو گنہگار ہیں وہ کس کے ہیں
کچھ دیر اسے ہوتی ہے رحمت کرتے

نظم استغاثہ

صفحہ ۴۱ سے صفحہ ۴۳ تک میں ایک نظم موجود ہے جس کے قوافی تاباں، دنداں، دوراں وغیرہ ہیں اور اس کی ردیف "الغیاث" ہے اس نظم کی خوبی یہ ہے کہ حضور سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سراپا کا از اول تا آخر ذکر کر کے اسے وسیلہ بنا کر مدد طلب کی گئی ہے۔ زلف سے شروع کر کے قدم پر ختم کیا گیا ہے۔ پھر اس کے بعد لباس، عمامہ، عبا، قبا، نعل پاک شراک، شانہ، سرمہ، مسواک اور آئینہ وغیرہ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ چند اشعار ملاحظہ فرمائیں ؎

غمزدوں کی شام ہے تاریک رات
اے جبیں اے ماہ تاباں الغیاث (جبیں)
ابروئے شہ کاٹ دے زنجیر غم
تیرے صدقے تیرے قرباں الغیاث (ابرو)
اے کرم کی کان اے گوش حضور
سن لے فریاد غریباں الغیاث (گوش)
جاں بلب ہوں جاں بلب پہ رحم کر
اے لب عیسیٰ دوراں الغیاث (لب)
در مقصد کے لئے ہوں غرق غم
گوہر شاداب دنداں الغیاث (دنداں)
چاہ غم میں ہوں گرفتار الم
چاہ یوسف اے زنخداں الغیاث (زنخداں)
اے گلوئے صبح جنت شمع نور
تیرہ ہے شام غریباں الغیاث (گلا)
اے بغل اے صبح کافور بہشت
مہر بر شام غریباں الغیاث (بغل)
بہر حق اے ناخن عقدہ کشا
مشکلیں ہو جائیں آساں الغیاث (ناخن)
اے شکم بھر پیٹ صدقہ نور کا
پیٹ بھر اے کان احساں الغیاث (شکم)
مہر پشت پاک میں تجھ پر فدا
دے دے آزادی کا فرماں الغیاث (مہر پشت)
پائے انور اے سر افرازی کی جاں
میں شکستہ پا ہوں جاناں الغیاث (پائے انور)

طویل نظم سے صرف چند شعروں کا انتخاب حضرت حسن بریلوی کی مہارت فن اور شاعرانہ کمال کو جاننے کے لئے کافی ہے۔ ہر ایک شعر میں آپ نادر تشبیہات کو بھی محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکیں گے۔ پھر اپنے مقصد اور اپنی تمنا کی تکمیل کے لئے فریادیہ دعا پر بھی غور کرنے کے بعد ایک نتیجہ خاص پر پہونچا

جاسکتا ہے۔ بہر کیف پوری نظم قابل قدر اور ادب کا ایک شاہکار ہے۔

مناقب

"ذوقِ نعت" میں منقبتوں کی بھی کمی نہیں ہے لیکن اس ضمن میں الگ سے ایک مضمون تحریر کرنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ مجھے کامیاب فرمائے۔

انتخاب شہادت مع آئینۂ قیامت

اس نام کی ایک کتاب جس کے مؤلف میں حضرت حسن رضا خاں کا اسم گرامی درج ہے میرے پیش نظر ہے۔ اس کتاب میں نثر اور نظم دونوں ہے اس میں نظم کی بحر، بحر ہزج مثمن سالم ہے۔ پورے شعر میں مفاعیلن آٹھ مرتبہ آتا ہے مثلاً ؎

تعالیٰ اللہ یہ تھا علم سلطان رسالت کا
نظر کے سامنے تھا واقعہ سارا شہادت کا
معلم تھا خدا روح الامیں تھے مخبر صادق
عیاں تھا آپ پر ہر منظر مستقبل و سابق
یہی وہ علم ہے علم لدنی جس کو کہتے ہیں
یہ ہے وہ علم علم غیب سنی جس کو کہتے ہیں

اتفاق سے حفیظ جالندھری کا شاہنامۂ اسلام بھی اسی بحر میں ہے اس لئے "آئینۂ قیامت" کے اشعار کو بھی شاہنامۂ اسلام کی طرز پر مان لیا گیا ہے۔ یہ کتاب تکمیل نہیں مرقع شہادت اور آئینۂ قیامت سے انتخاب کا ذکر ہے۔ بہت سی باتیں اس کتاب کے ضمن میں تحقیق طلب ہیں اس لئے جب تک ہر بات کی تحقیق نہ ہو جائے میں کوئی اظہار خیال نہیں کر سکتا۔ (۱)

نقشِ آخر

مجھے اس بات کا واقعی اعتراف ہے کہ میں نے اس مضمون میں انتہائی اختصار سے کام لیا ہے پھر بھی میں نے اشارہ کنایہ میں حسن بریلوی کے شاعرانہ فکر و فن کی نشاندہی کر دی ہے۔ اسے دیکھ کر صاحب نقد و نظر کو یہ اعتراف کرنا ہوگا کہ نعتیہ شاعری کو محض روایتی اور مذہبی شاعری کا نام دیکر اس سے بے اعتنائی کسی بھی حال میں مناسب نہیں۔ عام شاعروں کی بات تو میں نہیں کہہ سکتا لیکن جو اہل ایمان صاحب علم و فضل اساتذۂ فن گذرے ہیں انھوں نے نعتیہ شاعری کے معیار کو اس قدر بلند کر دیا ہے کہ محض غزل گو یا علوم دینیہ سے بے بہرہ شعراء منہ تاکتے ہی رہ جائیں گے۔ اس مقام تک ان کی رسائی تو درکنار، پرواز خیال بھی ممکن نہیں۔ ان ہی ممتاز شعراء میں بے شک و شبہ حضرت علامہ حسن بریلوی بھی ہیں جن کی نعتیہ شاعری فنی، فکری، علمی، مذہبی ادبی، اور معنوی اعتبار سے ہر قسم کے عیوب سے پاک ہے۔ شاعری کے جملہ فنون پر حاوی ہے اور بعد والے تمام شاعروں کے لئے نمونۂ عمل اور قابل تقلید بھی ہے۔

فجزاہ اللہ خیر الجزاء۔

(نوٹ) حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کی تاریخ ولادت تاریخ طبع بہار دیوان، تاریخ طبع نعتیہ دیوان، تاریخ ماہانہ رسالہ اور ہفتہ اخبار کی طباعت، داغ دہلوی کی شاگردی اور تاریخ وفات کے لئے "خمخانۂ جاوید" (از سری لالہ رام) جلد دوم اور "چند شعرائے بریلی" دونوں کتابوں کے حوالہ جات پیش نظر رہے ہیں۔ بحوالہ اعلیٰ حضرت بریلی شمارہ دسمبر ۱۹۹۱ء۔

---

(۱) مضمون نگار کا یہ کہنا "بہت سی باتیں اس ضمن میں تحقیق طلب ہیں"۔ راقم السطور نے جب قدیم اور جدید نسخہ کا تقابل کیا تو یہ بات بالکل صاف ہوگئی کہ مولانا حسن رضا قدس سرہٗ کی تصنیف "آئینۂ قیامت" میں کچھ اشعار کسی شاعر ... کے شامل کر دئے گئے ہیں یہ حرکت ناشر کی طرف سے ہوئی، پہلی بار کتاب جماعت رضائے مصطفےٰ کے زیر اہتمام حسنی پریس بریلی سے مولانا حسنین رضا خاں بریلوی کی تصحیح سے شائع ہوئی۔ دوبارہ بریلی کے مشہور میلاد خواں صوفی عزیز صاحب نے شائع کی، تیسری بار قومی کتب خانہ بریلی نے شائع کی۔ پہلا اور تیسرا ایڈیشن راقم السطور کے پیش نظر ہے تیسرے ایڈیشن میں کسی دوسرے کے اشعار سامنے آئے جس سے بڑی حیرت ہوئی، فوراً ہی جاکر منیجر قومی کتب خانہ بڑا بازار سے دریافت کیا تو انھوں نے دوسرا ایڈیشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ

ماسں میں ایسی بات ہے اس لئے ہم نے کوئی کمی و بیشی نہیں کی ہے صرف اس کا عکس کرا لیا ہے۔ تیسرے ایڈیشن میں سرورق پر مصنف کی طرف سے ایک نوٹ بھی لگا ہوا ہے جبکہ یہ نوٹ پہلے ایڈیشن میں نہیں ہے۔

(محمد شہاب الدین رضوی اختری)

(بقیہ ص ۱۵۶)

دونوں عالم کی نعمتیں پاتے
مرتضٰے بہر مصطفٰے یارب

علم و عمر و عمل فراخ معاش
مجتبٰے کو بھی کر عطا یارب

کر دے فضل و نعم سے مالا مال
غم الم سے انہیں بچا یارب

میری ماں میری بہنیں بھانجے سب
پائیں آرام دوسرا یارب

اور جتنے بھی پیارے ہیں.....!
حاجتیں سب کی ہوں روا یارب

میرے احباب پر بھی فضل رہے
تیرا تیرے حبیب کا یارب

۳ شوال ۱۳۲۶ھ / ۱۹۰۸ء کو علم و عمل اور فکر و فن کے پیکر استاد زمن حضرت حسن رضا بریلوی قدس سرہ العزیز اپنے اہل خانہ کو روتا بلکتا چھوڑ کر اپنے رب اعلیٰ سے جا ملے اور بریلی سٹی اسٹیشن سے متصل قبرستان میں مدفون ہوئے اعلیٰ حضرت نے تاریخ وصال پر مندرجہ ذیل اشعار استخراج فرمایا ہے۔

نعتِ حسن آمدہ نعتِ حسن ؞ حسن رضا باد بزیں سلام
۱۳۲۶ھ

ان من الذوق لسحرھم ؞ ان من الشعر لحکمۃ تمام
۱۳۲۶ھ ؞ ۱۳۲۶ھ

کلک رضا داد چناں سال آں ؞ یافت قبول از شہ راس الانام
۱۳۲۶ھ

مولانا حسن اور ذکر شہادت

حضرت استاد زمن کی شاعری ایک عظیم شاعری ہے جو اللہ و رسول (جل جلالہ و صلی اللہ علیہ وسلم) کی محبت میں ڈوبی ہوئی ہے۔ حسرت موہانی جیسے شاعروں نے بھی جن کی تعریف کی ہے ان کی نعت و منقبت سب شریعت مطہرہ کے حدود کے اندر رہتے ہوئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم و اہل بیت اطہار رضوان اللہ تعالےٰ علیہم کا ایسا عشق و محبت عطا فرماتا ہے جس کا جواب نہیں۔

محرم شریف کے بارے میں جتنی بھی ادھر ادھر کی کتابیں ہیں ان کے اشعار میں جزع فزع ضرور ملتا ہے جو کہ شریعت اسلامی کے اصول کے سراسر خلاف ہے لیکن کتنی تعریف کی جائے حضرت استاد زمن کی کہ شہادت عظمیٰ کے بارے میں آپ نے "آئینہ شہادت" میں جو اشعار قلم بند کئے ہیں اس سے عظمت اہلبیت جسم و جان میں سرایت کر جاتے ہیں اور عشق و محبت میں آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے ہیں۔

۱۹۵۶ء کی بات ہے کربابو پوردہ کانپور میں محرم شریف کے موقع پر مرثیہ خوانی کا ایک بہت بڑا انعامی مقابلہ ہوا شیعہ حضرات نے بھی اس میں حصہ لیا انعام کا فیصلہ کرنے کے لئے ایک شیعہ عالم مقرر کیا گیا کرنیل گنج کانپور کا ایک لڑکا محمد ہارون حشمتی جو ایک کامیاب نعت خواں تھا۔ اس نے بھی اس مقابلہ میں اپنا نام لکھایا ۲۵ نمبروں کے بعد محمد ہارون کا نام پکارا گیا اور اس نے استاد زمن کا

"باغ جنت کے ہیں بہر مدح خوان اہلبیت"
"تم کو مژدہ نار کا اے دشمنان اہلبیت"

پڑھا الحمد للہ بڑے بڑے پڑھنے والوں میں ہارون کا نمبر اول رہا۔ یہ ہے مولانا حسن بریلوی کے شاعرانہ کمال کا ایک ادنیٰ سا واقعہ۔

از: ڈاکٹر شیر زماں مصطفوی اسماعیل پور الہ آباد

ذکر حسن بریلوی اور اصحاب فکر و نظر

مولانا اقبال احمد قادری اختری ــــــ ادارہ تحقیقات امام احمد رضا کراچی

حضرت استاذ زمن مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی قدس سرہٗ ۲۲ ربیع الاول ۱۲۷۶ھ یکم اکتوبر ۱۸۵۹ء میں ہندوستان کے شہر علم وفن بریلی شریف میں پیدا ہوئے، آپ کے والد ماجد حضرت علامہ مولانا نقی علی خاں بریلوی اور برادر اکبر حضرت امام احمد رضا خاں محدث بریلوی قدس سرہم وقت کے جلیل القدر عالم عارف کامل اور صاحب تصنیف کثیرہ تھے۔
آپ کا خاندان علم و فضل اور زہد و تقویٰ کی دولت سے مالا مال تھا۔ آپ کے خاندان کو شعر و ادب خصوصاً نعت گوئی سے فطری تعلق تھا۔ حضرت حسن بریلوی کو بھی شعر و شاعری کا شوق ابتدائی عمر ہی سے تھا۔
آپ نے خاندانی روایات کے مطابق سب سے پہلے علوم دینیہ کی جانب توجہ دی۔ اور والد ماجد حضرت علامہ نقی علی خاں بریلوی اور برادر اکبر حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی قدس سرہم سے علوم دینیہ کی تکمیل کی۔ شاعری کا شوق تو تھا ہی، جب سن شعور کو پہنچے تو فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی شاگردی میں رہ کر اس ذوق کی تکمیل کی۔ شروع شروع میں آپ نے غزل، مثنوی، رباعی، تاریخ، قصائد و مناقب غرض ہر صنف میں طبع آزمائی کی۔ غزل گوئی میں آپ نے مرزا داغ دہلوی کی صحبت سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور بہت جلد اس میں اپنا ایک مقام پیدا کر لیا۔ آپ کے استاد داغ دہلوی کو آپ سے خاص انس تھا۔ وہ پیار میں آپ کو "پیارے شاگرد" کہہ کر پکارتے تھے۔ چنانچہ حسن بریلوی ایک جگہ خود فرماتے ہیں۔ ؎

پیارے شاگرد تھا لقب اپنا
کس سے اس پیار کا مزا کہئے؟

غزلوں پر مشتمل آپ کا دیوان "ثمر فصاحت"، ۱۹۰۱ء میں مطبع اہلسنت بریلی سے شائع ہوا۔
جس زمانے میں حضرت حسن بریلوی نے شاعری قدم رکھا اس زمانے میں ہر دلعزیز اور مقبول صنف شاعری "غزل"، اوج ثریا پر تھی۔ چنانچہ حضرت حسن بریلوی نے زمانے کی مروجہ روش کے مطابق شاعری کی ابتدا غزل ہی سے کی، پھر اپنے برادر گرامی قدر کی صحبت کے فیض سے نعت گوئی کی جانب مائل ہوئے، گویا بارگاہ رسالت سے لطف و کرم کے سائل ہوگئے۔ ؎

کھیل بگڑا، ناؤ ٹوٹی، میں چلا
اے مرے والی بچا، فریاد ہے!

حضرت امام احمد رضا نے جب حضرت حسن بریلوی کی صدا سنی تو یوں تسلی دی۔ ؎

فریاد امتی جو کرے حال زار میں
ممکن نہیں کہ خیر البشر کو خبر نہ ہو

پھر ۱۳۲۵ھ میں بلاوا آگیا اور آپ اپنے عیال کے ساتھ حج بیت اللہ شریف اور زیارت در حبیب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے مشرف ہوئے۔ لوٹے تو دنیا بدل چکی تھی۔ صرف مدینہ اور تاجدار مدینہ کے ہو کر رہ گئے۔ یاد مدینہ — حسرت مدینہ اور رفعت و شان مدینہ کو حضرت حسن بریلوی اپنے دل کی زبان سے یوں بیان کرتے ہیں۔ ؎

عجب رنگ پر ہے بہار مدینہ
کہ سب جنتیں ہیں نثار مدینہ

رگ گل کی جب نازکی دیکھتا ہوں
مجھے یاد آتے ہیں خار مدینہ

رہیں ان کے جلوے بسیں ان کے جلوے
مرا دل بنے گا یادگار مدینہ
جدھر دیکھئے ، باغ جنت کھلا ہے
نظر میں ہیں نقش و نگار مدینہ
شرف جن سے حاصل ہوا انبیاء کو
وہی ہیں حسن افتخار مدینہ

حضرت حسن بریلوی کا شمار نعت گو شعراء کے علاوہ اپنے وقت کے معروف علمائے دین میں بھی ہوتا ہے۔ آپ نے تبلیغ دین کا فریضہ بھی انجام دیا اور باطل فرقوں کے خلاف نظم و نثر میں بہت کچھ تحریر کیا۔ آپ کی تصانیف تقریباً گیارہ تک پہونچتی ہیں۔ آپ کے دامن سے وابستہ رہنے والے درج ذیل شعراء کافی مشہور ہیں۔

حکیم سید برکت علی نامی ـــــ منشی دوارکا پرشاد علم بریلوی
حافظ دہاج احمد محشر ـــــ سید محمود علی عاشق
منشی ہدایت یار خاں نفیس ـــــ منشی اختر حسین اختر
محمد حسین آثر بدایونی ـــــ حکیم سید مسعود غوث فیض
منشی مظہر حسین مظہر ـــــ منشی الحاج احمد قیصر مرادآبادی وغیرہم

حضرت حسن بریلوی بڑے زمیندار تھے۔ معاشی طور پر فارغ البال تھے۔ آپ نہایت ذہین و ذکی تھے۔ طبیعت میں شوخی، شگفتگی اور زندہ دلی کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ آپ کا خاندان تو علم و فضل تقویٰ، پرہیزگاری، حریت پسندی اور ولائے رسول مقبول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں مقبول تھا ہی۔ آپ کے بڑے بھائی امام وقت حضرت امام احمد رضا محدث بریلوی بہت بڑے عاشق رسول اور زمانے کے مجدد تھے۔ آپ بھی خدا پرستی اور سرکار مدینہ سے عشق و محبت و اتباع رسول میں مشہور ہیں۔ چنانچہ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی کے تلمیذ مولانا منور حسین سیف الاسلام ایک جگہ بیان کرتے ہیں۔

حضرت حسن بریلوی کا ہمیشہ سے یہ مبارک دستور تھا کہ مسجد کے سامنے ایک بڑا مضبوط لکڑی کا موٹا تختہ چار لوہے کے پایوں پر رکھا ہوا تھا یہ عام سڑک تھی، اس پر حسن بریلوی تشریف رکھتے تھے۔ جب کسی مسافر یا راہ گیر کو غریب یا مجبور سمجھتے تو اس کا حال دریافت کرتے اس کی امداد فرماتے۔ غریبوں اور بیواؤں سے کرایہ وصول نہ فرماتے تھے۔ نماز ایسے خلوص سے پڑھتے کہ اکثر اوقات ریش مبارک آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔ جب مسجد سے تمام نمازی چلے جاتے تو آپ بعد میں مسجد سے باہر نکلتے۔ اگر کوئی مسافر نظر آتا تو اسے اپنی بڑی بیٹھک میں نہایت آرام سے جگہ دیتے بیٹھک میں اچھے خاصے پلنگ بستروں سمیت اور بیٹھنے کے لئے مونڈھے بھی رکھے ہوئے تھے۔ نماز اشراق، چاشت اور تہجد کے پابند تھے۔ یہ خاندان مہمان نوازی اور فیاضی میں بھی مشہور تھا۔ حسن بریلوی مہمان کی خاطر و مدارت میں بھی کوئی کسر نہیں اٹھا رکھتے تھے۔ مہمان جب ہوتا تو اپنی طرف سے کچھ نقدی بھی اسے پیش کرتے تھے۔ کہ اس رقم کی اپنے چھوٹے بچوں کے لئے کوئی چیز لیتے جانا۔

اس خاندان کی مہمان نوازی آج بھی اسی طرح قائم و دائم ہے کہ ابھی گزشتہ دنوں حضرت صاحبزادہ مولانا وجاہت رسول قادری مدظلہ (صدر ادارۂ تحقیقات امام احمد رضا کراچی) ایک سیمنار میں شرکت کی غرض سے بھارت کے شہر لکھنؤ گئے۔ وہاں حضرت حسن رضا بریلوی کے بھائی حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی کے نبیرہ، شیخ الاسلام فقیہ اعظم تاج الشریعہ حضرت علامہ مفتی محمد اختر رضا خاں الازہری مدظلہ (سجادہ نشین آستانۂ امام احمد رضا) اپنے ساتھ بریلی شریف لے گئے۔ اپنے دولتکدہ پر ٹھہرایا اور خوب مہمان نوازی کی، پھر رخصت پر تقریباً ۳۰ نادر و نایاب کتب کے مسودات (عکسی) تحفۃً عنایت فرمائے۔

حضرت حسن بریلوی فن تاریخ گوئی میں بھی کمال رکھتے تھے کئی بزرگوں کے مادہ ہائے تاریخ وفات برجستہ نکالے چنانچہ جب آپ کے استاد مرزا داغ دہلوی کا انتقال ہوا تو تاریخ وفات کہی جس کا مطلع و مقطع درج ذیل ہے۔

گئے جنت کو حضرت استاد ۔ غم فرقت کا حال کیا کہتے
مرگ استاد کی حسن تاریخ ۔ داغ نواب مرزا کہتے

۱۳۲۲ھ

مشہور نعت گو شاعر حضرت محسن کاکوروی کی "مثنوی شفاعت و نجات" کی تاریخ یوں کہی ۔

حسن اپنے محسن کی ہو کچھ ثنا ۔ جو احسان حسن طبیعت کا ہو
شفاعت کا لکھا ہے احوال خوب ۔ بیاں کیونکر اس کی فصاحت کا ہو
دعائیہ تاریخ میں نے کہی ۔ یہ اچھا ذریعہ شفاعت کا ہو

اپنی کتاب "نگارستان لطافت" کی تاریخ طباعت اس طرح کہی ۔

یہ چند ورق نعت کے لائق ہے غلام
انعام کچھ اس کا مجھے اے بحر سخا دو
میں کیا کہوں میری ہے یہ حسرت یہ تمنا
میں کیا کہوں مجھ کو یہ صلا دو صلا دو
تم آپ میرے دل کی مرادوں سے ہو واقف
خیرات کچھ اپنی مجھے اے بحر عطا دو
ہیں یہ سن تالیف فقیر از صدا میں !
والی میں تصدق مجھے مدحت کی جزا دو

۱۳۵۲ھ

قطب زماں حضرت شاہ آل رسول مارہروی قدس سرہٗ کی تاریخ وفات کہی جس کا مطلع و مقطع یہ ہے ۔

اچھے کے پیارے میرے سہارے
باہر ہیں بیاں سے ان کے مناقب
میں نے کہی یہ تاریخ رحلت
قطب المشائخ اصل مطالب

۱۲۹۶ ہجری

حضرت حسن بریلوی کو صحافت سے بھی دلچسپی تھی ۔ ان کا ذاتی پریس تھا ۔ ان کی نگرانی میں "ماہنامہ بہار بے خزاں" اور ہفت روزہ "روز افزوں" شائع ہوتے تھے ۔ آپ کے پریس کا نام مطبع اہل سنت تھا ۔

آپ نے ۳ ۲ شوال المکرم ۱۳۲۶ھ / ۹ - ۱۹۰۸ء میں وصال فرمایا اور بریلی شریف کے سٹی قبرستان میں مدفون ہوئے

حضرت حسن بریلوی کو ممتاز اہل علم و دانشور اور شعراء کرام نے خراج تحسین پیش کیا ہے ۔ جس کا ہم مقالہ کے آخر میں ذکر کریں گے ۔ حضرت حسن بریلوی پر کئی حضرات نے لکھا ہے مگر کوئی خاطر خواہ کام نہ ہو سکا ۔ ضرورت تھی کہ حضرت حسن رضا بریلوی پر کوئی فاضل تحقیقی کام شروع کرے تاکہ حضرت حسن بریلوی کی شخصیت نکھر کر سامنے آسکے ۔ چنانچہ اس سلسلے میں حال ہی میں ایک اہم پیش رفت ہوئی ہے ۔ جس کا انکشاف پروفیسر وسیم بریلوی (صدر شعبۂ اردو ، روہیلکھنڈ یونیورسٹی ، بریلی) نے اپنے حالیہ دورۂ پاکستان کے موقع پر ایک ملاقات میں کیا ، کہ حضرت حسن رضا بریلوی پر روہیلکھنڈ یونیورسٹی ، بریلی سے پروفیسر موصوف کی نگرانی میں ایک فاضلہ درج ذیل عنوان پر ڈاکٹریٹ (Ph. D) کر رہی ہیں ، ۱۹۹۲ء کے شروع میں ان کا رجسٹریشن بھی ہو گیا ہے ۔

مولانا حسن رضا بریلوی اور ان کی شاعری

بھارت کے ایک فاضل اسعد بدایونی نے ۱۹۸۵ء میں مسلم یونیورسٹی علیگڈھ سے "داغ دہلوی کے اہم تلامذہ" کے عنوان پر مقالہ لکھ کر ایم ۔ فل کی ڈگری حاصل کی ۔ اس میں موصوف مقالہ نگار نے داغ دہلوی کے گیارہ اہم تلامذہ کا ذکر کیا ہے اور ان کے کلام کے نمونے بھی پیش کئے ہیں ۔ اس میں حضرت حسن رضا بریلوی کا ترتیب کے حساب سے تیسرے باب میں بھرپور تذکرہ ہے ۔

۱۹۸۷ء میں لاہور کی "مجلس سخن" کے زیر اہتمام حضرت حسن بریلوی کی یاد میں لاہور انٹرنیشنل ہوٹل میں ایک کانفرنس بعنوان "تذکار نعت گستر" منعقد ہوئی ۔ جس میں حضرت حسن بریلوی کے فکر و فن پر مضامین و مقالہ پڑھے گئے ۔ اور بعض مشہور نعت خواں حضرات نے ان کا نعتیہ کلام سنایا اس کانفرنس میں پڑھے گئے مضامین کو "ماہنامہ نعت" لاہور

نے اپنے خصوصی نمبر "حسن رضا بریلوی کی نعت"، شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء میں بہت شاندار طریقہ سے شائع کیا ہے۔ اس میں درج ذیل عنوانات ہیں۔

۱۔ نعت حسن پر ایک طائرانہ نظر ___ از، حزیں کاشمیری
۲۔ "ذوق نعت"، کا شاعر ___ از، اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی
۳۔ حسن رضا بریلوی کی نعت گوئی ___ از، پروفیسر ڈاکٹر سید اختر جعفری
۴۔ حضرت حسن بریلوی اور ان کی شاعری ___ از، قسیم الدین احمد
۵۔ محبت کا شاعر ___ از، راجا رشید محمود
۶۔ نعت حسن کے چند متفرق اشعار ___

کراچی کے ایک پبلشنگ ادارے "مدینہ پبلشنگ کمپنی" نے آپ کے نعتیہ دیوان "ذوق نعت" کو حضرت علامہ شمس بریلوی مدظلہ کے مقالہ "ذوق نعت پر ناقدانہ نظر" کے ساتھ شائع کیا ہے۔

ایک ہندو فاضل لالہ سری رام نے اپنی کتاب "خمخانہ جاوید" میں حضرت حسن بریلوی کا بھرپور اور بہتر انداز میں تذکرہ کیا ہے۔

پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتحپوری (چیف ایڈیٹر اردو ڈکشنری بورڈ پاکستان) نے اپنی کتاب "اردو کی نعتیہ شاعری" میں پروفیسر ڈاکٹر نفیس سندیلوی نے رسالہ "نگار" کے "داغ نمبر"، میں مولانا حسرت موہانی نے اپنی تصنیف "نکات سخن" میں اور اصغر حسین خاں نظیر لودھیانوی نے اپنی کتاب "شعر حسن"، میں حضرت حسن بریلوی کو زبردست خراج تحسین پیش کیا ہے اور ان کے کلام کی خصوصیات پر روشنی ڈالی ہے۔

تاثرات نواب مرزا داغ دہلوی

حضرت حسن بریلوی نے ایک مرتبہ نواب مرزا داغ دہلوی کو اپنے بھائی حضرت امام احمد رضا بریلوی کی نعت شریف کا یہ مطلع سنایا۔ ے

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں ترے دن اے بہار پھرتے ہیں

تو داغ دہلوی نے بہت تعریف کی اور اظہار حیرت بھی کیا۔ وہ حضرت حسن بریلوی کی بھی تعریف کرتے تھے اور یہاں تک کہا ہے کہ

"اگر میں نعتیہ شاعری کرتا تو حسن کو اپنا استاد بناتا۔"

وہ ان کی بہاریہ شاعری کے بھی مداح تھے۔ (ماہنامہ فاران کراچی، شمارہ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۴۴/ ماہنامہ اعلیٰ حضرت بریلی شمارہ دسمبر ۱۹۹۱ء ص ۵-۴۴)

۲ ___ ماہر القادری ___

"مولانا احمد رضا خاں کے چھوٹے بھائی مولانا حسن رضا بڑے خوش گو شاعر تھے۔

(ماہنامہ فاران کراچی شمارہ ستمبر ۱۹۷۰ء ص ۵-۴۴)

۳۔ راجا رشید محمود: ایڈیٹر ماہنامہ نعت لاہور ___

"حضرت حسن رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ مشہور عالم دین اور بہت بڑے شاعر تھے۔ وہ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے چھوٹے بھائی اور داغ دہلوی کے چہیتے شاگرد تھے۔ حسن رضا خاں بریلوی رحمۃ اللہ علیہ مالک و مختار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے ایک جلیل القدر مدحت نگار ہیں۔ وہ ڈوب کر نعت کہتے ہیں۔ ان کے قلب و ذہن پر صاحب اختیار سید والا تبار صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت نقش ہے۔ حسن رضا بریلوی بڑے پکے اور سچے مومن ہیں۔ اور الفت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کے گیت دل کے ساز پر گاتے رہتے ہیں۔ ے

موت آجائے مگر آئے نہ دل کو آرام
دم نکل جائے مگر نکلے نہ الفت تیری"

(ماہنامہ نعت لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء ص ۱-۳۹-۳۸)

۴ ___ حزیں کاشمیری

"موصوف (حسن بریلوی) زبان و بیان کی ان تمام باریکیوں سے کما حقہ واقف ہیں جو کسی بھی بڑے فنکار کے لئے ضروری ہیں۔ آپ کی نعت حشو و زوائد سے پاک ہے۔ تنافر جلی و خفی نام کو بھی نہیں۔ قافیہ و ردیف کے جملہ رموز سے آگاہ ہیں۔ الفاظ کا در و بست مصرعوں کی سادگی اور چستی کے ساتھ ان کے کمال فن کا پتہ دیتا ہے۔ نہ کہیں جھول نہ ضعفِ خاتمہ سلاست زبان و ندرت ادا کے عناصر پر کہیں دور گہرائیوں میں چھپے ہوتے جذبات میں گھل مل کر عجب سماں باندھ رہے ہیں۔ جیسے ایک نعت کا یہ مطلع ؎

صبح سعادت نے گریباں سے نکالا
ظلمت کو ملا عالم امکاں سے نکالا

(ماہنامہ نعت لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء، ص ۷-۶)

۵۔ پروفیسر ڈاکٹر سید اختر جعفری

آپ نے نعت گوئی میں علم بیان اور صنائع بدائع کے استعمال کا التزام کیا ہے۔ آپ کی نعت میں صنعت تجنیس، صنعت اشتقاق، صنعت تلمیح، صنعت تضاد اور صنعت مراعاۃ النظیر کا خوب صورت استعمال ملتا ہے۔ جس نے آپ کے کلام کو چار چاند لگا دیے ہیں۔ صنعت تجنیس تام کی مثال ملاحظہ ہو۔ ؎

آتا ہے فقیروں پہ انہیں پیار کچھ ایسا
خود بھیک دیں اور خود کہیں منگتا کا بھلا ہو
دے ڈالیے اپنے لب جاں بخش کا صدقہ
اے چارۂ دل، دردِ حسن کی بھی دوا ہو

(ماہنامہ نعت لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء ص ۲۸)

۶۔ علامہ شمس الحسن شمس بریلوی

سابق صدر، شعبۂ فارسی، دار العلوم منظر اسلام بریلی

حسن مرحوم نے جس ماحول میں آنکھ کھولی تھی۔ وہاں کی فضا میں عشق رسول اور محبت نبی (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) کے ایمان پرور نغمات رچے بسے تھے۔ جس برادر گرامی کی صحبت ان کو نصیب ہوئی وہ رسول مکرم کے ایسے گدائے غاشیہ بردوش تھے کہ کیا مجال ہے کہ سوئے ادب تو معاذ اللہ بڑی بات ہے۔ شان رسالت کے غیر شایان کلمات کی ادائیگی کس کی مجال تھی کہ ان کے حضور میں کر سکے۔ وہ عظیم ہستی جس کے ورد زبان ہمیشہ یہ رہا۔ ؎

فرش والے تیری شوکت کا علو کیا جانیں
خسروا عرش پہ اڑتا ہے پھریرا تیرا

اس عظیم ہستی نے آداب نعت سے جناب حسن کو واقف کیا اور محبت رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم میں شائستگی گفتار کے انداز سکھلائے۔ ظاہر ہے اس استاد کی صحبت میں جس کی زبان کی دھوم تمام ہندوستان میں تھی جناب حسن کبھی ان آداب کو نہ بھولے۔ زبان کی لذت کے ساتھ شائستگی گفتار اور انداز بیان ملاحظہ فرمایئے۔ ؎

جلوۂ یار ادھر بھی کوئی پھیرا تیرا
حسرتیں آٹھ پہر تکتی ہیں رستا تیرا

وہ جس کی نظر میں صحرائے مدینہ کا یہ احترام ہو کہ ؎

خارِ صحرائے نبی پاؤں سے کیا کام تجھے
آمری جان مرے دل میں ہے رستا تیرا

وہ عالم دیوانگی میں بھی ان حدود سے باہر قدم نہیں رکھ سکتا۔
(ذوق نعت پر ناقدانہ نظر، مطبوعہ کراچی، ص ۱۱-۱۰)

۷۔ پروفیسر ڈاکٹر فرمان فتحپوری

چیف ایڈیٹر، اردو ڈکشنری بورڈ، کراچی پاکستان

مولانا احمد رضا کے چھوٹے بھائی حسن رضا بھی صاحب دیوان شاعر ہیں۔ حسن رضا کا رنگِ سخن بھی قریباً وہی ہے جو ان کے بڑے بھائی کا ہے۔ دونوں بھائیوں کی نعتوں میں جو چیز خاص طور پر متاثر کرتی ہے وہ سادگی و صفائی بیان کے ساتھ ساتھ ان کے جذبات عشقیہ کی وہ شدت ہے جو سید عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم سے ان کے والہانہ لگاؤ کا ثبوت ہر قدم پر مہیا کرتی ہے۔
(اردو کی نعتیہ شاعری، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۴ء)

۸۔ پروفیسر ڈاکٹر نفیس، سندیلوی

حاجی مولانا حسن رضا خاں کو شعر و سخن کا طبعی اور فطری ذوق تھا۔ غیر معمولی ذہانت و ذکاوت کے مالک تھے۔ مزاج میں شوخی اور شگفتگی اور زندہ دلی تھی۔ حضرت داغ کے ارشد تلامذہ میں شمار تھا۔ نعتیہ کلام میں ان کا دیوان "ذوق نعت" یادگار ہے۔

(ماہنامہ نعت لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء ص ۲-۳۲)

۹۔ حکیم محمد موسیٰ امرتسری

بانی: مرکزی مجلس رضا۔ لاہور

مولانا حسن رضا نے اپنی استادانہ صلاحیتوں کو اپنے کلام میں خوب اجاگر کیا۔ امام احمد رضا کے کلام بلاغت مقام میں وہ سب کچھ موجود ہے، جو نعتیہ کلام میں ہونا چاہیے لیکن حسن رضا کا انداز بیان نعت گو حضرات میں وہی حیثیت رکھتا ہے جو داغ کا غزل گو شعراء میں۔

(ماہنامہ نعت لاہور، شمارہ جنوری ۱۹۹۰ء ص ۳۳)

۱۰۔ اصغر حسین خاں نظیر لدھیانوی

آپ کے کلام کی بڑی خوبی مضمون آفرینی ہے۔ حسن رضا کی نعتوں میں ندرت خیال بھی ہے۔ اور حقیقت آرائی بھی۔ حسن رضا ہر شعر میں موقع کی اہمیت اور نزاکت کے مطابق نہایت مناسب و موزوں الفاظ اور برمحل محاورات استعمال کرتے ہیں۔ تشبیہات نہایت لطیف اور عام فہم ہیں اس لئے ان کا کلام فصاحت اور بلاغت کا گنجینہ بن گیا ہے۔

(نظیر لدھیانوی، شعر حسن، مطبوعہ لاہور ۱۹۷۸ء)



اور دیگر ممتاز شعراء و اسکالرز کی ان آراء سے یہ حقیقت واضح طور پر عیاں ہے کہ آپ کا شمار اساتذۂ فن میں نمایاں ہے۔

ے حسن نعت و چنیں شیریں بیانی
تو خوش باشی کہ کردی وقت ما خوش

مرسلہ، جناب محترم صابر اکرام قادری اختری، ناظم نشریات
ادارہ معارف رضا رجسٹرڈ لاہور

بقیہ ص ۱۷۵

غماز ہیں۔ ان کے اشعار نہ گنجلک ہیں نہ پوشیدہ بلکہ سادہ اور معنی سے بھرپور ہیں۔

غزل گوئی و مرثیہ گوئی سے مشکل و دشوار نعت گوئی ہے اس کے حدود کی رعایت کی جاتی ہے۔ افراط و تفریط پر گہری نظر رکھی جاتی ہے۔ تھوڑی سی کمی اور زیادتی سے آدمی ادھر سے ادھر اور ایمان جیسی دولت سے تہہ دست ہو جاتا ہے۔ اس لئے شعراء نعت گوئی کے لئے آسان سے آسان ترین ردیف و قوافی پر ذہن و فکر کے جواہر پرتے ہیں۔ چند ہی شعراء ایسے ہیں جو سنگلاخ اور مشکل ردیف و قوافی پر نعتیہ اشعار کہے ہیں۔ لیکن استاد زمن تو مشکل و سنگلاخ زمینوں میں بھی ایسے نعتیہ اشعار کے گل کھلائے ہیں کہ ان کی نعتیہ شاعری پر وسیع مہارت اور استادانہ کمال جھلکتا ہے۔ پیش خدمت ہے اس سے متعلق دو شعر

پاتیں صحراء مدینہ تو گلستاں مل جاتے
ہند ہے ہم کو قفس ہم ہیں اسیران قفس
قافلے دیکھتے ہیں جب سوئے طیبہ جاتے
کیسی حسرت سے تڑپتے ہیں اسیران قفس

ان کی نعت و غزل کے کئی دیوان چھپ کر شائع ہو چکے ہیں۔ غرض کہ استاد زمن کے اشعار، فن شعر و سخن کے تمام خصوصیات و کمالات کے حامل ہیں۔ ان کو اگر استاد زمن کے بجائے استاد فن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔

مولانا اختر حسین فیضی —— جہانا گنج، اعظم گڑھ

تلمیذ داغ

حسن بریلوی کا رنگ تغزل

مولانا حسن رضا خاں حسن تخلص رکھتے تھے۔ سن شعور کو پہونچے تو فصیح الملک مرزا داغ دہلوی کی شاگردی سے اس ذوق کی تکمیل کی، اور زبان و محاورات پر قدرت حاصل کی۔ آپ نے حمد، نعت، غزل، مثنوی، رباعی، تاریخ، قصائد، منقبت غرض ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کی ہے۔ کلام کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ موصوف اپنے وقت کے استاذ فن تھے۔ بریلی کے کئی خوشگوار شعراء نے آپ کے دامن فیض سے تربیت پائی تھی۔ آپ پر دینی رنگ غالب تھا اس نے کئی دینی اور مذہبی تصنیفات بھی فرمائیں۔

ثمر فصاحت ایک جائزہ

حسن بریلوی کا دیوان غزلیات "ثمر فصاحت" کے تاریخی نام سے ۱۳۱۹ھ میں مطبع اہل سنت و جماعت بریلی سے شائع ہوا۔ یہ مجموعہ صداقت جذبات اور قلبی واردات کا مرقع، درد و کرب اور سوز و ساز کا منبع ہونے کے ساتھ ساتھ، رنگینی حیات اور حسن ادب کا امین و ضامن ہے۔ غزلیات حسن میں رفعت فکر، لطافت احساس، سلاست زبان اور ندرت بیان جیسی بہت ساری خصوصیات موجود ہیں۔ آپ کے کلام میں وہ تمام خوبیاں پائی جاتی ہیں جو داغ کے کلام کا طرۂ امتیاز ہیں۔ ذیل میں کلام کی خصوصیات پر فرداً فرداً روشنی ڈالی گئی ہے۔

شوخی داغ کے کلام کا بڑا عنصر شوخی اور بانکپن ہے۔ معشوق سے آزادانہ چھیڑ چھاڑ ان کا محبوب مشغلہ ہے۔ حسن بریلوی کے کلام میں بھی اپنے استاذ کی طرح شوخی اور تیزی کے نمونے ملتے ہیں۔

چڑھاؤ آستیں خنجر نکالو!
یہ چپکے چپکے مجھ کو کوسنا کیا
ستاؤ، دل دکھاؤ، مار ڈالو
نہ آئے گا کبھی روز جزا کیا

مرزا غالب کا ایک شعر ہے۔

کی مرے قتل کے بعد اس نے جفا سے توبہ
ہائے اس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حسن بریلوی کہتے ہیں۔

جی میں شرمندہ ہوا کاٹ کے سر عاشق کا
ہائے جلاد کو کس وقت ندامت آئی

ایک جگہ اور فرماتے ہیں۔

جلوے کی روک تھام کرے گا حجاب کیا
دریا کے آگے آب رواں کا نقاب ہے

عہد ماضی میں "آب رواں" ایک بہت باریک کپڑا تھا۔
موصوف اور فرماتے ہیں۔

ہزار ولولے اٹھیں دل میں چھپائے کس طرح کوئی
مری جاں تم سے اک جوبن کا پردہ ہو نہیں سکتا

بلائیں غیر کو میں جاؤں تو وہ فرمائیں
مری گلی سے، مرے در سے، مرے مکاں سے دور

لڑنے بگڑنے کا تو مزا ہے وصال میں
اس روٹھنے کا کون کرے اعتبار آج

استاذ حسن مرزا داغ دہلوی کا ایک شعر ہے۔ ؎

ایک پہلو ہی میں بس داغ بہک اٹھتے ہیں
آج سیدھے ہیں نکالے گئے میخانے سے

حسن بریلوی فرماتے ہیں۔ ؎

گر یہی ہے شور فریاد و فغاں
تو نکالے جائیں گے محشر سے ہم

سوال بوسہ پہ منہ پھیر کر جواب دیا
کہ ایسے ویسے مرے دشمنوں سے پیار کریں

جب کہا ان سے کہ مرتے ہیں مریضان فراق
بولے منہ پھیر کر ہم کیا کریں قسمت اُن کی

طنز

حسن بریلوی کے کلام میں اُن کے استاذ مرزا داغ دہلوی کی طرح طنز لطیف، حاضر جوابی اور محبوب سے شکوہ شکایت کی صدہا مثالیں موجود ہیں۔ طنز کی مثالیں پیش خدمت ہیں۔

آپ کہتے ہیں کہ جاؤ دیکھ لیا دل تیرا
کہئے تو اپنے سوا دل میں مرے کیا دیکھا

یہ رات کون تھا دشمن کے گھر کہو تو سہی
مجھے تو کہتے ہو بے شرم، بے حیا، گستاخ

سو کی سو اچھی اگر سو خواہشیں ہوں غیر کی
میری لاکھوں حسرتوں میں ایک بھی اچھی نہیں

لوگ کہتے ہیں عدو سے دوستی اچھی نہیں
کیا یہ عادت آپ کے نزدیک بھی اچھی نہیں

معاملہ بندی

کہا جاتا ہے کہ معاملہ بندی کی ابتدا شیخ قلندر بخش جرأت نے کی۔ یہ شیخ مصحفی کے کلام میں صدہا اشعار ایسے ہیں جو معاملہ بندی کے ضمن میں آتے ہیں۔ لیکن داغ اس فن کے بادشاہ ہیں۔ کس انداز سے کہتے ہیں۔ ؎

حیا بولی ابھرا جو جوبن کسی کا
مٹا دوں گی میں چلبلا پن کسی کا

حسن بریلوی نے بھی اس ضمن میں استاد کی پوری تقلید کی ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

کہا یہ ضبط نے جوبن جواں کا جوش میں آیا
خبردار اے حیا اب ہم سے پردہ ہو نہیں سکتا
اگر جلوہ دکھانا ہے تو سینے سے بھی مل جاؤ
کہ دل آنکھوں کی ٹھنڈک سے تو ٹھنڈا ہو نہیں سکتا

بتوں کے نرم و نازک جسم میں کیا گدگدا پن ہے
مگر ان موم کے پتلوں کے دل پتھر نکلتے ہیں

مرزا داغ نے کہا تھا۔ ؎

اب حکم ہوا ہے کہ تمھیں قتل کریں گے
پر یہ بھی ہے تاکید کہ کہنا نہ کسی سے

حسن بریلوی کہتے ہیں۔ ؎

تم چپکے سے اک بوسہ عارض ہمیں دیدو
کہتے ہیں قسم کھا کے کہیں گے نہ کسی سے

بوسہ

بوسہ دراصل معاملہ بندی ہی کا ایک جزو ہے مگر اس کے بعض زیادہ دلفریب پہلو بھی ہیں۔

مرزا غالب نے بہت سوچ سمجھ کر کہا تھا۔ ؎

بوسہ نہیں نہ دیجئے دشنام ہی سہی
آخر زباں تو رکھتے ہو تم گر دہاں نہیں

مگر مرزا داغ کے یہاں تو بات بات پر بوسے کی طلب ہے۔ فرماتے ہیں ؎

بے گنتی بوسے لیں گے رخ تابدار کے
عاشق پڑھے ہوئے نہیں علم حساب کو

حسن بریلوی نے بھی اس بات میں استاد کی خوب پیروی کی ہے۔ چند مثالیں حاضر نظر ہیں۔ ؎

بولے وہ بوسہ ہائے پیہم ۔۔۔ پر
ارے کم بخت کچھ حساب بھی ہے

لیا میں نے بوسہ تو روٹھو نہ مجھ سے
خطا ہو ہی جاتی ہے بندہ بشر ہے

دل کے بدلے میں نہ دو بوسہ رخِ بیباک ہی دو
نہیں عاشق نہ سہی جان تو سائل مجھ کو

وصل

وصل بھی معاملہ بندی ہی کی ایک کڑی ہے۔ حسن بریلوی بھی اس میدان میں کسی سے پیچھے نہیں۔ فرماتے ہیں۔ ؎

وہ دستِ شوق کی گستاخیاں وصال کی شب
وہ ان کا شرم سے کہنا دبی زباں سے دور

منہ پھیر کے بیٹھے ہو شبِ وصل
شوخی پہ مزاج ہے حیا کا

رد نہ فرمائیے سوالِ وصال
نام کی بات ہے ثواب ملے گا

عدو کے وصل کا انکار سچا ہی سہی لیکن
مسی چھوٹی ہوئی مسکی ہوئی انگیا تباکیوں ہے

وصل میں جب ہاتھ گھونگھٹ کو لگایا ہے حسن
شرم بولی مت چھپا کر یہ ہنسی اچھی نہیں

نازک خیالی اور ندرت خیالی

نازک خیالی اور ندرت خیالی کی مثالیں مرزا غالب کے کلام میں بھی ملتی ہیں۔ لیکن غالب میں مشکل پسندی کا زور بھی ہے۔ لوگوں نے اس باب میں مومن کو غالب پر ترجیح دی ہے۔ داغ بھی اس میدان کے ایک اچھے شہسوار ہیں۔ شوخی اور طنز نگاری کے باوجود ان کے کلام میں نازک خیالی اور ندرت خیالی بھی عروج پر ہے ایک غزل میں کہتے ہیں۔ ؎

آنکھیں بچھائیں ہم تو عدو کی راہ میں
پر کیا کریں کہ تم ہو ہماری نگاہ میں

حسن بریلوی نے بھی اس میدان میں طبع آزمائی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

کہتے ہیں رنجش بھی ہے تو خاص تیری ذات سے
وہ عداوت بھی جتاتے ہیں محبت کی طرح

پردے نے اٹھ کے پردۂ الفت اٹھا دیا
ہم بے خبر ہوئے وہ خبردار ہو گئے!

جب پیشِ حسن تنگ ہو وسعت جہان کی
پھر آئینے کے گھر میں ترا کیا جواب ہو

وائے تقدیر کہ تم اس کو حیا سمجھے ہو!
چٹکیوں میں جو ملا جائے مرا دل ہے وہی

خیال لکھنوی کا شعر ہے۔ ؎

روز کہتا ہوں اب نہ جاؤں گا اس کوچے میں
روز اس کوچے میں اک کام نکل آتا ہے

حسن بریلوی فرماتے ہیں۔ ؎

ہمیشہ کہہ کر آتے ہیں کہ اب ہرگز نہ آئیں گے
مگر یہ عہد یاد آتا ہے جا کر بزمِ جاناں میں

ایک اور غزل میں کہتے ہیں۔ ؎

وہ تو نظر اٹھا کے ادھر دیکھتا نہیں!
کیوں کر کہوں کہ درد مرا لا دوا نہیں!
گھل گھل کے جن کے ہجر میں ہم ہو گئے تمام
افسوس وہ کہے کہ میں پہچانتا نہیں

حسنِ بیان

زبان بامحاورہ، الفاظ مناسب اور بندش چست ہو تو شعر میں جان پڑ جاتی ہے اور سامع کا ذہن متاثر ہوتا ہے۔ فصیح و بلیغ کلام کی یہی نشانی ہے۔ حسن کے استاد فصیح الملک تھے، زبان اور محاورات کے بادشاہ تھے۔ حسن بریلوی کا کلام بھی فصاحت و بلاغت کے اعتبار سے اعلیٰ درجے کا حامل ہے۔ بلاغت سے شعر میں معنوی خوبیاں، موزوں اور مناسب الفاظ سے ظاہری حسن پیدا ہوتا ہے۔ موصوف کا کلام دونوں پہلوؤں سے دل کش اور لطف انگیز ہے۔ غالب نے کہا تھا۔

رنج سے خوگر ہوا انساں تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں اتنی پڑیں مجھ پر کہ آساں ہو گئیں

حسن بریلوی نے کہا ہے ؂

رحم آ ہی جائے گا ان کو دلِ بیمار پہ
درد بڑھتے بڑھتے آخر کو دوا ہو جائے گا

آپ نے "نقش پا" کا مضمون کئی اشعار میں باندھا ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں ؂

ہو گئے خاک نقش پا کی طرح
ان کے قدموں سے میں جدا ہو کر

آپ کے نقش قدم کو خاک سے کیوں ربط ہے
دل کا ٹکڑا کیوں نہ ہو آنکھوں کا تارا کیوں نہ ہو

کوئے اغیار کے رستے سے میں کب واقف تھا
رہبری آپ کی نقش کفِ پا کرتے ہیں

مندرجہ ذیل اشعار میں حسن بیان کا لطف دیکھیے۔ ؂

چمکتے گال ترے ان میں لطف رنگینی
یہ آئینے کے ہیں آئینے اور پھول کے پھول

ہمارا نخل تمنا بھی بید مجنوں ہے!
کہ پھل تو پھل نہ کبھی آئے اس میں بھولے سے پھول

چشم بد دور عجب آنکھ ہے ماشاء اللہ!
سجدے جھک جھک کے غزالانِ حرم کرتے ہیں

صنعت تواتر یا تقسیم

بعض فنی صنعتوں سے شاعر کے حسن بیان میں زیادہ دلکشی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ سب الفاظ ہی کے مناسب اور موزوں استعمال کا کرشمہ ہے۔ حسن بریلوی نے صنعتِ تواتر یا صنعتِ تقسیم کا بہت استعمال کیا ہے، اس طرح ان کے اشعار میں زیادہ زور اور لطف پیدا ہو گیا ہے۔

چند اشعار حاضر خدمت ہے۔

تبسم لب پہ، ڈھیلا ہاتھ، خنجر کند منہ پھیر کر
بڑی بے دردیوں سے کاٹتے ہو میری گردن کو

کیوں ہوں یہ رسوائیاں گر آپ ہرجائی نہ ہوں
خاک برسر، آہ برلب، دربدر کوئی نہ ہو

ابھی تو جاں بلب ہوں مردہ دل ہوں نیم بسمل ہوں... یا
ترے کشتوں میں شامل ہوں تو میں زندوں میں داخل ہوں

آئینہ طوطیوں میں چکوروں میں ماہتاب
گلشن میں پھول بزم میں ہے روئے یار شمع

محاورات

مناسب اور موزوں الفاظ سے اور محاورات کے برمحل استعمال سے زبان میں حسن زور اور مٹھاس پیدا ہوتی ہے۔ اور شعر دل آویز ہو جاتا ہے۔ استاذ ذوق کے بعد مرزا داغ کی زبان محاورے کی جان ہے۔ حسن بریلوی نے بھی محاورات کا برمحل استعمال کر کے اپنے اشعار کے حسن میں اضافہ کیا ہے۔ چند مثالیں حاضر خدمت ہیں۔ بعض سے اشعار میں دو، دو، تین، تین محاورات ہیں۔ ؂

جگر کا درد وہ کچھ بے قراری دل کی ایسی کچھ
اگر اب بھی نہ پوچھا کس مرض کی پھر دوا تم ہو

ہو کر غبار ان کی گلی میں اڑا کروں
مٹی میں مل کے کیوں مری مٹی خراب ہو

آہیں لب پر آرزوئیں دل میں یوں اس در پہ ہم
بیٹھے ہیں دھونی رمائے، چھاؤنی چھائے ہو

لیا بوسہ لڑ بھڑ کر بلا سے جان دی دل نے
ہم اس کام آنے کو کام آ جانا سمجھتے ہیں

ہزاروں باتیں سننے پر نہ نکلی آدھی بات اس سے
لب خاموش کو ہم بات کا پورا سمجھتے ہیں

رعایات لفظی

استاد ذوق کے بعد لفظی رعایت میں مرزا داغ کا پایہ بہت بلند ہے۔ ایسی رعایات لفظی شعر کے لئے مناسب نہیں جسے "ضلع جگت" کہتے ہیں۔ بعض لکھنوی شعراء نے عمر بھر "ضلع جگت" کے سوا کچھ نہ لکھا، ان میں امانت لکھنوی پیش پیش ہیں۔ لفظی رعایتیں ایسی ہونی چاہیے جن سے شعر میں لطف پیدا ہو۔ ایسی رعایات کو اہلِ فن "صنعتِ مراعات النظیر" کہتے ہیں۔ ذوق کے بعد داغ کے کلام میں یہ صنعت عام طور سے پائی جاتی ہے۔ داغ کہتے ہیں ؎

مری وحشت سے جو ان کا دل حیران اٹھا
بخیہ گر سینے لگا چاک گریباں اٹھا

دل کے ساتھ سینے کی رعایت اور وحشت کے ساتھ چاک گریباں اور بخیہ گر کی رعایت قابل داد ہے۔ لفظی رعایت سے حسن بریلوی نے بھی بیشتر اشعار میں بلا کی دل کشی پیدا کی ہے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔ ؎

لکھا ہے روز عید در قتل گاہ پر
قرب اس کے واسطے ہے جو قرباں ہو گیا

چھینے نہ دیگی زلف کی الفت کسی طرح
ٹل جائے میرے سر سے یہ آفت کسی طرح

لفظی تقدم اور تاخر

حسن بریلوی نے بعض اشعار میں لفظوں کے ہیر پھیر یا تقدم وتاخر سے دل کشی پیدا کی ہے۔ ؎

وہ اگر یاد کریں ہم کو تو بھولیں کس کو
ہم اگر ان کو بھلائیں تو کسے یاد کریں

ہنسی ہنسی میں کبھی وہ مجھے رلاتے ہیں
رلا کے ہنستے ہیں ہنس ہنس کے گدگداتے ہیں

تکرار الفاظ

حسن بریلوی کو الفاظ کے تکرار سے مضمون پیدا کرنے میں کمال حاصل ہے۔ اور بعض کو تکرار الفاظ سے تیر ونشتر بنا دیا ہے۔ کہتے ہیں ؎

دل لگانے کی سزا ہم نے جو پائی پائی
پیار کرنے کا مزا دل نے جو دیکھا دیکھا

جان جائے پر نہ جائیں گے تمہارے کوچے سے
جان جاتی ہے تمہارے کوچے سے جاتے ہوئے

قیامت ہے دلچسپی دار فانی
سفر کا وطن ہے وطن کا سفر ہے

تضاد الفاظ

حسن بریلوی کو زبان پر پورا قابو تھا۔ الفاظ ومحاورات کے مناسب اور بر محل استعمال کی بہت مہارت تھی اس لئے انہوں نے بعض جگہ متضاد الفاظ سے مضمون پیدا کیا ہے اور بعض جگہ تضاد مضمون سے نیا مضمون اخذ کیا ہے۔ تضاد الفاظ کی مثالیں دیکھئے۔

بزم جلوت میں کبھی یار کو تنہا پایا
کنج خلوت میں کبھی انجمن آرا دیکھا

وقت جلوہ شرم وشوخی کی کشاکش کیا کہوں
پردہ روئے صنم اٹھ کر گرا، گر کر اٹھا

بے قراری کل بھی تھی، کل سے زیادہ آج ہے
صبر کا یارا دل بے تاب کو کل تھا نہ آج

تضاد مضمون سے نیا مضمون اخذ کرتے ہیں ؎

اس قدر تنگ کرو کہ تم مسیحا ہو جاؤ
جاں ستانی نہیں یہ مشق مسیحائی ہے

بے حجابی سے حشر برپا کر..!
منہ چھپانا ترا قیامت ہے

اے دردِ دل اٹھ کہ مداوائے دل کریں
پرہیز کرتے کرتے تو بیمار ہو گئے

جانؔ اور بے وفائی

حسنؔ بریلوی نے اس مضمون کو بار بار مختلف انداز سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

جب اپنی جان آپ کو سارا جہاں کہے
کہیے پھر آپ کا ہمیں کیا اعتبار ہو

جان ان کو کیا کہا جینے کے لالے پڑ گئے
ہائے وہ رکھنے لگے اب بیوفائی سے غرض

انھیں ہم جان سمجھیں ان کو اپنی زندگی جانیں
خدا جانے پھر ایسوں سے تمنائے وفا کیوں ہے

لفظ "گم" کا استعمال

اساتذہ نے "گم ہو جائیں" تو باندھا ہے۔ "گم جائیں" کسی استاد کے کلام میں کبھی نظر نہیں آیا۔ حسنؔ بریلوی نے جا بجا لفظ "گم" کا استعمال لفظ "ہو" کے بغیر ہی کیا ہے۔ بلکہ گم کر دیا کے بجائے "گما دیا" بھی کہا ہے۔ فرماتے ہیں۔ ؎

زاہد کو کہو اس کو تنفر ہے خودی سے!!
گم جائیں دو عالم سے پھر اس یار کو ڈھونڈیں

اپنی ہستی سدِ راہِ وصلِ جاناں ہے حسنؔ
ہم اگر گم جائیں تو پھر اس سے ملنا کیوں نہ ہو

اگر ڈھونڈ لوں ان کو تو دل کو گما بیٹھوں
مری مشکل کو آسانی میں بھی اک سخت مشکل ہے

تیغ کو گلے لگانا

آپ نے تیغ کو گلے لگانے کا مفہوم بھی بار بار ادا کیا ہے۔ ؎

باہیں ڈالے گی تری تیغ مری گردن میں
آج مقتل میں بڑے لطف کی صحبت ہوگی

جان کا خوف کریں کیوں نہ تڑپ کر بسمل
تیغ جلاد گلے مل کے جدا ہوتی ہے

خرام اور قیامت

خرام اور قیامت کا مضمون بڑے ہی حسین انداز میں پیش فرماتے ہیں۔

اک قیامت خرامیاں ان کی
محشرستاں ہماری تڑپ ہے

آیا نہ حشر بھیس میں گر اس خرام کے
ہم تو کسی طرح نہ اٹھیں گے مزار سے

کوئی قیامت آئے کہ دل پائمال ہو
کچھ ہو بلا سے یار دکھا دے خرام آج

جلوہ اور دنیا کی تباہی

حسنؔ بریلوی نے جلوۂ محبوب سے تباہی اور قیامت کے آنے کا مضمون بڑے سلیقے سے باندھا ہے۔ کہتے ہیں۔ ؎

اگر وہ بے پردہ ہو جائیں تو ہو عالم تباہ
اس گلی میں ہو زمانہ اپنے گھر کوئی نہ ہو

گر یہی جلوے ہیں تو عالم ہوا ویران تمام
دیکھ لینا اس کے کوچے میں ہزاروں گھر بنے

زاہد، واعظ اور ناصح

مرزا داغؔ نے زاہد، واعظ، ناصح اور محتسب سے بھی بہت

چھیڑ چھاڑ کی ہے۔ اور بعض جگہ تو حد سے بڑھ گئے ہیں۔ حسن بریلوی نے بھی زاہد، واعظ اور ناصح کو بار بار چھیڑا ہے۔ مگر حد اخلاق یا حد ادب سے آگے نہیں بڑھے ہیں۔ متانت اور سنجیدگی سے بات کی ہے۔ فرماتے ہیں ؎

یہ فصل گل، یہ ابر، در میکدہ قریب
ایسے میں آپ حضرت زاہد کہاں چلے

ناصحو! سچ ہے قیامت ہے محبت کا عذاب
اس کو تم کیا کہتے ہو ہم سے نہیں کہنے کو تھے

قابل تعزیر میکش ہیں جناب محتسب
دور کی تقصیر کیا ہے، دور چلنے دیجئے

تقابل

حسن بریلوی نے ایسی زمینوں میں بھی غزلیں کہی ہیں۔ جن میں اساتذہ نے بظاہر کوئی مضمون باقی نہیں چھوڑا تھا۔ اور دوسرے شعراء کو ان زمینوں میں قلم اٹھانا بظاہر بہت دشوار تھا۔ مثلاً ذوق کا ایک شعر ہے۔ ؎

مے پلا کر سا تیا سامری فن آب میں!
کرتے ہیں جادو سے اپنے آگ روشن آب میں

اسی زمین اور اسی قافیہ میں حسن بریلوی کے اشعار دیکھئے۔ ؎

اس گھٹا میں کیوں گھٹائے ہو مزا لطف وصال
ابر کھلنے کے لئے ڈالو نہ روغن آب میں
غیر سے بے حس بھی یوں شیر و شکر ہوتے نہیں
دیکھ لو تم ڈال کر تھوڑا سا روغن آب میں

استاذ ذوق نے مسکن قافیہ نہیں باندھا ہے۔ حسن بریلوی نے یہ قافیہ یوں باندھا ہے۔ ؎

بار گل سے جھک چلیں شاخیں لچے کیا عجب
بلبلے ہوں ڈال پر بلبل کا مسکن آب میں

استاد مرزا داغ دہلوی کا شعر ہے۔ ؎

دکھا دوں ان کا غیر نے سینے پہ رکھ کے ہاتھ
وہ کاش دیکھتے نہ مجھے اضطراب میں
دل دے کے مفت مول لیا پھر ہزار بار
اپنے دھوتیں بکھر گئے عہد شباب میں

اساتذہ کی کاوش فکر کے بعد اس زمین میں قلم اٹھانا آسان بات نہیں لیکن حسن بریلوی نے اس زمین میں بھی اچھے اشعار نکالے ہیں۔ بیان فرماتے ہیں۔ ؎

ہم جاں بلب ہوں جب بھی رہیں وہ حجاب میں
اے برق آہ آگ لگا دے نقاب میں
تدبیر وصل یہ ہے عدو کو بُرا لکھوں
جھنجھلا کے آپ آئیں گے خط کے جواب میں

ماخوذ :-

۱۔ شعر حسن، از نظر لدھیانوی، رضا پبلیکشنز لاہور ۱۹۷۸ء
۲۔ سیرت اعلیٰحضرت، از مولانا حسنین رضا، سنی رضوی اکیڈمی ماریشش، افریقہ ۱۹۸۳ء
۳۔ امام احمد رضا نمبر، (ماہنامہ قاری دہلی) ۱۹۸۹ء
۴۔ ماہنامہ حجاز جدید، دہلی، جنوری، فروری ۱۹۹۱ء

استاد زمن اور انکی نعتیہ شاعری

مولانا محمد رفیق عالم رضوی مصباحی مدرس جامعہ نوریہ رضویہ بریلی شریف

ابر رحمت تیرے مرقد پہ گہر باری کرے
حشر تک شان کریمی ناز برداری کرے

اس خاکدان گیتی پر حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک نہ جانے کتنے لوگ آئے اور چلے گئے اور نہ جانے کتنے آئیں گے اور چلے جائیں گے۔ رستم و دارا آئے چلے گئے، نمرود و فرعون آئے چلے گئے، ہامان و شداد آئے چلے گئے یوں ہی قارون و یزید آئے اور چلے گئے اور ساتھ ہی ساتھ ان کی طاقت و قوت، سلطنت و حکومت، دولت و ثروت اور دبدبہ و سطوت بھی روئے زمین سے مٹتی چلی گئی۔ بڑی بڑی سلطنتیں قائم ہوئیں اور زوال پذیر ہوگئیں۔ حد تو یہ ہے کہ آج کرۂ ارض پر کوئی بھی ان کا نام تک لینا گوارہ نہیں کرتا۔ وہ ایسے نیست و نابود ہوگئے گویا کہ وہ معرض وجود میں آئے ہی نہ تھے۔

لیکن ان میں کچھ باکمال اور قدر آور ہستیاں ایسی بھی ہیں جو اپنی حیات میں بھی روشن و تاباں اور بعد ممات بھی زندہ و تابندہ رہتے ہیں۔ صفحات حیات پر وہ کچھ ایسے نقوش ثبت کر جاتے ہیں جن کی وجہ سے وہ ہمیشہ مثل لعل بدخشاں چمکتے اور دمکتے رہتے ہیں۔ قوم و ملت کے لئے وہ کچھ ایسے کارنامے چھوڑ جاتے ہیں جس کی وجہ سے دنیا انہیں بھلائے سے نہیں بھول سکتی۔ دین و ملت کی کچھ ایسی خدمات وہ کر جاتے ہیں کہ جس کی وجہ سے گم گشتگان راہ منزل ساحل مراد کا پتہ لگا لیتے ہیں۔

ان ہی باکمال و ذیشان ہستیوں میں استاد زمن حضرت علامہ مولانا حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کی ذات گرامی ہے۔ جو حضرت علامہ مولانا نقی علی خاں کے فرزند اصغر ہیں۔ اور امام اہلسنت فاضل بریلوی علیہ الرحمہ کے برادر صغیر ہیں۔

ابتدائی تعلیم اپنے والد گرامی کے زیر تربیت اور اعلیٰ حضرت کے سایۂ کرم میں ہوئی۔

حسن بریلوی فصاحت و بلاغت کا مجسمہ

مولانا حسن بریلوی علیہ الرحمہ فطرتاً پاکیزہ نفس، رقت پسند، روشن خیال، زندہ دل اور شگفتہ مزاج واقع ہوئے تھے۔ ذہانت و فطانت، سنجیدگی و متانت، لطافت و سلاست اور فصاحت و بلاغت میں وہ اپنی نظیر آپ تھے ان کی زبان بامحاورہ، دلکش اور انداز بیان دلنشیں اور پُر کشش تھا۔

استاد زمن کی شہرت جسکی وجہ سے عالم گیر سطح پر ہوئی وہ ان کی نعتیہ شاعری ہے۔ نعت گوئی کا جذبہ اور شعر و سخن کا شوق ان کو ابتدا ہی سے تھا۔ ان کی نعتیہ شاعری حشو و زوائد سے خالی اور معانی و مفہوم سے بھرپور ہے۔

مولانا حسن رضا خاں بریلوی نے ایک عرصے تک مرزا داغ دہلوی کے گلستان شعر و سخن سے گل چینی کی اس

لئے ان کے اشعار میں داغ کے کلام کی خصوصیات، مثلاً مضمون کی شوخی اور رنگینی، معاملہ بندی، زبان کی صفائی تشبیہات کا حسن، زبان کی لطافت، محاورات کا چٹخار اور بے باکانہ انداز بیان بکثرت پائے جاتے ہیں

حضرت علامہ حسن کی نعتیہ شاعری بھی لاجواب تھی

دوسرے شعراء کی طرح وہ نقال نہیں جو دوسروں کی نعت وغزل کا چربہ اتار کر اپنے اشعار کے قالب میں رکھتے۔ الفاظ تو اپنے اور معنی و مفہوم دوسرے کے کلام سے چرایا ہوا ہو۔ بلکہ ان کی نعتیہ شاعری میں متانت وشائستگی، سوز و گداز، درد و کسک کے ساتھ ہی ساتھ خیال میں وسعت و رفعت اور اسلوب میں جدت بیان پائی جاتی ہے۔ وہ اپنے ہر شعر میں ایک نیا خیال، جدید مفہوم اور نئی بات پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ وہ فرماتے ہیں۔

الٰہی دھوپ ہو اُن کی گلی میں
سرے سر کو نہیں ظل ہما خوش

اور فرماتے ہیں۔

جنت بھی لینے آئے تو چھوڑیں نہ یہ گلی
منہ پھیر کے بیٹھیں ہم تیری دیوار کی طرف

پہلے شعر میں سایہ کو ناپسند کرنے اور دھوپ کو اختیار کرنے میں، اور دوسرے شعر میں "جنت" کو پس پشت ڈالنے اور سرکار کی "گلی" کو اختیار کرنے میں جو ندرت بیان اور جدت پسندی کا اظہار کیا ہے وہ شعراء تو شعراء عام فہم لوگوں کی نگاہ سے بھی پوشیدہ نہیں۔

دور حاضر میں نادر الوجود

الفاظ کی شائستگی، خیال کی بلند پروازی، معنی میں وسعت فکری اور جدید طرز بیان ان کی نعتیہ شاعری میں ایسی پائی جاتی ہے کہ جس سے دوسرے شعراء کے کلام اگرچہ خالی نہیں لیکن نادر الوجود ضرور ہیں۔ چنانچہ حاضر خدمت ہے ان کا ایک شعر۔

الٰہی بعد مردن پردہ ہائے حائل اٹھ جائیں
اجالا میرے مرقد میں ہو اُن کی شمع تربت کا

تشبیہات و استعارات کا برمحل استعمال

استاد زمن حضرت مولانا حسن رضا خاں بریلوی علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری بے حد پاکیزہ اور صاف ہوتی ہے۔ پُرشکوہ الفاظ، بامعنی ترکیبیں اور ظرافت کی چاشنی کے ساتھ ہی ساتھ تشبیہات و استعارات کی خوبی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے اگرچہ اپنے کلام میں تشبیہات و استعارات کا استعمال کم کیا ہے۔ لیکن جہاں اس کی ضرورت محسوس کی برجستہ اس کا استعمال کر کے شعر کے حُسن و نکھار میں چار چاند لگا دیتے ہیں۔ چنانچہ وہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں ے

ان کی گیسو نہیں رحمت کی گھٹا چھائی ہے
ان کے ابرو نہیں دو قبلوں کی یکجائی ہے

اس شعر میں سرکار کی گیسوئے پاک کو "رحمت کی گھٹا" سے اور ابرو کو "دو قبلوں کی یکجائی" سے تشبیہ دے کر شعر معنی میں کتنا حسن پیدا کر دیا ہے۔

ندرت کلام کا آئینہ دار

نعتیہ شاعری ہو یا غزل گوئی، مرثیہ گوئی ہو یا قصیدہ گوئی ہر ایک میں محاورات کا استعمال شعراء کی نگاہ میں بہتر سمجھا جاتا ہے۔ جس کی وجہ سے شعر و غزل اور مرثیہ و قصیدہ پُرلطف اور بااثر ہو جاتے ہیں۔ اور سامعین کی رسائی اس کے مفہوم و مقصود تک ہو جاتی ہے۔ اور سامعین لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ان کا ایک شعر ملاحظہ فرمائیں ے

کیوں تمنا میری مایوس ہوا اے ابر کرم
سوکھے دھانوں کا مددگار ہے چھینٹا تیرا

مندرجہ بالا شعر میں "سو کہے دہائی" کے استعمال نے شعر کے مفہوم میں نکھار پیدا کر دیا ہے۔

فن شعر و سخن میں متضاد الفاظ کا استعمال بھی ایک کمال ہے لیکن یہ کمال اس وقت اور دو بالا ہو جاتا ہے جب کہ متضاد الفاظ کے ساتھ الفاظ مختصر، معنی وسیع اور خیال جدید ہو۔ مولانا حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ نے اپنے نعتیہ کلام میں دونوں خوبیوں کا خاصا لحاظ رکھا ہے۔ متضاد الفاظ کا استعمال اس حسن اسلوب سے دوسرے شعراء کے کلام گرچہ نایاب نہیں ہیں لیکن کمیاب ضرور ہیں چنانچہ ایک اور جگہ وہ فرماتے ہیں ؎

مر کے جیتے ہیں جو اُن کے در پہ جاتے ہیں
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر

ان کے اشعار قرآن و حدیث کا ترجمہ

ان کی نعتیہ شاعری میں ایک اہم خصوصیت یہ بھی ہے کہ ان کے اشعار میں یا تو قرآن کی کسی آیت کی ترجمانی ہوتی ہے یا پھر کسی حدیث کے مضمون کی ادائیگی۔ چنانچہ وہ ایک اور جگہ فرماتے ہیں۔

کہیں گے اور نبی اذھبوا الیٰ غیری
مرے حضور کے لب پر انا لہا ہو گا
عزیز بچے کو ماں جس طرح تلاش کرے
خدا گواہ یہی حال آپ کا ہو گا
کوئی کہے گا دہائی ہے یا رسول اللہ
تو کوئی تھام کے دامن مچل گیا ہو گا
کبھی لے کر فرشتے سوئے جحیم
یہ اُن کا راستہ پھر پھر کے دیکھتا ہو گا

ارتقائی منازل

حسن بریلوی علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری میں اس بات کا حد درجہ التزام ہے کہ اشعار میں از ابتدا تا اختتام ارتقائی منازل طے کرنے میں روانی اور بیان کی سلاست برقرار رہتی ہے۔ جس سے صاف عیاں ہوتا ہے کہ کس وارفتگی اور سرشاری میں یہ اشعار گوشۂ ذہن سے نکل کر صفحۂ قرطاس کے زینت بنے ہیں۔ پیش خدمت ہے اس بارے میں ان کے دو شعر ؎

باغ فردوس کھلا، فرش بچھا، عرش سجا
اک ترے دم کی یہ سب انجمن آرائی ہے
کھیت سرسبز ہوئے پھول کھلے، میل دھلے
اور پھر فصل کی گھنگھور گھٹا چھائی ہے

حسن کی شاعری میں اشارات کا استعمال

فن شعر و سخن میں استعارہ کے بعد اشارے کی منزل ہوتی ہے اور استعارہ تشبیہ کے بعد کا درجہ ہے۔ تشبیہ میں جب جدید خیال اور نئی فکر کی آمیزش از اول تا آخر برقرار رہتی ہے اور شائستہ الفاظ، سلیس انداز بیاں اور معنوی وسعت سے ہمکنار ہوتی ہے تو استعارہ منصۂ شہود پر آتا ہے۔ اور یہی استعارہ تہذیب و تمدن کی بنیادوں میں پیوست ہوتا فکر و فن کی بھٹی میں تپتا، زمانے کو کچھ دیتا اور لیتا، تصنع و تکلف کی منازل سے دوچار ہوتا۔ بتدریج نشو و نما پاتا، پختہ سے پختہ تر ہوتا اور نوک و پلک کو سنوارتا ہے تو مدتوں بعد کہیں جا کر اشارہ بنتا ہے۔ استاد زمن کی نعتیہ شاعری میں اشارات کی بہتات ہے۔ جو شعراء کے نزدیک دل نشین چیز سمجھی جاتی ہے۔ چنانچہ اس قسم کا ایک شعر پڑھیے اور ان کی نعتیہ شاعری کو داد دیجئے۔

نہ کوئی دوسرا میں تجھ سا ہے، نہ کوئی دوسرا ہوا تیرا
نہ ہو گا دو قدم کا فاصلہ بھی، الہ آباد سے احمد نگر تک

سہل زبان کا مالک

ان کے اشعار ان کے مذہبی لگاؤ، ایمانی ذہن، حکمتوں پر ان کی نظر، ان کے حسن اور ان کے شاعرانہ نقطۂ نظر کے

باقی صفحہ ۱۸۵ پر۔

مولانا حسن بریلوی میدان نعت میں

جناب صوفی محمد جمیل اختر صدیقی قادری رضوی اختری کلکتہ

نعت خوانِ احمدِ مختار ہیں قبلہ حسن
واصفِ حسن شہِ ابرار ہیں قبلہ حسن
مدحتِ سرکارِ طیبہ کے تصدق میں جمیل
جنت الفردوس کے حقدار ہیں قبلہ حسن

حدیث قدسی ہے اللہ تبارک و تعالےٰ اپنے مہتم بالشان نبی و رسول کو مخاطب کر کے ارشاد فرماتا ہے۔

لولاک لما خلقت الافلاک ۝

"اے محبوب گرامی وقار اگر آپ کو پیدا کرنا مقصود نہ ہوتا تو میں ہرگز آسمانوں کو پیدا نہ کرتا۔"

پھر دوسرے مقام پر ارشادِ ربی ہوتا ہے۔

لولاک لما خلقت الارضین ۝

"اے حبیب کرم شعار اگر آپ کی پیدائش مقصود نہ ہوتی تو میں زمینوں کو بھی پیدا نہ کرتا۔"

پھر تیسری جگہ فرمانِ الٰہی ہوتا ہے۔

لولاک لما خلقت الخلق

اے رسولِ کائنات اگر آپ کی تخلیق مقصودِ اصلی نہ ہوتی تو پھر وجود و تخلیقِ کائنات و عالمین کا کوئی سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔" کائنات کی کوئی شئی عالمِ وجود میں نہ آتی نہ فرش و عرش ہوتے، نہ لوح و قلم نہ شجر و حجر ہوتے نہ شمس و قمر، نہ بحر و بر ہوتے نہ خشک و تر، نہ ستارے ہوتے نہ انجم و کواکب، نہ باغ و گلشن ہوتے نہ غنچہ و گل نہ پستئ زمین ہوتی نہ بلندئ آسمان، نہ مظاہرِ قدرت ہوتے نہ مناظرِ فطرت، صرف خدائے افضل و اعلیٰ و برتر کی "ذاتِ پاک" ہوتی اور کچھ نہیں!! پیش کردہ احادیث قدسیہ" اس امر پر شاہد عدل ہیں کہ اگر حضور پرنور شافع یوم النشور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کو رب کائنات خلق نہ فرماتا تو" کائنات و عالمین" لباسِ وجود و ظہور میں موجود نہ ہوتے۔ کائنات کی یہ ساری رنگینیاں، چاند و سورج کی ضوافشانیاں، باغ و گلشن کی روح پرور رعنائیاں، بحر و دریا کی تلاطم خیزیاں سب حضور کے وجودِ مسعود کی مرہونِ منت ہیں۔ جو نبی اتنی ساری عظمتوں کا پیکر اور بیحد و بے حساب کرامتوں کا سرچشمہ و منبع ہو اس کی تعریف و توصیف، مدح و ثنا اور مدحت و نعت سے انسان کی زبان کیسے تر نہ ہو۔ نبی کی نعت ہم جیسے گنہگار و عصیاں شعار بندے بھلا کما حقہ کیا کر سکتے ہیں۔ پورا کلام الرحمٰن یعنی مکمل قرآن نبی کا نعت خواں ہے

"انا اعطینک الکوثر ۝ فصل لربک
والنحر ۝ ان شانئک ھو الابتر ۝

نعت نہیں ہے تو پھر کیا ہے۔؟

بارگاہِ نبوی کے عظیم و جلیل نعت گو شاعر صحابئ رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ کے نعتیہ جامع کلام سے ہمیں نعت گوئی و ثنا خوانی کا جواز ملتا ہے۔ دربار رسالت و بارگاہ نبوت کے معروف ترین شاعر حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ تعالےٰ عنہ

کے کلامِ بلاغت نظام سے کون ایسا نعت گو شاعر ہے
جس نے استفادہ نہ کیا ہو۔ یہ واقعہ و حقیقت ہے
کہ نعت گو شعراء کے لیے حضرت حسان بن ثابت کی نعتیہ
شاعری سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس انمٹ اور
ٹھوس حقیقت سے کسی نقاد کو انکار و تعارض کی ہمت و
جسارت نہیں۔ فارسی شعراء نے بھی فارسی زبان نے
میں خوب خوب نعتیں کہی ہیں۔ جامی علیہ الرحمہ کے
عشق و محبت میں ڈوبی ہوئی نعتوں کا کوئی جواب نہیں
اردو شعر و شاعری کے مطالعے سے یہ حقائق روز
روشن اور مہر نیم روز کی طرح ظاہر و باہر ہو جاتے ہیں
کہ اردو شعراء نے بھی دل کھول کر جذبات عشق و
محبت اور اشکہائے عقیدت و ارادت نظم و شعر کے
قالب میں ڈھال کر بصد ادب و احترام بارگاہ رسالت
و دربار نبوت میں "فکر و سخن" کی سوغاتیں بہ شکل "نعت"
پیش کرنے کی سعادتیں حاصل کی ہیں۔ اردو زبان و
ادب اور شعر و شاعری کے مستند و اکابر شاعروں نے
بھی بڑی اچھی اچھی اور پیاری نعتیں موزوں کی ہیں جن
کے پڑھنے اور سننے سے روح جھوم جھوم جاتی ہے۔ اور
قلب و دل مسرت و شادمانی کی دائمی و سرمدی لذت
محسوس کرنے لگتے ہیں۔ اعلیٰ حضرت امام اہل سنت مجددِ
دین و ملت علیہ الرحمہ کی نعتیہ شاعری نے دور حاضر میں
پوری دنیائے اسلام میں دھوم مچا دی ہے۔ ہر صاحب
ذوق اور صاحب ایمان کی زبان پر ان کی عطر و شمیم میں
بسی ہوئی روح پرور اور ایمان افروز نعتوں کے اشعار چل رہے
ہیں۔ کوئی محفل کوئی جلسہ کوئی کانفرنس اور کوئی
بزم و مجلس ایسی نہیں جس میں اعلیٰ حضرت کے اشعار
نہ گائے جاتے ہوں۔ اور وہ محفل بے رونق سمجھی جاتی
ہے جس میں اعلیٰ حضرت کے کلام و سلام نہ پڑھے جاتے
ہوں۔

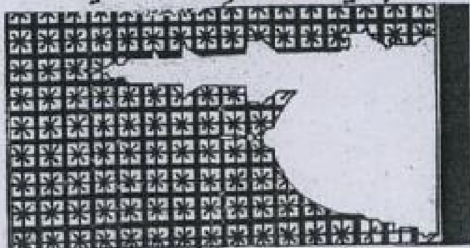
اعلیٰ حضرت امام اہل سنت کے برادرِ اصغر حضرت علامہ
حسن رضا خاں حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ جن کی شخصیت
و نعتیہ شاعری عنوان تحریر ہے۔ علامہ موصوف علیہ الرحمہ
ابتدائی کتب دینیہ والد گرامی منزلت سے پڑھیں اس
کے بعد باضابطہ اور بالاستیعاب درس و تدریس کا
نورانی و عرفانی سلسلہ شروع ہوا۔ اور خاندانی روایات
کے مطابق بے پناہ دلچسپی و لگن کے ساتھ حصول تعلیم
علوم دینیہ و شرعیہ میں مصروف و منہمک ہو کر محنت شاقہ
سعی پیہم اور کوشش مسلسل کو بروئے کار لا کر کچھ
سالوں کے بعد وقت کے عظیم و جلیل، شہیر و کبیر اور
جید عالم دین بن کر عوام و خواص کے درمیان نمودار
ہوئے۔ والد و دادا کی مشترکہ کرم پاشیوں نے
سونے پر سہاگہ کا کام کیا۔ بڑے باپ دادا کی اولاد
بھی بڑی ہوتی ہے۔ اس نظریے کے پیش نظر
وہ ساری خوبیاں، فضیلتیں اوصاف و کمالات آپ کی
ذات ستودہ صفات میں جمع اور اکٹھا ہو گئے تھے۔ جو
آپ کے آباء و اجداد سے ورثے میں ملے تھے۔ آپ
بہترین و اعلیٰ ترین عالم دین کے ساتھ ساتھ فصیح البیان و
سحر اللسانی اور قادر الکلام نعت گو شاعر و سخنور بھی ہیں
آپ نے میدان غزل گوئی میں بھی اس دور کے استاد
شاعروں سے بھی خوب خوب داد تحسین و آفریں دستر
و وصول کی۔ غزل میں آپ شہنشاہِ تغزل نواب مرزا
داغ دہلوی سے اصلاح لیتے رہے۔ آپ کی نعت گوئی
دنیائے اسلام کے عظیم ترین نعت گو عالم دین شاعر
سرکار اعلیٰ حضرت عظیم المرتبت کی ادبی و شعری دیکھ ریکھ
اور سرپرستی میں پروان چڑھی۔ آپ کو زبان و بیان پر
وہ قدرت و مہارتِ تامہ حاصل تھی جس کی نظیر و مثال
اس دور عصر کے سخندانوں اور شاعری میں بہ مشکل
ملتی ہے۔ آپ نے ہر صنف سخن میں بلیغ اور جامع طبع
آزمائی فرمائی ہے۔ مگر آخر میں نعت گوئی سے جو روحانی
شغف پیدا ہوا وہ تادمِ آخر باقی و موجود رہا۔ اس سے
بڑھ کر آپ کی شعر و شاعری کے کمال و جمال اور عظمت و
رفعت کی عظیم سند اور کیا ہو سکتی ہے کہ تاجدار سخن
داغ دہلوی کو آپ کی شاگردی پر ہمیشہ فخر و ناز رہا۔

ابھی اوپر ذکر ہو چکا ہے اور اس امر میں کسی کو کوئی عذر و اعتراض نہیں کہ جناب حسن بریلوی رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ نے اپنے دور کے دیگر باکمال اور قادر الکلام شعراء و سخندانوں کی طرح مروجہ ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی چونکہ دیگر اسلامی علوم و فنون اور فلسفہ و حکمت و منطق کے علاوہ شعر و شاعری کی بھی فطری و قدرتی بھرپور صلاحیتوں کے مالک تھے۔ غزل گوئی کا بھی لطیف و شیریں ذوق حضرت حسن بریلوی کی شعر و شاعری کا طرۂ امتیاز ہے۔ نعت گوئی میں آپ کو جو کمال و امتیاز و اعجاز حاصل ہے وہ اس دور کے کم شعراء میں پایا جاتا ہے۔ بفضل ایزدی حضرت حسن بریلوی کو اس فن میں کامیابی و کامرانی دستیاب ہوئی وہ اپنی مثال آپ ہے۔ اصحاب طریقت وارباب شریعت کا اس امر میں پورے طور پر اجماع و اتفاق ہے کہ نعت گوئی کے لئے حضور پرنور صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی ذات والاصفات سے "عشق صادق، محبت کامل" اور دلی عقیدتوں کا پرخلوص و پاک جذبہ خون کی طرح ذہن و دماغ اور قلب و دل کی رگ و پے میں پیوست و سرایت ہونا نہایت ضروری و لابدی ہے۔ اگر سرکار کی ذات اعلیٰ و عظمیٰ سے کسی نعت گو شاعر کو گہری عقیدت اور پرخلوص ارادت نہیں ہے تو پھر یہ امر حق اور سچ ہے کہ اس کی نعتوں میں وہ کیف و لذت اور سرمستی و سرشاری پیدا نہیں ہو سکتی جس کی اصلاً نعت شریف متقاضی ہوتی ہے۔ نعت گوئی کے لئے پاکیزہ جذبات، مقدس احساسات، لطیف و حسین خیالات اور پاک معتقدات کی شدید ضرورت محسوس کی جاتی ہے۔ تب جا کر نعتوں میں صداقت کی روح پیدا ہوتی ہے اور ایسی نعتوں کا ذہن و دماغ اور قلب و روح پر پائیدار اثر مرتب ہوتا ہے۔ اور نعت کا ہر مصرعہ ساز قلب و دل کو چھیڑتا ہوا نظر آتا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اردو کا کوئی ایسا شاعر نہیں جس نے فیوض و برکات کے حصول کے مقصد زریں کے تحت نعت کے اشعار نہ کہے ہوں۔ وافر تعداد میں غیر مسلم شاعروں نے بھی حضور اکرم صلے اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کی شان پاک میں نعتیہ کلام تحریر کیا ہے۔ مسلم شاعروں نے تو نجات اخروی اور ذخیرۂ آخرت کی فراہمی کے پیش نظر بڑی اچھی اچھی اور کوثر و سلسبیل میں دھلی ہوئی زبان میں نعتیں لکھی ہیں۔

اس خیال و نظریہ اور عقیدہ میں ذرہ برابر اختلاف کی گنجائش نہیں کہ نعت گوئی بڑی مشکل اور دشوار گذار صنف شاعری ہے۔ شان رسالت اور مقام و عظمت نبوت کی تمام تر نزاکتوں کا پاس و لحاظ رکھتے ہوئے نعت کہی جائے تو بھلائی، فلاح اور اچھائی و بہتری ہے۔ ورنہ اس سلسلے میں ادنیٰ سی لغزشیں اور معمولی خطا بھی تباہی ایمان کا پیش خیمہ بن جاتی ہے۔ حسن بریلوی کی اعلیٰ ترین نعتوں کا مطالعہ جب ہم اس تناظر میں کرتے ہیں تو ہمیں ان کے نعتیہ کلام میں جامی و سعدی اور رومی کی نعتوں کا عکس جمال ملتا ہے۔ اعلیٰ حضرت کا سا مقدس و پاک عشق ملتا ہے۔

حسن بریلوی کی نعتوں کا عطر بیز مجموعہ "ذوق نعت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے جس کا شہرہ و دھوم عالم اسفل کے ساتھ ساتھ عالم بالا میں بھی قدسیوں کے درمیان برپا ہے۔ بس مضمون کی طوالت کے خوف سے اپنے ہی ایک قطعہ سے استاد زمن حضرت علامہ حسن بریلوی علیہ الرحمہ کی بارگاہ عالی جاہ میں خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے اپنی بات تمام کرتا ہوں۔

کیا کروں توصیف میں اس شاعر خوش فکر کی
اس کی ہر ہر نعت پر جبریل بھی قربان ہیں
عصر حاضر میں جمیل قادری سن لیجئے
کہتے ہیں نقاد اُن کو ثانی حسان ہیں



شعر و سخن کا آفتاب

محمد زین العابدین نازاں فیضی ——— گیاوی کلکتہ

استاد زمن کی فکر و نصیحت کا انداز سخن جن خوبیوں سے دوچار ہو کر شعر و شاعری کے سانچے میں ڈھلا ہے وہ محتاج تعارف نہیں، امام احمد رضا فاضل بریلوی رضی المولیٰ عنہ کے برادر خورد ہونے کے ناطے ان کی قائدانہ صلاحیتوں کی خوشبو رگ و ریشے میں بس جانا فطری اور یقینی امر ہے صحت تقریر و تحریر سے لے کر عقائد و نظریات کے لامحدود دائرے تک امام احمد رضا کا فیضان استاد زمن حضرت علامہ حسن رضا بریلوی پر جاری و ساری تھا۔

جب ہی تو فرماتے ہیں۔ ؎

طور نے تو خوب دیکھا جلوۂ شان جمال
اس طرف بھی اک نظر اے برق تابان جمال

دامان رسالت سے وابستگی جنون کی حد تک پہونچ جائے تو اسے عشق کہتے ہیں۔ اور عاشق صادق کا یہ حال ہوتا ہے کہ

؎ رضا پل سے اب وجد کرتے گزریے
کہ ہے رب سلم صدائے محمد۔ (صلی اللہ علیہ وسلم)

زندگی کا ہر لمحہ اور ہر پل عشق رسول کی ہنگاری میں ایسا سلگتا رہتا ہے کہ خوف آخرت امیدوا س کی انتہا کو پہونچ کر مشغلۂ حسن ایمان بن جاتا ہے اور زبان و تحریر سے ایسے ایسے شوق و الہانہ سرزد ہونے لگتے ہیں کہ دنیا سے آخرت تک اس آنگن سے اس آنگن کا سفر معلوم ہونے لگتا ہے۔ اسی امام احمد رضا کے برادر خورد اور چہیتے شاگرد تھے تو کیسے۔؟ نہ دنیا انہیں استاد زمن کے نام سے پکارتی۔ آج شرق و غرب سے خراج عقیدت کے پھول نظم و نثر کی صورت میں پیش کرنے کے لئے اہل ایمان اور اہل زبان و قلم کی دھڑکنیں کام کر رہی ہیں۔ شمال و جنوب سے فصل گل انواز خیال کا ایک عطر بیز جھونکا ہے جو بریلی شریف کا رخ کر رہا ہے۔ کتنے خوش نصیب اور مقدر کے دھنی ہیں ماہنامہ سنی دنیا بریلی شریف کے مدیر اعلیٰ جناب مولینا محمد شہاب الدین رضوی اختری صاحب جنھوں نے استاد زمن نمبر نکالنے کا بیڑا اٹھایا ہے۔ نہ جانے کتنی راتوں کی نیندیں اس تگ و دو کے خیالی پروگرام کے لئے وقف کر دیں، کتنی صبح و شام میں دور دراز سے آئی ہوئیں دستاویزات و عبارات کی چھان پھٹک میں گزار دی۔

استاد زمن پر مقالات لکھ کر اور اپنی تحریریں ارسال کر کے غلامانہ ذہن کے معترف خراج عقیدت پیش کرنے والوں میں جہاں ہند و پاک کے نادر روزگار اہل قلم ہوں گے وہاں اس ناچیز کو ان کے نقش پا کی دھول سمجھ لیا جائے اور اہل محبت کی محفل میں بیٹھنے کے لئے پاپوش کی جگہ مل جائے تو تقدیر پر ناز ہی کروں کہ یہ جگہ بھی بڑی قیمتی ہے۔

استاد زمن حضرت علامہ حسن رضا بریلوی علیہ الرحمہ والرضوان بہت بلند پایہ کے نعت گو شاعر تھے

ان کے شعری مزاج کا حسن کیا مجال کہ مجھ ناچیز سے بیان ہو۔ جب مجدد مائتہ حاضرہ امام اہلسنت فاضل بریلوی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان کے شعری نعتیہ دیوان "ذوق نعت" کی تاریخ طبع لکھتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں۔

قوت بازوے منی سنی نجدی فگن
حاج وزائر حسن سلمہٗ ذو المنن

نعت چہ رنگیں نوشت شعر خوش آئیں نوشت
شعر مگو دیں نوشت دور ز ہر ریب و ظن

شرع ز شعرش عیاں عرش بہ بینش نہاں
سنیہ را حرز جاں نجدیہ را سر شکن

باد لو اے حسن باب رضائے حسن (۱۳۲۶ھ)
باب رضائے حسن باز بہ جلب منن (۱۳۲۶ھ)
(ذوق نعت ص ۱۲۵-۱۲۶)

اس کے بعد اعلیٰ حضرت کا قلم یوں دواں رواں ہے لوح وقلم کا کلس چوم رہا ہو۔ پڑھئے اور سر دھنئے۔ ؎

نعت حسن آمدہ نعتِ حسن
عین رضا باد و مزید سلام

ان من الذوق لسحر ھمہ (۱۳۲۶ھ)
ان من الشعر لحکمۃ تمام (۱۳۲۶ھ)

کلک رضا داد چناں سال آں
یافت قبول از شہ راس الانام
(ذوق نعت ص ۱۳۶)

اب استاذ زمن کے اشعار میں ان پر کیف ہواؤں کو ذرا دیکھیں۔ جو ہند سے لے کر طیبہ کی جالیوں کو چوم رہی ہیں اور اپنے دامن میں گلستان عشق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی بہاریں لئے ہوئے ہیں۔ لگتا ہے گلزار جناں کے پردے وا ہو رہے ہے۔ مطلع میں قاب قوسین کی خوشبو رچی بسی ہوتی ہے، شریعت اور طریقت دونوں باگوں کو تھامے ایک عاشق کا دل یوں بول رہا ہے۔

ملاحظہ ہو۔

تم ذات خدا سے نہ جدا ہو نہ خدا ہو
اللہ کو معلوم ہے کیا جانئے کیا ہو
یہ کیوں کہوں مجھکو یہ عطا ہو یہ عطا ہو
وہ دو کہ ہمیشہ مرے گھر بھر کا بھلا ہو
جس بات میں مشہور جہاں ہے لب عیسیٰ
اے جان جہاں وہ تری ٹھوکر سے ادا ہو
یوں جھک کے ملے ہم سے کمینوں سے وہ جسکو
اللہ نے اپنے ہی لئے خاص کیا ہو
(ذوق نعت ص ۷۵)

ایک جگہ فرماتے ہیں ؎

دل میں ہو یاد تری گوشۂ تنہائی ہو
پھر تو خلوت میں عجب انجمن آرائی ہو
خلعت مغفرت اس کیلئے رحمت لائے
جس نے خاک در شہ جائے کفن پائی ہو
یہی منظور تھا قدرت کو کہ سایہ نہ بنے
ایسے یکتا کے لئے ایسی ہی یکتائی ہو
بند جب خواب اجل سے ہوں حسن کی آنکھیں
اس کی نظروں میں ترا جلوۂ زیبائی ہو
(ذوق نعت)

استاذ زمن کا پورا نعتیہ دیوان شعری حکمت اور والہانہ ذوق وشوق عشق رسول سے پر ہے، ہر شعر نور کا خزانہ ہے مشکل سے مشکل ردیف پر قلم کی جولانی یکساں رواں دواں ہے قارئین کے ذوق کے لئے چند نمونے حاضر خدمت ہے۔

خاک طیبہ کی اگر دل میں ہو وقعت محفوظ
عیب کوری سے رہے چشم بصیرت محفوظ
دل میں روشن ہو اگر شمع ولائے مولیٰ
دزد شیطاں سے رہے دین کی دولت محفوظ
یا خدا محو نظارہ ہوں یہاں تک آنکھیں
شکل قرآں ہو مرے دل میں وہ صورت محفوظ

احمد رضا کی خاص تربیت اور خاندانی کسب فیضان ہی کا نتیجہ ہے۔ اس کے علاوہ اس دور کے مشہور و معروف استاد شاعر حضرت داغ دہلوی کی شعری فنی مہارت سے بھی ہم صحبت رہے۔ کچھ لیا تو کچھ دیا بھی۔ جہاں تک شعری فن و محاسن کی زلف دراز سنوارنے اور سجانے کا تعلق ہے یہ خوبی تو حضرت داغ دہلوی سے حاصل کیا اور حسن ایمان اور عقائد و نظریات کے تعلق سے یقیناً حضرت داغ دہلوی نے استاد زمن حضرت حسن رضا بریلوی علیہ الرحمہ سے فیوض و برکات کا شرف حاصل کیا ہوگا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ حد درجہ انھیں عزیز رکھتے تھے اور پیارے شاگرد کے نام سے پکارتے تھے۔

کلام رضا

نبی سرور ہر رسول و ولی ہے	نبی راز دار مع اللہ لی ہے
وہ نامی کہ نام خدا نام تیرا	رؤف و رحیم و علیم و علی ہے
ہے بیتاب جس کے لئے عرش اعظم	وہ اس رہرو لامکاں کی گلی ہے
نکیریں کرتے ہیں تعظیم میری	فدا ہو کے تجھ پر یہ عزت ملی ہے
تلاطم ہے کشتی پہ طوفان غم کا	یہ کیسی ہوائے مخالف چلی ہے
نہ کیونکر کہوں یا حبیبی اغثنی	اسی نام سے ہر مصیبت ٹلی ہے
صبا ہے مجھے صرصر دشت طیبہ	اسی سے کلی میرے دل کی کھلی ہے
ترے چاروں ہمدم ہیں یکجان یکدل	ابوبکر فاروق عثمان علی ہے
خدا نے کیا تجھ کو آگاہ سب سے	دو عالم میں جو کچھ خفی و جلی ہے
کروں عرض کیا تجھ سے اے عالم السر	کہ تجھ پر مری حالت دل کھلی ہے
تمنا ہے فرمائیے روز محشر	یہ تیری رہائی کی چٹھی ملی ہے
جو مقصد زیارت کا بر آئے پھر تو	نہ کچھ قصد کیجے یہ قصد دلی ہے
ترے در کا درباں ہے جبریل اعظم	ترا مدح خواں ہر نبی و ولی ہے

شفاعت کرے حشر میں جو رضا کی
سوا تیرے کس کو یہ قدرت ملی ہے

خوشبوئے دشت طیبہ سے بس جائے گر دماغ
مہکائے بوئے خلد مرا سر بسر ... دماغ
مومن فدائے نور و شمیم حضور ہیں
ہر دل چمک رہا ہے معطر ہے ہر دماغ
اس بدلگام کو خبر دجاں جانئے!
موہنہ آئے ذکر پاک کو سن کر جو خر دماغ

جتنا مرے خدا کو ہے میرا نبی عزیز
کونین میں کسی کو نہ ہوگا کوئی عزیز
خاک مدینہ پر مجھے اللہ موت دے
وہ مردہ دل ہے جس کو نہ ہو زندگی عزیز
قرآن کھا رہا ہے اسی خاک کی قسم
ہم کون ہیں خدا کو ہے تیری گلی عزیز
طیبہ کے ہوتے خلد بریں کیا کروں حسن
مجھ کو یہی پسند ہے مجھ کو یہی عزیز

ہوں جو یاد رخ پر نور میں مرغان قفس
چمک اٹھے چہ یوسف کی طرح شان قفس
حیف در چشم زدن صحبت یار آخر شد
اب کہاں طیبہ وہی ہم وہی زندان قفس

ہو اگر مدح کف پا سے منور کاغذ
عارض حور کی زینت ہو سراسر کاغذ
شام طیبہ کی تجلی کا کچھ احوال لکھوں
دے بیاض سحر اک ایسا منور کاغذ
ورق مہر اُسے خط غلامی لکھ دے
ہو جو وصف رخ پر نور سے انور کاغذ
مدح رخسار کے پھولوں میں بسا لوں جو حسن
حشر میں ہو مرے نامہ کا معطر کاغذ

(ذوق نعت)

استاد زمن کی روحانی کیفیتوں کا جو سرور دلآویز کے حسین مجموعے ان کے نعتیہ اشعار میں ملتے ہیں وہ یقیناً امام

فنِ نعت گوئی میں حسنؔ بریلوی کا مقام

مولانا محمد نجف القادری الرضوی نائب شیخ الحدیث مدرسہ الجامعۃ الاسلامیہ گنج قدیم رامپور

حضرت مولانا حسن رضا خاں حسنؔ بریلوی امام المتکلمین حضرت مولانا محمد نقی علی خاں صاحب مرحوم بریلوی کے صاحبزادے اور امام اہل سنت اعلیٰ حضرت مولانا احمد رضا خاں فاضل بریلوی کے منجھلے بھائی تھے۔ ۱۲۷۶ھ میں ولادت ہوئی۔ اوائل عمر سے ہی شعر و شاعری کا شوق پیدا ہو گیا اور رفتہ رفتہ یہ رنگ ایسا چھایا کہ ایک مدت تک بطور خود فن شعر و سخن میں طبع آزمائی کرتے رہے۔ اس کے بعد مرزا داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کیا اور کچھ زمانے تک رامپور میں قیام پذیر رہ کر استاد داغ سے اپنے کلام میں اصلاح لی حتیٰ کہ خود استاد مستند قرار پائے۔ جیسا کہ آج استاد زمن کے لقب سے یاد کئے جاتے ہیں۔

حضرت حسنؔ بریلوی ایک شاعر ہی نہیں تھے بلکہ اپنے وقت کے مایۂ ناز عالم باعمل، متقی و پرہیزگار انسان بھی تھے۔ فقر و قناعت اور تصوف میں ان کی ایک امتیازی شان ہے جسے ساری زندگی انہوں نے اپنی ذات پر غالب رکھا اور جس کا رنگ ان کی شاعری میں بھی پوری طرح نمایاں ہے۔

مرزا داغ کے شاگردوں میں حسنؔ بریلوی ایک ممتاز شاگرد شمار کئے جاتے ہیں۔ ان کا معیار شاعری بہت بلند تھا وہ اپنے وقت کے بہترین استاد تھے۔ آج بھی بہت سے بلند پایہ شعراء کو بالواسطہ یا بلاواسطہ ان کے دامن کمال سے وابستہ ہونے کا شرف حاصل ہے۔ زیارت حرمین شریفین سے واپسی کے بعد ۱۳۲۶ھ میں انتقال فرمایا۔ (سیرت اعلیٰحضرت)

اردو نعت کی تاریخ پر مولانا حسنؔ بریلوی نے اس قدر گہرے اثرات چھوڑے ہیں کہ جس کا ذکر زبان و بیان سے باہر ہے۔ ساتھ ہی نعت گوئی کے واسطے نئی زمینیں اور بنیادیں بھی فراہم کی ہیں۔ نعت گوئی میں حسنؔ بریلوی نے اپنی انفرادی اور اجتہادی کاوشوں کی بدولت موجودہ زمانے کے نعت نگاروں کے سامنے نئے نرالے آفاق و ابواب منکشف کر دیئے ہیں۔ محبوب کی محبوبیت کا رنگ و ڈھنگ ان کے کلام کے ہر ہر لفظ سے موتیوں کی طرح بکھرتا نظر آتا ہے۔ چنانچہ محبوب رب ذوالجلال کی بارگاہ قدس میں اس طرح عرض کرتے ہیں۔

ایسا تجھے خالق نے طرح دار بنایا
یوسف کو ترا طالب دیدار بنایا
طلعت سے زمانہ کو پر انوار بنایا
نکہت سے گلی کوچوں کو گلزار بنایا
دیواروں کو آئینہ بناتے ہیں وہ جلوے
آئینوں کو جن جلووں نے دیوار بنایا
گلزار جناں تیرے لئے حق نے بنائے
اپنے لئے تیرا گل رخسار بنایا

ان ؟ طلب رنگیں کی بچھاور تھی کہ جس نے
پتھر میں حسن ؟ پر انوار بنایا

سیرت پاک کی متحرک ولافانی تصویریں نعت پاک کے آئینے میں جس حسن وخوبی سے دکھائی ہیں وہ اپنی مثال آپ ہیں۔ انہوں نے تمام شعری صنعتیں اپنے کلام میں پیش کی ہیں۔ ان کی مہارت وخوبی یہ ہے کہ انہوں نے حقیقت کو حقیقی زندگی سے ہی نمایاں کیا ہے۔ صنعت گری، تصنع یا بناوٹ کا گمان بھی نہیں ہوتا اسی طرح سنگلاخ زمینوں کو بھی مولانا حسن بریلوی نے معنوی خوبیوں سے گل گزار بنا دیا ہے۔ مصرعوں کے اندر ان ردیف وقوافی کا شاندار التزام کیا ہے کہ ایسا انوکھا اہتمام دوسرے شعراء کے یہاں کم نظر آتا ہے۔ لفظی کمالات اور معنوی التزامات نے قصائد کی روایات کو انوکھی فضائیں اور نئے آسمان دکھاتے ہیں۔ تمام فنی وفکری امتیازات سے بڑھ کر حضرت حسن کے کلام کا جو پہلو لوگوں کو سب سے زیادہ متاثر کرتا ہے وہ کلام میں گہری وابستگی اور داخلی کیفیات کا اظہار ہے جو نعت گوئی میں تغزل کا رنگ بھر دیتا ہے۔ جیسا کہ ان شعروں میں موجود ہے۔

دل میں ہو یاد تری گوشۂ تنہائی ہو
پھر تو خلوت میں عجب انجمن آرائی ہو
آستانہ پہ ترے سر ہو اجل آئی ہو
اور اے جانِ جہاں تو بھی تماشائی ہو
کیوں کریں بزم شبستانِ جناں کی خواہش
جلوۂ یار جو شمع شب تنہائی ہو
بند جب خوابِ اجل سے ہوں حسن کی آنکھیں
اس کی نظروں میں ترا جلوۂ زیبائی ہو

"ذوق نعت" حضرت حسن بریلوی کے کلام کا مجموعہ میرے مطالعہ میں آیا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ یہ کلام الہامی کیفیت کے نزول کا نتیجہ ہے۔ ان کے اشعار میں نرم ونازک جذبات، معصوم احساسات کی بہتات اور فراوانی کا ایک بحر ذخار ٹھاٹھیں مارتا نظر آتا ہے۔

ان کی جادو بیانی، شیریں کلامی اور رنگینی کے مد مقابل شعراء بہت کم دیکھے گئے ہیں۔ وہ کائنات محبت کے ایک انوکھے اور البیلے شہزادے ہیں۔ وہ محبت کے میدان کے عجیب شہسوار ہیں۔ در اصل ایک باکمال شاعر حسن وعشق کی دنیا میں مگن رہتا ہے اور اس کی زندگی کا محور ومرکز صرف حسن وجمال، عفو ومحبت، سرمستی وبیخودی ہوتے ہیں۔ حسن بریلوی سچے عاشق رسول ہیں۔ ان کے اشعار دل کی کیفیات کے ترجمان ہونے کے سبب براہ راست دلوں پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں سوز وگداز، جوش وخروش سادگی وپرکاری کی بھی خوبیاں ہیں۔ رنگینی اور والہانہ پن ان کی شاعری کی جان ہیں۔ ایک ہی مضمون کو ہزار رنگ میں وہ اس ہنرمندی اور سلیقہ سے پیش کرتے ہیں کہ قاری کی طبیعت کبھی سیر نہیں ہوتی۔ انداز بیان کی دلکشی، شیرینی اور حلاوت اپنا جواب آپ ہے۔ ان کی زبان صاف وشستہ، سلیس اور بامحاورہ ہے۔ وہ روزمرہ کے عام فہم الفاظ کا استعمال اس خوبی وبرجستگی سے کرتے ہیں کہ ان کی باریک بینی کا اعتراف وقت کے بڑے بڑے شہرت یافتہ شعراء کو کرنا پڑا۔

حضرت حسن بریلوی نے نعت گوئی کے علاوہ دیگر اصناف سخن مثلاً غزل وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی اور اعلیٰ مقام حاصل کیا جس پر خود ان کا غزلیہ دیوان "ثمر فصاحت" شاہد ہے۔ لیکن نعت گوئی ان کے مزاج میں رچ بس گئی تھی یہی وجہ تھی کہ انہوں نے ہزاروں اشعار رسول پاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں عرض کئے اور یوں اپنی فانی زندگی کو لافانی بنالیا۔

اردو نعت گوئی کی روایت اتنی ہی پرانی ہے جتنی کہ خود اردو شاعری کی۔ آج تک لاکھوں اشعار محبوب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی شان اقدس میں اظہار محبت اور نذرانہ عقیدت

کے طور پر کہے جا چکے ہیں اور نہ جانے کتنے اور کہے جائیں گے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جو کچھ کہا جانا تھا وہ پھر بھی نہیں کہا جا سکا۔ شاعروں نے عجز کا اعتراف کیا تو کہا۔ کچھ بھی نہ کہہ سکے۔ یہی اعتراف عجز نعت گوئی کی جان اور نعت گوئی کا جواز ہے۔

"ذوق نعت" میں مولانا حسن بریلوی نے طرح طرح سے اپنے جذبات و احساسات کا اظہار کیا ہے۔ اور اس طور پر کیا ہے کہ بہت کم شعراء نے ایسا کیا ہوگا لیکن قدم قدم پر محسوس ہوتا ہے کہ شاعر کی پیاس اور اظہار کی تشنگی اسی طرح مینہ کھوئے العطش العطش پکار رہی ہے حقیقت میں یہی عشق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا کرشمہ ہے۔ اس میں شک نہیں کہ حب رسول ہی نعت گوئی کی بنیاد ہے۔ عشق نہ ہو تو انسان راکھ کا ڈھیر ہے اور عشق رسول نہ ہو تو انسان بے حس و بے جان لاش ہے جو معاشرے حب رسول سے سرشار ہیں وہ زندہ و تابندہ ہیں، آزاد ہیں اور جو حب رسول سے نا آشنا ہیں وحشی ہیں، تہذیب سے دور ہیں، انسانیت سے محروم ہیں عشق رسول فصل کو وصل میں تبدیل کر دیتا ہے۔ اور نعتیہ شاعری معیار آدمیت کو فلک افلاک تک لے جاتی ہے۔

"ذوق نعت" کے بارے میں ایک بات یہ بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اس کلام الہامی کو اپنے پاس رکھئے اور ہر روز کوئی نعت پاک پڑھئے، اس کی کیفیات کو اپنے ذہن و فکر میں بساتے ہوئے پڑھتے تو رفتہ رفتہ محسوس کریں گے کہ کلام ہی نہیں بلکہ خود صاحب کلام آپ سے ہم کلام ہے اور روح عشق و محبت آپ کے اندر جلوہ گر ہو رہی ہے۔ حسن کی آواز میں ایک جادو ہے، ایک سحر اور ایک عجیب کشش ہے اور انہیں زبان و بیان پر ایسی قدرت حاصل ہے کہ دیگر شعراء کو شاذ ہی نصیب ہوئی ہوگی۔ در اصل ان کا کلام اپنے اندر ایک والہانہ پن اور ایک ایسی خوبی لئے ہوئے ہے جو پڑھنے والے کو محبوب کی ہر ہر ادا سے ایک دم قریب کر دیتا ہے۔ ان کی پوری نعت ترنم کے ڈھانچے میں ڈھلی اور سنوری ہوئی نکلتی ہے اور فردوس گوش بن کر دلدادۂ نعت کے دل پر بجلی کی طرح گرتی ہے اور دائمی اثرات مرتب کر دیتی ہے۔

مولانا حسن بریلوی میری نظر میں آسمان نعت کے افق پر آفتاب و ماہتاب بن کر جگمگاتے ہیں۔ ان کی تابانی ضوفشانی اور چمک دمک سے لوگوں کی نظریں خیرہ ہیں، ان کی شہرت و مقبولیت دوسرے ہم عصر شعراء سے کم نہیں۔ اسی لئے نعت گو شعراء کی کہکشاں میں حسن نہ صرف منفرد و ممتاز ہیں بلکہ آبروئے شعراء بھی ہیں۔ انہوں نے کلام کو خوب سے خوب تر اور اس کے حسن کو حسین تر بنانے میں اپنا سب کچھ تج دیا۔ حضرت حسن کی شاعری کا مطالعہ اگر ہم وسیع و عمیق تناظر میں کریں تو ہمیں ان کی بنیادی صفت ان کی شاعری میں بآسانی مل جائے گی۔

یوں تو اردو کے تقریباً سبھی شاعروں کے کلام میں ان کے اپنے دور کے محاورے مل جاتے ہیں لیکن اس سلسلے میں حسن بریلوی کی شاعری اپنے اندر قدیم و جدید محاوروں کا سنگم ہے ان کے کلام کو محاوروں کا دریا بھی کہا جاتے تو بے جا نہ ہوگا۔

حسن نے محبوب کی زندگی کے ہر لطیف و نازک پہلو پر نظر ڈالی اور زندگی کی نزاکت و سنجیدگی پر خوب خوب غور و خوض کیا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے کلام میں گہرائی اور گیرائی حد درجہ کی پائی جاتی ہے جو ہر ایک کو دعوت فکر دیتی ہے۔ ان کا کلام زبان و بیان کے جملہ رموز و نکات سے آراستہ ہے۔ اور اس میں لہجے کا بانکپن اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ موجود ہے۔ محبوب و محب کے درمیان راز و نیاز کی جھلکیاں دکھانا، کلام میں عشق محبوب کا انوکھا رنگ بھرنا مولانا حسن بریلوی کا طرۂ امتیاز ہے۔ ان کا رنگ سخن در اصل ان کے استاد داغ کے رنگ کلام کی توسیع ہے۔ مولانا حسن کے نعتیہ کلام پر نظر ڈالنے کے بعد یہ نتیجہ آسانی

سے اخذ کیا جاسکتا ہے کہ وہ زبان و بیان کی روایت کے امین ہیں۔ انہوں نے اپنی شاعری کے وسیلہ اظہار کے لئے محبوب کی محبت کے نئے نئے گوشے تلاش کئے اور اس جہان معنی میں عشق کی باریکیوں اور رمزیاتے الفت کی تزئین سے جدید رنگ و آہنگ کا خوشگوار ماحول پیدا کیا۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

مرادیں مل رہی ہیں شاد شاد ان کا سوالی ہے
لبوں پر التجا ہے ہاتھ میں روضہ کی جالی ہے
تری صورت تری سیرت زمانے سے نرالی ہے
تری ہر ہر ادا پیارے دکیل بے مثالی ہے
وہ جگ داتا ہو تم سنسار باڑے کا سوالی ہے
دیا کر ناکر اس منگتا نے بھی گدڑی بچھالی ہے
حسن کے درد دکھ موقوف فرماکر بحالی دو
تمہارے ہاتھ میں دنیا کی موقوفی بحالی ہے

حضرت حسن بریلوی نے اپنے خداداد کمالات علمیہ سے فن نعت گوئی کو نئی جہتوں سے روشناس کرایا، ارباب علم و فکر کو آگہی کے نئے سورج دکھائے۔ اہل دل کی سونی بستیوں میں آج بھی ایسے عشاق کے تذکروں سے روشنی ہوتی ہے۔ جنہوں نے اپنی متاع زیست کو حضور سرکار مدینہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی مقدس چوکھٹ پر نثار کر دیا اور اہل محبت کے واسطے یقین آفرینی کے نئے دروازے کھول دیے اور یہ سبق عشاق مصطفےٰ جان رحمت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نصاب محبت میں ہمیشہ کے لئے رقم کر دیا کہ محبوب خدا صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی محبت و عظمت ہی جانِ ایمان ہے۔

عربی گو شعراء کے یہاں مدح رسول ایک محبوب دلپسند اور پرکشش موضوع رہا ہے۔ مگر اردو شاعری میں بعض شعراء نے مدح رسول اور فن نعت گوئی کو اپنے لئے حرز جاں اور توشۂ آخرت بنا کر اسے ہر صنف سخن سے زیادہ شیریں اور آسان بنا دیا ہے۔ ان شعراء میں حسن بریلوی کو ایک طرح کی امتیازی شان حاصل ہے۔

حضرت حسن بریلوی اور مناقب صحابہ و اولیاء

مولانا شبنم کمالی پرنسپل جامعہ اسلامیہ امانیہ لوام، دربھنگہ

حضرت حسن بریلوی یقیناً اپنے عہد کے عظیم شاعروں میں سے ایک تھے۔ ان کی بہاریہ شاعری کا دیوان "ثمر فصاحت" ۱۹۰۱ء میں شائع ہوا اور نعتیہ شاعری کا دیوان "ذوق نعت" ۱۹۰۷ء میں شائع ہوا اپنے حسنی پریس سے ماہانہ رسالہ "بہار بے خزاں" اور ہفتہ وار اخبار "روز افزوں" شائع کرنے کے علاوہ بہت سی کتابیں بھی تصنیف فرمائیں وہ داغ دہلوی کے مشہور ترین شاگردوں میں سے ایک قابل قدر شاگرد تھے۔ اس کے باوجود بھی تاریخ ادب اردو (رام بابو سکسینہ) میں ان کا معمولی تذکرہ بھی نہیں جب کہ یہ کتاب ۱۹۲۹ء میں زیور طبع سے آراستہ ہوئی۔ اس کی وجہ یا تو یہ ہو سکتی ہے کہ ان کی معلومات کے جو ذرائع تھے۔ ان ذرائع نے ان کو بے خبر رکھا۔ یا کہ جان بوجھ کر بھی بے اعتنائی برتی گئی۔ جس طرح ان کے بڑے بھائی حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا ذکر شبلی نعمانی اور ندوۃ العلماء کے ضمن میں صرف مخالفین کے طور پر برائے نام کر دیا گیا ہے جب کہ سیکڑوں مذہبی کتابوں کے ذریعہ امام احمد رضؓ نے اردو زبان کی خدمت کی جب کہ ان کے مقابلہ میں معمولی لوگوں کی مذہبی تصانیف کا ذکر اور معمولی کارناموں کا تذکرہ آیا ہے۔

ایسا صرف ایک کتاب ہی پر محدود نہیں بلکہ تاریخ ادب اردو، چاہے وہ نظم کے سلسلہ میں ہو یا نثر کے سلسلہ میں اس وقت سے آج تک اس عنوان سے بہت سی کتابیں لکھی گئیں مگر امام احمد رضا کا ذکر تو رہنے دیا جائے۔ غزل کے ایک عظیم شاعر اور داغ دہلوی کے اس عظیم شاگرد کا بھی ذکر نہیں۔ صرف لالہ سری رام کی تاریخ "خمخانۂ جاوید" جلد دوم اور "چند شعرائے بریلی" نامی کتاب میں حضرت حسن کا ذکر موجود ہے۔ ممکن ہے کسی اور کتاب میں بھی ذکر ہو لیکن جو کتابیں میری نظر سے گذریں وہ ذکر سے خالی ہیں۔ اس کی وجہ اپنوں کی بے توجہی اور بے رخی بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت حسن بریلوی کی وفات کے بعد جو متعلقین اور تلامذہ موجود تھے ان کو مکمل دھیان دینا چاہیے تھا اور کتابیں ضرور لکھنی چاہیے تھی۔ حد تو یہ ہے کہ حضرت حسن کی وفات کا سنہ دونوں مذکورہ بالا کتابوں میں تو ہے مگر مہینہ اور تاریخ معلوم نہیں جبکہ علامہ حسن بریلوی کے متعلقین اگر تلاش و جستجو سے کام لیں تو بہت سی باتیں معلوم کی جا سکتی ہیں۔ حج بیت اللہ شریف کا ہجری سنہ تو ذکر کیا گیا ہے لیکن عیسوی سال مذکور نہیں۔ بہر کیف اس طرف توجہ کی جائے اور پرانی کتابیں تحقیق و تبصرہ میں لائی جائیں۔ تاکہ اپنی فروگذاشت اور بھول کا کچھ تو کفارہ ادا ہو سکے۔

مذکورہ باتیں جو میں نے بر طور تمہید لکھ دی ہیں یہ میرے دل کی آواز ہے۔ اب آیئے "ذوق نعت" جو حسن بریلوی کی نعتیہ شاعری کا دیوان ہے اس میں اشعار مناقبہ اور منقبتوں پر بھی ایک نگاہ ڈال لیں۔ نعتیہ شاعری کے بارے میں پہلے ہی کچھ تحریر کر چکا ہوں۔ مناقب کے بارے میں الگ سے لکھنے کی بات کہی تھی۔ اب وہ قارئین کرام کے پیش نظر ہے۔

نعت گوئی اور منقبت نویسی اسی خوش نصیب شاعر کی قسمت میں ہوتی ہے۔ جس کا دل حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اولیاء کرام کی محبت کا گنجینہ ہو۔ نہ ہر شاعر کا یہ نصیب ہے اور نہ ہر شخص کا

دل اس نعمت کا اہل ہے۔ بے شک و شبہ حضرت حسن ایک صحیح العقیدہ عالم اور اپنے حسن عقیدہ اور مذہب میں راسخ تھے۔ اس لیے اپنی عقیدت و محبت کا اظہار صحابۂ کرام اور اولیائے عظام کی ذوات قدسیہ کے ساتھ پیش کرنے کو وسیلۂ نجات اور توشۂ آخرت سمجھا اور ان مقدس ہستیوں کے ذریعہ بارگاہ رسالت میں حاضری اور شفاعت کی درخواست پیش کی۔ پھر سید عالم نبی محترم صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا ذکر جمیل یہ تو روح سعادت جان کلام اور آبروئے سخن ہے اس لئے یہ تو حمد باری تعالیٰ کے بعد سب سے مقدم رہا۔

"ذوق نعت" میں ذکر شہادت اور اہل بیت کے علاوہ گیارہ عدد مناقب اور بھی موجود ہیں۔ ان گیارہ مناقب پر ترتیب کے ساتھ غور و فکر کر کے ہر ایک سے چند اشعار پیش کرنے اور کچھ روشنی ڈالنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں۔ ملاحظہ فرمائیں۔

چاروں خلفائے راشدین، اصحاب اربعہ کے لئے الگ الگ مناقب موجود ہیں۔ سیدنا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ خلیفۂ اول کی شان گرامی میں جو منقبت ہے ظاہر ہے معنویت اور زور بیان کے اعتبار سے تقدم کی حیثیت رکھتی ہے۔

منقبت خلیفۂ اول رضی اللہ عنہ

اس منقبت سے میں نے جو چند شعر نمونہ اور اختصار کے پیش نظر منتخب کئے ہیں وہ یہ ہیں۔ ؎

بیاں ہو کس زباں سے مرتبہ صدیق اکبر کا
ہے یار غار محبوب خدا صدیق اکبر کا
نبی کا اور خدا کا مدح گو صدیق اکبر ہے
نبی صدیق اکبر کا خدا صدیق اکبر کا
ہوئے فاروق و عثمان و علی جب داخل بیعت
بنا فخر سلاسل سلسلہ صدیق اکبر کا
مقام خواب راحت چین سے آرام کرنے کو
بنا پہلوئے محبوب خدا صدیق اکبر کا

مذکورہ چار شعروں میں جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل واضح ہے اور واقعہ کے عین مطابق ہے۔ دو شعر اس منقبت کے اور بھی ملاحظہ فرمائیں۔ پہلے شعر میں ان نادانوں کو تنبیہ کی گئی ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کی محبت کا دعویٰ کرتے ہیں اور حضرت صدیق و فاروق سے تبرا کرتے ہیں۔ ایسی محبت اور ایسی دشمنی بے فائدہ ہے اور دوسرے شعر میں حضرت صدیق اکبر کی محبت و سخاوت اور جاں نثاری کا ذکر ہے ؎

علی ہیں اس کے دشمن اور وہ دشمن علی کا ہے
جو دشمن عقل کا دشمن ہوا صدیق اکبر کا
لٹایا راہ حق میں گھر کئی بار اس محبت سے
کہ لٹ لٹ کر حسنؔ گھر بن گیا صدیق اکبر کا

منقبت خلیفۂ دوم رضی اللہ عنہ

سیدنا عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی تعریف و توصیف میں جو منقبت لکھی گئی ہے اس کا انداز بھی جداگانہ ہے۔ اس نظم میں رافضیوں اور خارجیوں کی تردید و ملامت بھی ہے۔ یہ وہ جماعتیں ہیں جنھوں نے شان فاروقی میں گستاخیاں کی ہیں اور اپنا ٹھکانا بری جگہ بنالیا ہے۔ ہر شعر میں واقعہ نگاری اور حقیقت موجود ہے۔ ؎

نہیں خوش بخت محتاجان عالم میں کوئی ہم سا
ملا تقدیر سے حاجت روا فاروق اعظم سا
ترا رشتہ بنا شیرازۂ جمعیتِ خاطر
پڑا تھا دفتر دین کتاب اللہ برہم سا
غضب میں دشمنوں کی جان ہے تیغ سرافگن سے
خروج و رفض کے گھر میں نہ کیوں برپا ہو ماتم سا
شیاطین مضمحل ہیں تیرے نام پاک کے ڈر سے
نکل جائے نہ کیوں رفاض بد اطوار کا دم سا

جلال فاروقی اور ان کی ہیبت و عظمت ایمانی کا سکہ قلوب عالم پر ہے۔ ان کے ایمان، عدل، جذبہ مجاہدانہ اور فروغ اسلام کی خاطر قربانی و جاں نثاری

سے اسلام کو جو سربلندی حاصل ہوئی وہ مسلم ہے کافروں
بے دینوں اور گمراہوں کے گھروں میں یقیناً تیغ فاروقی
کے خوف سے پہلے بھی ماتم تھا اور آج بھی ماتم ہے۔ اس
کا ایک نقش ان اشعار میں موجود ہے۔ پھر ایک شعر ان
لوگوں کے لئے تازیانہ ہے جو حضرت عمر فاروق رضی اللہ
تعالےٰ عنہ کی شہادت کے مہینہ اور دن ـــ ذی الحجہ
میں عید اور مناتے ہیں ؎

منائیں عید جو ذی الحجہ میں تیری شہادت کی
الٰہی روز و ماہ و سن انھیں گذرے محرم سا

یہ شعر ذو معنیین (دو معنی والا) شعر ہے۔ پہلا معنی
تو یہ ہے کہ جس طرح وہ لوگ محرم میں شہدائے کربلا کا
غم مناتے ہیں اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ
کی شہادت کا غم جائز طریقہ سے عقیدت و عظمت کیساتھ
منائیں ـــ مقطع کا شعر فارسی میں ہے ؎

حسن در عالم پستی سر رفعت اگر داری
بیا فرق ارادت بر در فاروق اعظم سا

اے حسن اگر تو اس عالم پستی (دنیائے دنی) میں
بلندی کی خواہش رکھتا ہے تو آ اور حضرت فاروق اعظم
کے در پر اپنی ارادت کی پیشانی کو مل۔ جبیں سائی کر
یہ ان کی عقیدت و محبت کا اظہار ہے۔

منقبت خلیفہ سوم رضی اللہ عنہ

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی منقبت سے صرف
پانچ شعروں کا انتخاب پیش ہے۔ پہلے شعر میں ان کی
شہادت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ان کے رخسار
کو خون سے رنگین کہا۔ اور ان کے رخسار کے شیدائیوں
میں گلزار اسلام کے ہر پھول کو بلبل کی طرح ظاہر کیا ہے
تشبیہ بڑی پیاری ہے ملاحظہ کیجئے ؎

رنگین وہ رخسار ہے عثمان غنی کا
بلبل گل گلزار ہے عثمان غنی کا
جو دل کو ضیا دے جو مقدر کو جلا دے
وہ جلوۂ دیدار ہے عثمان غنی کا
جس آئینہ میں نور الٰہی نظر آئے
وہ آئینہ رخسار ہے عثمان غنی کا
بیمار ہے جس کو نہیں آزار محبت
اچھا ہے جو بیمار ہے عثمان غنی کا
اللہ غنی حد نہیں انعام و عطا کی
وہ فیض پہ دربار ہے عثمان غنی کا

منقبت خلیفہ چہارم رضی اللہ عنہ

مولائے کائنات سیدنا حضرت علی رضی اللہ عنہ
کی شان میں جو منقبت کہی گئی ہے وہ انداز جمال
اور شاعرانہ کمال کی تصویر دل پذیر معلوم ہوتی ہے۔
رنگ بھی انوکھا اور نرالا ہے اس منقبت کے چار
شعر پہلے پیش نظر رکھئے ؎

اے حب وطن! ساتھ نہ یوں سوئے نجف جا
ہم اور طرف جاتے ہیں تو اور طرف جا
پھنستا ہے وبالوں میں عبث اختر طالع
سرکار سے پائے گا شرف بہر شرف جا
اے کلفت غم بندہ مولیٰ سے نہ رکھ کام
بے فائدہ ہوتی ہے تری عمر تلف جا
اے طلعت شہ آ تجھے مولیٰ کی قسم آ
اے ظلمت دل جا تجھے اس رخ کا حلف جا

ان چاروں شعر کی فصاحت، بلاغت معنویت
اور ندرت قابل قدر اور لائق تحسین ہے۔ اختر طالع
اور شرف کا لطف وہی محسوس کر سکتے ہیں جو علم نجوم
سے کچھ شغف رکھتے ہوں۔ تین اور دو دوسرے اشعار بدعقیدہ
اور گمراہ طبقہ کے لئے سرزنش بھی ہیں اور باعث ہدایت
بھی ان پر بھی توجہ خصوصی کیجئے ؎

جیلاں کے شرف حضرت مولیٰ کے خلف ہیں
اے ناخلف اٹھ جانب تعظیم خلف جا
تفضیل کا جویا نہ ہو مولیٰ کی ولا میں

یوں چھوڑ کے گو ہر کو نہ تو بہر خذف جا
مولیٰ کی امامت سے محبت ہے تو غافل
ارباب جماعت کی نہ تو چھوڑ کے صف جا

استغاثہ

حضور سیدنا غوث اعظم رضی اللہ عنہ کی منقبت میں چار نظمیں موجود ہیں۔ چاروں میں تین نظموں کا انداز تقریباً یکساں ہے۔ ہر ایک میں تعریف و توصیف اور فضائل بیان کرتے ہوئے امداد کی درخواست کی گئی ہے چند شعر ملاحظہ کریں۔ ؎

پڑے مجھ پہ نہ کچھ افتاد یا غوث
مدد پر ہو تری امداد یا غوث
اڑے تیری طرف بعد فنا خاک
نہ ہو مٹی مری برباد یا غوث
خمیدہ سر گرفتار قضا ہے
کشیدہ خنجر جلاد یا غوث
رہوں آزاد قید عشق کب تک
کرو اس قید سے آزاد یا غوث
حسن منگتا ہے دے دے بھیک داتا
خدارا کر دے مجھ کو شاد یا غوث

منقبت حضور غوث اعظم

اس عنوان سے دو نظمیں ایک بڑا جگہ موجود ہیں اس کی وجہ دونوں کا ایک ہی ردیف میں ہونا ہے۔ پہلی نظم کے چند شعر پیش نظر رکھیں ؎

اللہ برلائے غوث اعظم — دے مجھ کو ولائے غوث اعظم
سوکھی ہوئی کھیتیاں ہری کر — اے ابر سخائے غوث اعظم
آئینۂ روئے خوبرویاں — نقش کف پائے غوث اعظم
اے غم جو ستائے اب تو جاؤں — لے دیکھ وہ آئے غوث اعظم
تارِ نفس ملائکہ ہے — ہر تار قبائے غوث اعظم
سب کھول دے عقدہ ہائے مشکل — اے ناخن پائے غوث اعظم

• عقیدت قلبی کے مظاہرہ کے ساتھ والہانہ محبت اور اپنی دلی کیفیات کا اظہار بھی مذکورہ اشعار میں موجود ہے تمثیلات یا تشبیہات جو دی گئی ہیں وہ بھی نمایاں ہیں۔ غوث اعظم کے نقش کف پا کو خوبصورت چہرہ والوں کے چہرہ کا آئینہ کہا گیا ہے۔ اسی طرح دوسرے شعر میں حضور غوث اعظم کی قبائے جمیل کے ہر تار کو فرشتوں کی روح کا تار یعنی ان کی سانسوں کی آمد و رفت کا سلسلہ بیان کیا گیا ہے۔

مشکل کشا غوث اعظم

تیسری منقبت کی خصوصیت یہ ہے کہ اردو میں اکثر اشعار ہونے کے ساتھ ہی چند شعر فارسی میں بھی ہیں اور چند ہندی میں بھی۔ تینوں زبانوں سے چند شعر کا انتخاب پیش ہے۔ اس منقبت کا دو شعر پہلے ملاحظہ کریں۔

اسیروں کے مشکل کشا غوث اعظم
فقیروں کے حاجت روا غوث اعظم
جسے خلق کہتی ہے پیارا خدا کا
اسی کا ہے تو لاڈلا غوث اعظم

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا نے بھی اپنی ایک نعت پاک کے مقطع میں حضور غوث اعظم کو سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کا لاڈلا بیٹا کہا ہے ؎

تیری سرکار میں لاتا ہے رضا اس کو شفیع
جو مرا غوث ہے اور لاڈلا بیٹا تیرا

اس لئے لاڈلا کا استعمال صحیح اور درست ہے اب حضرت حسن بریلوی کے دوسرے اشعار ملاحظہ فرمائیں

کیا غور جب گیارھویں بارھویں میں
معما یہ ہم پر کھلا غوث اعظم
تمہیں وصل بے فصل ہے شاہ دیں سے
دیا حق نے یہ مرتبہ غوث اعظم

لپٹ جائیں دامن سے اس کے ہزاروں
پکڑ لے جو دامن ترا غوث اعظم

فارسی کے اشعار

فقیر تو چشم کرم از تو دارد ٭ بنگاہ بحالِ گدا غوث اعظم
کمر بست بر خون من نفس قاتل ٭ اغثنی برائے خدا غوث اعظم
گدایم گدا از گدایانِ شاہے ٭ کہ گویندش اہل صفا غوث اعظم

ہندی کے اشعار

اودھر میں پیا موری ڈولت ہے نیا
کھیون کا سے اپنی ہتھیا غوث اعظم
بپت میں کٹی موری سگری عمریا
کرو موپہ اپنی دیا غوث اعظم
بھیو دو جو بیکنٹھ بغداد تو سے
کہو موری نگری بھی آ غوث اعظم

ہندی کے اشعار میں بھی ادب کا پہلو نمایاں ہے۔ زبان و قلم نے کہیں لغزش نہیں کھائی نہیں کھائی ہے۔ فارسی کے اشعار شاعر محترم کی زبانِ فارسی میں مہارت کو واضح کرتی ہے۔ منقبت کا جو مقصود اصلی ہے وہ بھی آشکارا ہے۔

نغمہ روح ۱۳۰۹ھ استمداد از حضرت سلطان بغداد رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عنوان سے ایک نظم مسدس ہے جس کے ہر بند کا پانچواں اور چھٹا مصرع فارسی کا بس ایک ہی شعر ہے۔ وہ شعر یہ ہے

روئے رحمت بر متاب اے کامِ جاں از روئے من
حرمتِ روحِ پیمبر یک نظر کن سوئے من

اب اس نظم کا صرف دو بند ہی زیب نگاہ بنایئے اور شاعرانہ عروج وارتقار کا نظارہ کیجئے۔ فصاحت و بلاغت اور عقیدت کا والہانہ انداز تو آپ محسوس ہی کریں گے لیکن محاسن شاعری میں بھی کوئی کمی نہیں پائیں گے۔ ؎

اے کریم ابن کریم اے رہ نمائے مقتدا
اختر برج سعادت گوہر درج عطا
آستانہ پر ترے حاضر ہے یہ تیرا گدا
لاج رکھ لے دست و دامن کی مرے بہر خدا
روئے رحمت بر متاب اے کامِ جاں از روئے من
حرمت روحِ پیمبر یک نظر کن سوئے من

شاہ اقلیم ولایت سرور کیواں جناب
ہے تمہارے آستانے کی زمیں گردوں جناب
حسرتِ دل کی کشاکش سے ہیں لاکھوں اضطراب
التجا مقبول کیجئے اپنے سائل کی شتاب
روئے رحمت بر متاب اے کامِ جاں از روئے من
حرمت روحِ پیمبر یک نظر کن سوئے من

منقبت حضرت خواجہ غریب نواز

سلطان الہند خواجۂ خواجگاں حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رضی اللہ عنہ سے محبت و عقیدت تو ہر مسلمان کے دل میں ہے خاص کر ہندوستان کے رہنے والے مسلمانوں کی عقیدت و محبت کے وہ مرکز خصوصی ہیں۔ چاہے زبان سے کوئی اس کا اظہار کرے یا نہ کرے مگر اس حقیقت سے انکار ممکن نہیں۔ حسن بریلوی نے بھی حضرت خواجہ غریب نواز کی شان میں منقبت کہی ہے چند اشعار پیش ہیں ؎

خواجہ ہند وہ دربار ہے اعلیٰ تیرا
کبھی محروم نہیں مانگنے والا تیرا
مئے سر جوش در آغوش ہے شیشہ تیرا
بے خودی چھائے نہ کیوں پی کے پیالہ تیرا
تجھ میں ہیں تربیت خضر کے آثار پیدا
بحر و بر میں ہمیں ملتا ہے سہارا تیرا
ظل حق غوث پہ ہے غوث کا سایہ تجھ پر
سایہ گستر سر خدام پہ سایہ تیرا
کرسی ڈالی تری تخت شہ جیلاں کے حضور
کتنا اونچا کیا اللہ نے پایہ تیرا

باقی ص ۱۹۷

محی دیں غوث ہیں اور خواجہ معین الدین ہیں
اے حسن کیوں نہ ہو محفوظ عقیدہ تیرا

پوری نظم سے چند شعروں کے پیش کرنے کا مقصد اختصار بھی ہے اور اہل علم و دانش کے لئے ایک نمونہ سامنے رکھنا ہے۔ شاعر محترم نے اپنی اس نظم میں واقعات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ تیرا شیشہ مئے سرجوش کو آغوش میں لئے ہوا ہے، تجھ میں تربیت خضر کے آثار ظاہر ہیں تیری کرسی شہ جیلاں کے سامنے اللہ تعالیٰ نے ڈالی۔ یہ اہم واقعات کی رونمائی کرتے ہیں۔ اسی طرح دوسرے اشعار میں بھی اہم باتیں پیش کی گئی ہیں جو دیکھنے سے تعلق رکھتی ہیں۔ بہرکیف یہاں بھی قادر الکلامی اپنے اوج پر دکھائی دیتی ہے۔

منقبت حضرت شاہ بدیع الدین

اس عنوان سے ایک نظم مسدس اس کتاب میں موجود ہے۔ یہاں بھی پانچواں چھٹا مصرعہ فارسی میں ہے جو ہر بند میں موجود ہے۔ یہاں شاعرانہ فن بھی آب و تاب کے ساتھ دکھائی دیتا ہے جسے قاری محسوس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں صرف دو بند ہی اکتفا کرتا ہوں ملاحظہ فرمائیں ؎

ہوا ہوں دادِ ستم کو میں حاضر دربار
گواہ ہیں دل محزون و چشم دریا بار
طرح طرح سے ستاتا ہے زمرۂ اشرار
بدیع بہر خدا حرمتِ شہ ابرار
مدار چشم عنایت زمن دریغ مدار
نگاہ لطف و کرم از حسن دریغ مدار

تمہارے وصف و ثنا کس طرح سے ہوں مرقوم
کہ شان ارفع و اعلیٰ کسے نہیں معلوم
ہے زیر تیغ الم مجھ غریب کا حلقوم
ہوئی ہے دل کی طرف یورش سپاہ ہموم
مدار چشم عنایت زمن دریغ مدار
نگاہ لطف و کرم از حسن دریغ مدار

منقبت حضور اچھے میاں

حضرت کا وطنی اور نسبی تعلق مارہرہ مقدسہ سے ہے۔ ان کا اسم گرامی ابوالفضل آل احمد ہے اور حضرت اچھے میاں (علیہ الرحمۃ والرضوان) کی عرفیت سے شہرت حاصل ہے۔ اعلیٰ حضرت امام احمد رضا رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی منقبت میں نظم لکھی ہے جو "حدائق بخشش" جلد دوم میں موجود ہے۔ شجرۂ عالیہ قادریہ برکاتیہ میں اعلیٰ حضرت نے حضرت کا ذکر اس طرح فرمایا ہے ؎

دل کو اچھا تن کو ستھرا جان کو پرنور کر
اچھے پیارے شمس دیں بدر العلےٰ کے واسطے

اس کے بعد امام احمد رضا نے اپنے پیر و مرشد کا متصلاً یوں ذکر فرمایا ہے۔ ؎

دو جہاں میں خادم آل رسول اللہ کر
حضرت آل رسول مقتدا کے واسطے

خانوادہ برکاتیہ مارہرہ شریف کے روشن چراغوں میں حضرت اچھے میاں رحمۃ اللہ علیہ کی ذات گرامی بھی ہے۔ اور یہ امام احمد رضا کے دادا پیر ہیں۔ اسی لئے اعلیحضرت نے بارہا ان کا تذکرہ اپنے اشعار میں فرمایا ہے۔ حضرت حسن بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے بھی ان کی شان میں منقبت لکھی ہے جس میں اپنے برادر اکبر امام احمد رضا کا بھی تذکرہ کیا ہے چند شعر ملاحظہ کریں ؎

سن لو میری التجا اچھے میاں
میں تصدق میں فدا اچھے میاں
اس برے کو آپ اچھا کیجئے!
آپ اچھے میں برا اچھے میاں
دم قدم کی خیر منگتا ہوں ترا
دم قدم کی خیر لا اچھے میاں
احمد نوری کا صدقہ ہر جگہ
منہ اجالا ہو مرا اچھے میاں

استاذ زمن علم و عمل، اور فکر و فن کے عظیم پیکر

مولانا محمد ادریس رضوی خطیب و امام جامع مسجد بنیرہ پل کلیان

چھوٹا بڑوں کا نقال ہوتا ہے۔ بچے اسی طرز روش کو اپناتے ہیں جو والدین کا وتیرہ ہوتا ہے۔ ان کے اخلاق و اطوار میں رنگ و بو کی وہی آمیزش متشکل ہوتی ہے جو خاندان اور معاشرت کا طریقہ رہتا ہے۔ صحبت اچھی ہو یا بری وہ اپنے اندر غایت درجہ کا اثر رکھتی ہے۔ مثل مشہور ہے۔ "صحبت صالح ترا صالح کند، صحبت طالح ترا طالح کند"

اچھی اور نیک صحبت آدمی کے تخیل میں بلندی، فکر و نظر میں پختگی اور طرز و روش میں نفاست پیدا کر دیتی ہے۔ اور بری صحبت سے خیالات اسفل، فکر پراگندہ قوت ارادی میں لاابالی اور قول و فعل میں اوباشی کا عنصر پیدا ہوتا ہے۔ خواندہ اور ناخواندہ دونوں طرح کے لوگ صحبت سے متاثر ہوتے ہیں۔ جس کی واضح جھلک ان لوگوں میں دیکھنے کو ملتی ہے جو ایک ملک سے نکل کر دوسرے ممالک میں ملازمت یا تجارت کی غرض سے عارضی طور پر سکونت اختیار کرتے اور سال دو سال کے بعد واپس آتے ہیں تو وہاں کے رہن سہن اور طور طریقے کو ہی اپنا کر نہیں آتے بلکہ زبان و ادب، تہذیب و تمدن کی خوشبو میں ڈوبے ہوئے ہوتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدمی کو جیسا ماحول ملتا ہے اسی کے قالب میں ڈھلتا چلا جاتا ہے۔ بچہ اپنی پیدائش کے وقت سے عمر کے ابتدائی چند سالوں تک عقل و شعور سے بالکل عاری اور نیک و بد کی تمیز سے غافل ہوتا ہے مگر بڑھتی عمر کے ساتھ آہستہ آہستہ اپنے ارد گرد کے جزو و کل سے واقف ہوتا جاتا اور اسے اپنے سادہ ذہن پر چسپاں کرتا چلا جاتا ہے۔ اور آگے چل کر اسی سُر میں اپنی تال بجاتا رہتا ہے۔ اس بھری دنیا میں نظر دوڑاتے اپنے گرد و نواح کا جائزہ لیجیے۔ کوئی عابد تو کوئی جاہل، کوئی راست باز تو کوئی بے راہ رو، کوئی شرم و حیا کا پتلا تو کوئی بے حیائی اور بے شرمی کا مجسمہ، کوئی قرآن و سنت کا حامل تو کوئی گندہ اور فحش لٹریچر کا شائق، کوئی شرافت و پاکیزگی اور بزرگی میں یکتا تو کوئی ان صفتوں کا دشمن، کوئی مظلوموں کا حامی تو کوئی ظالموں کا دوست، کوئی صنف نازک کی عزت و ناموس کا محافظ تو کوئی عفت و عصمت کو تخت و تاراج کرنے والا، کوئی خیر کا خواہاں تو کوئی شر کا داعی، کوئی نیکی کا حریص تو کوئی بدی کا موجد، کوئی باادب تو کوئی بے ادب یہ تضاد صفتیں ماحول و معاشرے کی دین ہیں۔

علم و ہنر کا پروردہ اپنے فن کی بدولت جانوروں کو سدھا کر اپنے تابع کر لیتا ہے لیکن اس کے بچپنے کو تعلیم و تربیت سے پرے ہٹا کر اگر جانوروں کے غول میں چھوڑ دیا جاتا تو وہ جانوروں کے عادات و اطوار کی خو کو اختیار کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ چنانچہ ماہنامہ "زیب و زینت" کی مدیرہ اداریہ میں لکھتی ہیں۔

"جہاں تک یاد داشت کا تعلق ہے یہ واقعہ غالباً ۱۹۵۲ء یا ۱۹۵۳ء کا ہے کہ اترپردیش کے صدر مقام لکھنؤ کے گرد و نواح میں ایک ایسا انسانی بچہ بھیڑیے کے غار میں پروان چڑھا تھا جو بھیڑیوں کی طرح چلتا پھرتا، بولتا کھاتا پیتا تھا۔ چند شکاریوں کے ذریعہ حاصل کر کے

ہسپتال میں داخل کیا گیا تھا۔ اس کی تعلیم و تربیت کی
بہت کوشش کی گئی مگر سب بے سود، یہ بچہ اخلاقی لحاظ
سے تو درکنار ظاہری حرکات و سکنات کے اعتبار سے
بھی انسان نہ بن سکا یہ المیہ اس لئے پیش آیا کہ اس بچے
کو ابتدا میں انسان بننے کی تربیت نہیں ملی تھی۔"

اس واقعہ کے مثال سے آپ گھر اور والدین کی
تعلیم و تربیت کی اہمیت کو سمجھ سکتے ہیں۔ تعلیم و تربیت
کے ماہرین کہتے ہیں اور صحیح کہتے ہیں کہ بچہ پیدا ہوتے ہی
خارجی دنیا سے سیکھنا شروع کر دیتا ہے۔ ابتدائی چند
سالوں میں بچہ جو کچھ اپنے ماحول سے جذب کرتا ہے
وہ اس کی آئندہ کی ساری زندگی کی اساس و بنیاد بنتا ہے
زبان و طرز معاشرت ہی میں نہیں۔ اخلاق، عمل، تہذیب اور
مذہب میں بھی بچہ اپنے والدین اور گھریلو ماحول کے تابع
ہوتا ہے۔" ص ۵ دسمبر ۱۹۹۱ء دہلی۔

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں یہ بات بالکل عیاں
ہو جاتی ہے کہ والدین کے طرز و عمل، خویش و اقارب کے
اخلاق و عادات اور معاشرتی ماحول کے رنگ و بو سے
بچہ خاطر خواہ اثر لیتا اور انہیں کے انداز و ادا کو اپنے
زندگی کا محور بنانے کی کوشش میں دلچسپی لینے لگتا ہے۔
چنانچہ نیک اوصاف کی مصاحبت کسی نعمت عظمیٰ سے کم
نہیں ہے جو طبیعت میں عابدیت و صالحیت کا جذبہ، علم و
عمل کا شوق، نیکی و تقویٰ کی لگن اور زہد و پارسائی کی
خو پیدا کرتی ہے۔ لہٰذا استاد زمن حضرت حسن رضا
بریلوی جن کا تذکرہ اصل مقصد ہے۔ ۱۲۷۶ھ / ۱۸۶۰ء
میں بریلی کے مولانا نقی علی خاں کے گھر میں پیدا ہوتے۔
مولانا خود فقیہ وقت، عالم باعمل اور صوفی باصفا تھے۔
ان کا خاندان علمی لیاقتوں سے معمور، اتباع شریعت و سنت
میں مقبول، طہارت و تقویٰ کے لئے معروف، خلوص و
للہیت، سخاوت و مروت کے لئے مشہور اور شعر و
سخن میں شہرہ آفاق تھا اور ہے۔ علم و ادب، فصاحت
و بلاغت اور طہارت و تقدس کے ایسے عطر بیز ماحول
میں آنکھیں کھولنے والے کا گنجینہ اوصاف ہو جانا اور
علم و حکمت پر دسترس حاصل کر کے استاد زمن بن
جانا کوئی دشوار امر نہیں تھا۔ جو علم و فضل، زہد و کمال
اور شرافت و پاکیزگی کے گہوارہ میں رہ کر اسلام کے
روح پرور اور دل نواز نغموں کی لوریاں سنی ہوں، جسے
مولانا نقی علی خاں جیسی باکمال ہستی نے اپنے سایۂ عاطفت میں
رکھ کر علوم ظاہری کا درس دیا ہو اور خلوت میں بیٹھا کر
علوم باطنی سے سنوارا ہو اسے تو امتیازی شان پر متصرف
ہونا ضروری تھا۔

مزید تعلیم و تربیت

مولانا نقی علی خاں نے اپنے
نور نظر حضرت حسن رضا کو
مزید تعلیم و تربیت حاصل
کرنے کی غرض سے اپنے خلف الرشید امام احمد رضا
جیسی عبقری شخصیت کے سپرد کر دیا جو خود گوناگوں
صفتوں کے مالک، محبت و اخوت اور انسیت و ہمدردی
کے پیکر اور متعدد علوم و فنون کے ماہر تھے۔ آپ کی
صحبت سے حضرت حسن نے خوب اکتساب فیض کیا۔
چنانچہ آپ کے صاحبزادے مولانا حسنین رضا خاں
مولانا حسرت موہانی کے حوالہ سے رقم کرتے ہیں۔

"حکیم سید برکت علی صاحب نامی بریلوی (شاگرد حسن)
اپنے استاد کے "تذکرہ مختصر" میں لکھتے ہیں کہ "یہ اپنے
پدر بزرگوار اعلیٰ حضرت امام العلماء حضور سیدنا مولانا مولوی
نقی علی خاں صاحب قدس سرہ العزیز کے خزائن علم و عقل
سے مستفیض تھے اور جواہر معانی و فضل سے بہرہ ور تھے۔
علاوہ بریں بریلی میں اپنے اخی معظم مرکز دائرہ علوم،
مجدد مائۃ حاضرہ عالم اہل سنت حضرت مولانا حاجی مفتی
جناب محمد احمد رضا خاں صاحب قبلہ ادام اللہ تعالیٰ
برکاتہم و افضالہم کی فیض صحبت سے فیض معنوی حاصل
کیا کئے۔" (سیرت اعلیٰ حضرت ص ۱۴)

زمانہ طالب علمی ہی سے شاعری کا شوق غالب تھا
جو تکمیل علوم کے بعد بالکل نکھر گیا۔ اب اس کے لئے
زبان و ادب کے استاد کامل کی ضرورت تھی جو اشعار
میں اعلیٰ پھبن اور جدت طرازی پیدا کرنے کی راہ

بتا کر اپنی تصدیق کی سند عطا کر دے۔ لہٰذا آپ کی نگاہ فصیح الملک بلبل ہند مرزا داغ دہلوی پر جا ٹھہری۔ اور رامپور کے لئے روانہ ہو گئے۔ عرصہ دراز تک داغ کو اپنا کلام دکھاتے رہے۔ اسی تعلق سے رئیس المتغزلین مولانا حسرت موہانی لکھتے ہیں کہ۔ "شعر و سخن کا شوق حضرت حسن کو ابتداء ہی سے تھا۔ کچھ روز تک بطور مشق کرتے رہے۔ اس کے بعد مرزا داغ کو اپنا کلام دکھانا شروع کر دیا اور ایک مدت تک رامپور میں رہ کر استاد کے گلشن سخن سے گل چینی فرماتے رہے یہاں تک کہ بجائے خود استاد مستند قرار پائے۔" (اردوئے معلیٰ علی گڑھ جون ۱۹۱۲ء بحوالہ سیرت اعلیٰحضرت ص)

استاد زمن فکر و فن کے آئینے میں

حضرت حسن رضا بریلوی نے فصیح الملک داغ دہلوی کی شاگردی میں رہ کر شعر گوئی کے میدان میں کمال حاصل کیا عشقیہ شاعری میں "ثمرۂ فصاحت" اور نعتیہ دیوان میں "ذوق نعت" یادگار ہے۔ آپ نے حمد و نعت، منقبت غزل، مثنوی، رباعی، تاریخ قصائد غرض ہر صنف شعر میں طبع آزمائی کر کے ان پر عبور حاصل کیا تھا۔ آپ کا کلام کیف آوری اور اثر انگیزی کا بہترین نمونہ ہے۔ حمد و نعت میں قرآن و حدیث کے ترجمے اور مفہوم کو انتہائی شائستگی اور عمدگی سے منظوم کی شکل میں پرو دیا ہے کہ پڑھنے والوں پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ نے قرآن حکیم میں بندوں کو مخاطب کرتا ہے۔ ونحن اقرب الیہ من حبل الورید ۵

ترجمہ:۔ اور ہم دل کی رگ سے بھی اس سے بھی زیادہ... نزدیک ہیں۔ مگر بندہ اس کے دیکھنے سے عاجز و قاصر ہے۔ حضرت حسن اس رمز کو یوں بیان کرتے ہیں۔

(۱) شہ رگ سے کیوں وصال ہے آنکھوں سے کیوں حجاب
کیا کام اس جگہ خرد ہرزہ تاز کا!

(۲) دشت ایمن میں مجھے خاک نظر آئے گا
مجھ میں ہو کر نظر آتا نہیں جلوہ تیرا

(۳) برق دیدار ہی نے تو یہ قیامت توڑی
سب سے ہے اور کسی سے نہیں پردہ تیرا

(۴) سارے عالم کو تو مشتاق تجلی پایا
پوچھنے جائے اب کس سے ٹھکانہ تیرا

(۵) نئے انداز کی خلوت ہے یہ اے پردہ نشیں
آنکھیں مشتاق رہیں دل میں ہو جلوہ تیرا

حضرت موسیٰ علیہ السلام مدین سے مصر کی طرف اپنی والدہ سے ملنے کے لئے آرہے تھے آپ کی اہلیہ محترمہ ساتھ میں تھیں۔ موسم سرما اپنے شباب پر تھا۔ آگ کی تلاش تھی۔ وادی طویٰ میں ایک مقام پر آگ نظر آئی۔ اس تاریخی واقعہ کا ذکر قرآن حکیم میں موجود ہے۔

اِذْ رَاٰ نَارًا فَقَالَ لِاَهْلِهِ امْكُثُوْۤا اِنِّیْۤ اٰنَسْتُ نَارًا ۵

ترجمہ:۔ جب اس، موسیٰ علیہ السلام نے ایک آگ دیکھی تو اپنی بی بی صاحبہ سے کہا ٹھہرو مجھے ایک آگ نظر پڑی ہے۔ قریب گئے تو آواز آئی۔ انی انا ربک فاخلع نعلیک ۵ ترجمہ:۔ بے شک میں تیرا رب ہوں تو تو اپنے جوتے اتار ڈال۔ یہ روشنی آگ نہیں بلکہ تمہارے رب کا جلوہ ہے۔ اس واقعہ کو حضرت حسن بریلوی اپنے کلام میں اس طرح سمجھاتے ہیں۔

پھر نمایاں جو سر طور ہو جلوہ تیرا
آگ لینے کو چلے عاشق شیدا تیرا

اللہ تعالیٰ سے کلام کرنے کا سلسلہ جب شروع ہو گیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ایک روز اپنی تمنا ظاہر کی۔ "اے رب مجھے اپنا دیدار دکھا کہ میں تجھے دیکھوں فرمایا تو مجھے ہرگز نہ دیکھ سکے گا۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ۔ یہ اگر اپنی جگہ ٹھہرا رہا تو عنقریب تو مجھے دیکھ لے گا۔

اس مفہوم کو حضرت حسن بریلوی بڑے اچھوتے انداز میں بیان کرتے ہیں۔ ؎

طور پر جلوہ دکھایا ہے تمنائی کو
کون کہتا ہے کہ اپنوں سے ہے پردہ تیرا

لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے رب کے نور کی تاب برداشت نہ کر سکے اور غش کھا کر گر پڑے۔ اس واقعہ کے تعلق سے حضرت حسن بریلوی یوں گویا ہوتے ہیں ؎

ارنی کوتے سر طور سے پوچھے کوئی
کس طرح غش میں گراتا ہے تجلی تیرا
غش آگیا کلیم سے مشتاق دید کو
جلوہ بھی بے نیاز ہے اس بے نیاز کا
طور کا ڈھیر ہوا غش میں پڑے ہیں موسیٰ
کیوں نہ ہو یار کہ جلوہ ہے یہ جلوہ تیرا

اس طرح کی تمثیلات جا بجا آپ کے کلام میں پائی جاتی ہیں جس پر الگ سے وقت صرف کرنے کی ضرورت ہے الغرض استاد زمن کا کلام بڑا ہی صاف ستھرا، وجد آفریں اور سچائی کا مظہر ہے۔ جس پر اعلیٰ حضرت کو بھی اعتماد تھا۔ لہذا ایک سائل نے سوال کیا کہ محرم کی مجالس میں جو مرثیہ خوانی ہوتی ہے سننا چاہیے یا نہیں؟۔ اس کے جواب میں اعلیٰ حضرت نے فرمایا مولانا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی کتابیں جو عربی میں ہیں یا میرے بھائی حسن میاں مرحوم کی کتاب "آئینہ قیامت" میں صحیح روایات ہیں انہیں سننا چاہیے۔ باقی غلط روایات کے پڑھنے سے نہ پڑھنا اور نہ سننا بہتر ہے۔ (الملفوظ ۲)

استاد زمن حضرت حسن بریلوی کو عشق رسول صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی دولت وراثت میں ملی تھی وہ اپنے والد مولانا نقی علی خاں اور بھائی امام احمد رضا خاں کی طرح عشق رسول میں سرشار تھے انھیں محبوب کی جدائی مرغ بسمل کی طرح تڑپاتی رہتی تھی۔ جب گنبد خضریٰ کا تصور دل میں سماجاتا تو بے خود ہو جاتے اسی عالم وارفتگی میں کہی ہوئی نعت کے چند بند ملاحظہ کیجیے۔

او کیا خوب تھا گر حاضر در ہوتا
ان کے سایہ تلے چین سے سویا کرتا
شوق و آداب بہم گرم کشاکش ہیں
عشق گم کردہ توان عقل سے الجھا کرتا
آنکھ اٹھتی تو میں جھنجلا کے پلک سی لیتا
دل بگڑتا تو میں گھبرا کے سنبھالا کرتا
بام دل کو کبھی بال کبوتر دیتا
خاک پر گر کے کبھی ہائے خدایا کرتا
کبھی کہتا کہ یہ کیا بزم ہے کیسی ہے بہار
کبھی انداز تجاہل سے میں توبہ کرتا
کبھی کہتا کہ یہ کیا جوش جنوں ہے ظالم
کبھی پھر گر کے تڑپنے کی تمنا کرتا
اے حسن قصد مدینہ نہیں رونا ہے یہی
اور میں آپ سے کس بات کا شکوہ کرتا

ہجر کی بے تابی میں آہ و زاری کے ساتھ شکوے کا رنگ بھی نمایاں ہو گیا ہے مگر مقطع کا وزن واضح کرتا ہے کہ اس شوخی کا مقصد اپنے سوئے ہوئے بخت کو بیدار کرنا اور محبوب کی بارگاہ میں قرب حاصل کرنے کا وسیلہ ہے۔

علمی خدمات

حضرت استاد زمن نے ادبی اور مذہبی دونوں طرح کی خدمات انجام دی ہیں۔ ادب میں صرف ایک تصنیف "ثمر فصاحت" پائی جاتی ہے۔ مگر تلامذہ کی فہرست طویل ہے۔ ان میں چند کے نام یہ ہیں۔

سید برکت علی صاحب نامی، منشی دوارکا پرشاد حلم، حافظ دیاج احمد صاحب مختر، سید محمود علی عاشق، منشی ہدایت یار خاں قیس، منشی اختر حسین اختر، برج موہن کشور فیروز، منشی مظہر حسین مظہر، حکیم سید مسعود غوث فیض، منشی تہور علی تہور، منشی محمد حسین آثر بدایونی، منشی اعجاز احمد قیصر مرادآبادی۔

مذہبی تصانیف میں۔ تزک مرتضوی در اثبات تفضیل شیخین، نگارستان لطافت در ذکر میلاد شریف، ہیبوقع فریاد کا جواب در مسئلہ قربانی۔ آئینہ قیامت ذکر کربلا

معلٰی، دین حسن در حقانیت اسلام و ردّ مذاہب، وسائل بخشش، ذکر کرامات سیدنا غوث اعظم رضی اللہ تعالٰے عنہ، ذوق نعت معروف بہ صلۂ آخرت مجموعہ کلام نعتیہ اردو یادگار ہیں۔ (سیرت اعلیٰ حضرت ص ۱۵ ر سے ماخوذ)

لائق تقلید عمل

استاد زمن حضرت حسن رضا بریلوی رحمۃ اللہ تعالٰے علیہ ایک بہترین عالم، عظیم شاعر اور ادیب ہونے کے ساتھ اپنے بڑے بزرگوں کے فرماں بردار اور خدمت گزار بھی تھے آپ نے اعلیٰ حضرت امام احمد رضا کی جس خلوص و محبت کے ساتھ خدمت کی ہے اس دور میں اس کی مثال ملنا مشکل ہے۔ اس بات کا اندازہ ذیل کے اقتباس سے کر سکتے ہیں۔

"اعلیٰ حضرت قبلہ کی دو بیٹیوں کی شادی ہونے والی تھی دونوں کے نکاح حسب دستور خاندان میں پہلے ہی ہو چکے تھے رخصتی کا جب تقاضہ ہوا تو مولانا حسن رضا خاں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عرض کیا کہ بھائی اجان نے حاجی احمد اللہ خاں صاحب (سمدھی) کا رخصتی کے لئے تقاضہ آیا ہے۔ وہ آپ سے بیاہ کی تاریخ مانگتے ہیں۔ میری رائے یہ ہے کہ دونوں بیٹیوں کی شادی ایک ساتھ کیوں نہ کر دیں۔ اعلیٰ حضرت قبلہ نے ارشاد فرمایا کہ ایک بیٹی کی شادی کوئی آسان کام نہیں نہ کہ ایک ساتھ دو کی۔ بیٹی کی شادی میں لوگ بڑے ساز و سامان کرتے ہیں۔ تم نے کچھ ضروری سامان بھی کر لیا ہے۔ یا مجھ سے تاریخ مقرر کرانے آگئے؟ مولانا حسن رضا خاں نے عرض کیا کہ سامان کی تیاری کے متعلق آپ بھابھی جان سے دریافت فرما لیجئے۔ اعلیٰ حضرت نے ان سے فرمایا کہ بیٹیوں کی شادی کے لئے کیا کیا سامان تیار ہو گیا اور کیا کمی رہ گئی ہے؟ بی بی صاحبہ نے عرض کیا کہ ہمارے پاس تو سانے بھی پیسے تیار رکھے ہیں۔ دونوں کے جہیز مکمل ہو گئے ہیں۔ برات میں کھانے دانے کا کل سامان مہیا ہو چکا ہے۔ صرف تاریخ کی دیر ہے۔ اعلیٰ حضرت قبلہ نے بی بی صاحبہ سے یہ الفاظ سنے تو فرط مسرت سے آبدیدہ ہو گئے۔ فرمایا کہ حسن میاں تم نے مجھے دنیا سے بالکل بے نیاز کر دیا ہے۔ میری بیٹیوں کی شادیاں ہیں میں ان کا باپ ہوتے ہوئے بالکل بے خبر اور آزاد بیٹھا ہوں۔ تم نے مجھے یہ سوچنے کی بھی زحمت نہ دی کہ جہیز میں کیا کیا دیا جائے گا اور وہ کہاں کہاں سے فراہم ہوگا۔ یا یہ کہ برات میں کیا کیا کھانے دیئے جائیں گے۔ آبدیدہ ہو کر فرمایا کہ حسن میاں جو کچھ میں دین کی خدمت کر رہا ہوں اس کے اجر میں باذن اللہ حصہ دار تم بھی ہو اس واسطے کہ تمہیں نے مجھے دینی خدمات کے لئے دنیا سے آزاد کر دیا ہے۔ اس پر مولانا حسن رضا خاں رو پڑے۔ قدرے سکون کے بعد تاریخ بھی مقرر فرما دی۔"

(سیرت اعلیٰ حضرت ص ۵۶)

اپنوں کے ساتھ خدمت کا ایسا والہانہ جذبہ آج کے مسلمانوں میں مفقود ہوتا جا رہا ہے۔ ایک بھائی دوسرے کے سینے میں چھری اتارنے اور بیٹے باپ کا گلا گھونٹنے کو تیار ہیں۔ عزیزوں اور رشتہ داروں سے قلبی لگاؤ کا اعادہ ہوتا بھی ہے تو صرف گفتگو کی حد تک ایسے انتشار و افتراق اور پراگندگی کے ماحول میں حضرت حسن رضا بریلوی کی غیر معمولی خدمات کی اشاعت ضروری ہے۔ جو شعر و سخن کی زلفیں سنوارتے وقت بھی اپنے والدین، بھائیوں، بہنوں، بیٹوں، بھتیجوں اور بھانجوں و دیگر اقرباء کو نہیں بھولتے ہیں۔ بلکہ ان کے حق میں امن و سلامتی کے لئے دعائیں کرتے ہوئے رب کی بارگاہ میں التجا پیش کرتے ہیں۔ ؎

مجھ پر اور میرے دونوں بھائیوں پر
سایہ ہو تیرے فضل کا یا رب

عیش تینوں گھروں کے تینوں کو
اپنی رحمت سے کر عطا یا رب

میرے فاروق و حامد و حسنین
درد و غم سے رہیں جدا یا رب

لخت دل مصطفٰے حسین رضا
ہر جگہ پائیں مرتبہ یا رب

باقی ص ۱۵۹ پر

کلامِ حسنؔ کے محاسن اور خصوصیات

شاہ احمد حسین قادری ——— کسٹم آفیسر بمبئی

نوٹ :- مدیر سنی دنیا بریلی کا دعوت نامہ بندۂ احقر کو موصول ہوا جس میں لکھا ہوا ہے کہ ماہنامہ "سنی دنیا" برادر امام احمد رضا استاذ زمن علامہ حسن رضا خاں حسنؔ بریلوی کی حیات و کارنامے اور شعری خدمات پر تاریخ ساز نمبر نکالنے کا پہلی بار اعزاز حاصل کر رہا ہے۔ استاد زمن کی شاعری سے متعلق میں مقالہ لکھنے کی مطلوبہ اہلیت سے محروم ہوں مگر زیر مضمون میں اپنے قلبی تاثرات کو سپرد قلم کرنے کی سعادت حاصل کر رہا ہوں تاکہ حضرت علامہ حسن رضا خاں علیہ الرحمہ کے مداحوں میں میرا بھی نام درج کر لیا جائے اور یہی وہ متاع عزیز ہے۔ جس کے حصول پر عشاق اکثر رشک کیا کرتے ہیں ورنہ من آنم کہ من دانم۔ میری وقعت اور علمی حیثیت ہی کیا ہے جو کچھ لکھا گیا ہے فرط عقیدت سے متاثر ہو کر لکھا گیا ہے ——— احمد حسین قادری

دور جدید کا شاعر روایتی شاعری سے جزوی طور پر انحراف کرتا ہوا ہمیں نظر آتا ہے۔ اردو ادب کا دامن چونکہ اتنا وسیع ہے کہ نئی جہتوں کی تلاش کا سلسلہ جاری ہے۔ مگر جو شاعر صرف اپنے دماغ کو شعر کہنے کے لئے اپنی فن شاعری کا تختۂ مشق بناتا ہے۔ وہ اپنے قلب و جگر کے احساس کی حقیقی ترجمانی نہیں کر سکتا۔ ردیف و قافیہ پیمائی سے الفاظ کے پیکر کو شعروں میں تراشا اور ڈھالا تو جا سکتا ہے مگر عوام کی مقبولیت کا مستحق نہیں۔ جو شاعر نغمگی اور موسیقی کو پیش نظر رکھ کر شاعری کرتا ہے وہ حقیقی معنی و مفہوم یعنی اثر آفرینی پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے۔ مزاحیہ و عشقیہ شاعری والوں کی عوامی مقبولیت اپنے شباب پر اس وقت پہونچی جب انھوں نے کسی بیش قیمتی فکر یا خیال کو شعر کا جامہ پہنایا۔ اور فکر و نظر کے عکاسی کرنے والے اشعار کی قدر اسی وقت ہوتی ہے جب فکر و فلسفہ ہماری حقیقی زندگی کا ترجمان بنتی ہیں۔

عہد قدیم سے ہی فن نعت گوئی اردو ادب کا غیر معمولی صنف رہی ہے۔ کیونکہ بادۂ حجاز کے سرمستوں اور صحرائے طیبہ کے آبلہ پاؤں نے ہر ماحول، ہر علاقہ، ہر دور ہر زمانہ، ہر زبان اور ہر طرز میں خدا اور خدائی کے محبوب حضور محمد رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ و آلہ وسلم کے گیت گائے ہیں۔ رزم و بزم، امن و ابتلاء، فرحت و نکہت الغرض زندگی کا کوئی ایسا شعبہ نظر نہیں آتا جس میں مدحت نبوی علیہ الصلوٰۃ

انفس التسلیمات کے گل بوٹے نہ بکھرتے گئے ہوں بلکہ فطرت
چونکہ خود تنوع پسند ہے۔ اس لیے حبِّ رسول کے مستے کشوں
نے اس مقصودِ کائنات، خلاصۂ کن مکاں ذات کی نعت
خوانی کے لئے بھی نت نئے اسلوب اپنائے۔ نگاہ تصور
اٹھائیے اور نعت گوئی کی تاریخ کا مطالعہ کیجئے۔ عہدِ رسالت
کا ایک واقعہ اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ ایک عاشقِ
صادق ہے۔ جسے مشرکین قریش نے اس وارفتۂ شوق کو
لٹکا دیا ہے اور چاروں طرف سے برچھے اور تلواریں بلند
ہو چکی ہیں۔ اس وقت جب کہ دونوں ہاتھ سولی کے تختہ
پر باندھے جا چکے ہیں۔ دیوانۂ رسول درد اور روح کی
گہرائیوں سے بارگاہ مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم
میں اپنی محبت کا نذرانہ اور سلام عقیدت پیش کرنا چاہا تو خود
قدرت کے غیبی پیغام رسانوں نے ایک آشفتہ حال جاں
نثار کا پیغام بارگاہ نبوی تک پہونچا دیا اور حضور نے جواب
ارشاد فرمایا۔ وعلیک السّلام۔

تختۂ دار پر نیزوں کے زخم کھاتے ہوئے، خون کے
فواروں سے غسل شہادت کرتے ہوئے اس محب صادق
نعت خوانِ رسول نے اپنے محبوب کی مدح سرائی اس طرح کی۔

ولست ابالی حین اقتل مسلما
علی ای شق کان فی اللہ مصرعی

ترجمہ:- میں محبت رسول میں سرشار مسلمان ہونے کی
حالت میں قتل کیا جا رہا ہوں تو اس کی کیا پرواہ کہ کس
کروٹ میری جان جا رہی ہے۔

وذالک فی ذات الالٰہ وان یشاء
یبارک علی اوصال شلو ممزع

ترجمہ:- میری یہ شہادت راہ مولا میں ہے اس لئے اگر
اس کی مرضی ہوئی تو میرے ٹکڑے ٹکڑے کئے ہوئے
جسم کے جوڑ جوڑ کو اپنی رحمتوں سے بہرہ ور کرے گا۔

یہ تھی حضرت خبیب بن عدی الانصاری مدنی کی نعت
خوانی۔ اسی سلسلہ کے تابندہ ستاروں کے کچھ نام اس طرح
ہیں۔ حضرت امیر حمزہ بن عبدالمطلب رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ
حضرت عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، حضرت
علی کرم اللہ وجہہ الکریم، حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ تعالےٰ
عنہٗ، خاتونِ جنت دخترِ رسول حضرت بی بی فاطمہ رضی اللہ
تعالیٰ عنہا، ابو سفیان بن الحارث بن عبدالمطلب کے
مدحیہ اشعار، ذوالنورین عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، کعب
بن زہیر رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ، حضرت عمر بن عبدالعزیز رضی
اللہ تعالیٰ عنہٗ، امام العشاق علامہ شرف الدین محمد بوصیری
رحمۃ اللہ تعالےٰ علیہ، امام اعظم ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ،
امام العرفا، سرخیل اولیا حضرت شیخ اکبر قدس سرہٗ، حضرت
سعدی شیرازی علیہ الرحمۃ، عبدالرحمٰن جامی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ
ان سبھوں میں منفرد مقام حاصل ہے۔ سیدنا حسان بن ثابت
رضی اللہ تعالیٰ عنہٗ کو جنھوں نے نعت خوانی کو عبادت کا
درجہ دے رکھا تھا۔ اور یہی حق بھی ہے کہ نعت گوئی سرورِ
کونین صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم ایک ایسی عبادت ہے
جو اللہ کی بارگاہ میں بے حد مقبول ہے۔

نعت گوئی کا اصل تعلق محبت رسول اللہ صلی اللہ
تعالیٰ علیہ وآلہٖ وسلم سے ہے۔ ان کی محبت میں سرشار ہونے
والوں کے اقوال ہی نعت ہیں اس راہ کے مسافروں
نے خود کو فدائے عشق حبیب کر دیا۔ اور یہی فدا کاری ان
کے لئے حیاتِ جاودانی کا سامان بن گئی۔ دیدار سے
عشاق کو سیری نہیں ہوتی بلکہ ہر دل دیوانہ بزم محبوب کی
درازی کا خواہاں ہوتا ہے۔ مدینہ والے محبوب کی بزم
کے بادہ کشوں نے جلوت و خلوت، سفر و حضر، امن و
جنگ ہر مرحلہ میں نگاہِ محبوب سے سیرابی حاصل کی ہے۔
پی پی کے مست ہوئے اور مست ہو ہو کے پی ہے۔ اور توحید
کی مستی سے سرشار ہو کر بنی آدم کے تمام عشاق متقدمین و متاخرین
سے آگے نکل گئے ہیں۔ اور جب محبوب کائنات صلی اللہ تعالےٰ
علیہ وآلہٖ وسلم نے پردہ فرمایا تو ان عاشقانِ صادق پہ کیسی قیامت
ٹوٹی...... یہ ان ہی کے دل سے پوچھئے۔ فراقِ محبوب کی تلخی
نے عشق کے نشہ کو دو آتشہ بنا دیا۔ نگاہ نبوت کے بخشے
ہوئے اس سرور نے ان انسانوں کو مست کیا مگر بہکنے نہ دیا
وہ دیوانگانِ رسول ایسے فرزانے تھے جنھوں نے عشق کی
آبرو اور محبت کا بھرم باقی رکھنے کے لئے اپنی نسلوں کو داؤ

پر لگا دیا تاکہ محبت شرمسار نہ ہو۔

ے حافظ نہ زندہ باشی مرگ کجا و تو کجا
تو شدہ فدائے محمد، محمد شد بقائے تو

محبوبۂ حبیب ام المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اس نور مجسم کے جمال جہاں آرا کو قلب و روح کی گہرائیوں سے جب نذر محبت پیش کرتی ہیں تو شب تاریک میں حضور کی مقدس پیشانی کو نور فشانی تمثیل بن کر یوں سامنے آتی ہے اللہ اکبر وہ مقدس پیشانی۔

یلوح مثل مصباح الدجیٰ المتوقد

ترجمہ:۔ یوں جگمگاتی ہے جیسے روشن چراغ۔

چودھویں صدی کے مجدد دین وملت امام شعروادب اعلیٰ حضرت امام احمد رضا فاضل بریلوی علیہ الرحمہ نے ایک شعر یوں لکھا ہے۔ ے

رخ انور کی تجلی جو قمر نے دیکھی
رہ گیا بوسہ دہ نقش کف پا ہو کر

حسن جہاں تاب کے انوار دامن دل میں سمیٹنے والے یوں بھی خراج عقیدت لائے ہیں۔ ے

آسماں گر ترے جلووں کا نظارا کرتا
روز اک چاند تصدق میں اتارا کرتا
چھپ گیا چاند نہ آئی ترے دیدار کی تاب
اور اگر سامنے ہوتا بھی تو سجدہ کرتا
(حسن بریلوی)

مولانا محمد شہاب الدین خاں مدیر سنی دنیا کو صد آفریں و تحسین اور مبارک باد پیش کرتا ہوں۔ جنھوں نے خمخانۂ رضا کے گوہر آبدار کی ذات گرامی پر "استاذ زمن نمبر" نکالنے کی ہمت و جرأت کی ہے۔ استاذ زمن حضرت علامہ حسن رضا بریلوی ہندوپاک کے جلیل القدر عالم اور عاشق رسول تھے، انہوں نے بزم شعر و سخن کو آراستہ کیا، امام احمد رضا جیسے سنی دنیا امام شعر و ادب کے لقب سے یاد کرتی ہے۔ ان کے برادر حقیقی اور شاگرد رشید میرزا داغ دہلوی سے اصلاح سخن لی۔ حسرت موہانی نے علامہ حسن رضا خاں کی شعر و شاعری پر مقالہ لکھا۔ کلام حسن استاذ زمن رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ریڈیو پاکستان کا نشری تبصرہ ارباب علم و دانش کو متوجہ کر چکا، اور جن کی شاعرانہ ہمہ جہتی کا ہر پہلو سرکار دو عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی مدحت طرازی سے تابندہ ہے۔

دنیا کے ہر گوشہ میں بزم نعت آراستہ کی جاتی ہیں۔ ارض ہندوپاک اور بنگلہ دیش میں تقریباً دنیائے اسلام کی کل آبادی کا ایک تہائی حصہ مسلم آبادی پر مشتمل ہے۔ جن کی زبان اردو ہے۔ یا اردو زبان سے بے پناہ شغف رکھتی ہے۔ ایک خاص تعداد غیر مسلموں کی بھی ہے جو اردو زبان سے حد درجہ مانوس ہے۔ اور کتنے ایسے ہندو شاعر، افسانہ نگار، نعت گو اور غزل گو پائے جاتے ہیں کہ جب ان کے اردو شاعری و کلام و ادب کا مطالعہ کیا جاتا ہے تو کہنا پڑتا ہے کہ یہ مظلوم زبان کس قدر کشش و تاثیر رکھتی ہے جس کا اندازہ اسی کو ہے جو اس زبان سے آشنا ہے۔ اردو کے اصناف سخن میں صنف نعت گوئی کو مدت دراز سے دیدہ و دانستہ ہمارے ادیبوں اور بااثر و رسوخ شعراء نے نظر انداز کیا ہے۔ اس کے پس پردہ تعصب و تنگ نظری کارفرما نہیں ہے تو اور کیا ہے۔؟ ڈاکٹر سید شمیم گوہر اور ڈاکٹر اختر بستوی وغیرہ نے کئی بار اس جانب ارباب سخن کو متوجہ کرنے کی کوشش اور سعی بلیغ کی ہے۔

ہندوستان کے اردو ذخیرۂ نعت کا تاریخی اور بھرپور محاسبہ کرنے اور اس کی مختلف نعتیہ فضاؤں کا تجزیہ کرنے کے بعد اس نتیجہ کا تعین کرنا کوئی مشکل کام نہیں کہ اردو شعراء کی نعت گوئی کے مقابلے میں ممالک اسلامیہ کی تاریخ نعت اتنی زیادہ معروج اور سربلند نظر آتی ہے کہ اس کا تہائی حصہ بھی اردو شعراء کے نصیب میں نہ آسکا۔ کس قدر حیرت کی بات ہے جب کہ دیگر اصناف سخن پر طبع آزمائی کرنے والے ایک سے ایک شاعر قادر الکلام تسلیم کئے گئے۔ یہ مسئلہ کم از کم ہمارے لئے تو بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ آخر ہندوستانی ادب کیسے ایسے اردو کے انہیں مسلم شاعروں کے شعری سرمائے کو کیوں مسلم و مستحکم باور کیا جاتا رہا ہے جو نعت جیسے عظیم و بلیغ اور منفرد فن کی طرف اپنی تھوڑی توجہ بھی مبذول کرنے کی ہمت نہ کرسکے۔ کیا اصناف سخن میں نعت گوئی کا

کوئی بھی ایسا مقام متعین نہیں کیا جاسکتا تھا جس کی روشنی
میں کسی نعت گو کو باکمال شاعر تصور کیا جاسکتا؟ -"

(امام احمد رضا نمبر مطبوعہ دہلی)

اصناف سخن میں سے فن نعت کا ایک ایسا نازک ترین مسئلہ ہے۔ جس کا حل سوائے مسلمانوں کے اور کسی کے پاس نہیں ہے۔ آج فن نعت کے حقیقی رنگ و روغن کو پرکھنے کی ضرورت ہے۔ شاید یہی وہ اسباب و محرکات ہیں جو ہمارے لئے نہایت فخر و سرور اور خوشی کی بات ہے کہ ارباب شعر و سخن، اور ارباب علم و دانش نے امام شعر و ادب امام احمد رضا کے برادر حقیقی استاد زمن حضرت علامہ حسن رضا خاں کے نعتیہ مجموعہ "ذوق نعت" کو اپنی توجہ کا مرکز بنا تسلیم کیا ہے۔

بریلی شریف تیرھویں صدی سے آج تک علم و ادب اور دین و دانش کا مرکز ہے، اسی سرزمین پر برصغیر کی عبقری شخصیت مجدد دین وملت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہ نے عالم اسلام کی قیادت و رہنمائی کی ہے۔ فصیح الملک داغ دہلوی کی خدمت میں رام پور پہونچے اور شعر گوئی کے میدان میں کمال حاصل کیا۔ پہلے داغ سے عشقیہ شاعری میں مشورۂ سخن کرتے تھے۔ غزلیہ دیوان ثمر فصاحت ہے۔ اعلیٰ حضرت کے فیض صحبت نے نعت گوئی کا ذوق بخشا۔ آپ کا نعتیہ دیوان "ذوق نعت"، چھپ کر داد تحسین حاصل کر چکا ہے۔ زبان کی لطافت، بیان کی سادگی، حسن ادا نیز کیف آوری و اثر انگیزی کا بہترین نمونہ ہے۔ آپ نے ادبی و مذہبی دونوں خدمات انجام دیں۔ لیکن مذہبی خدمات زیادہ نمایاں اور غالب ہیں جن کی وجہ سے آپ کی ادبی شخصیت دب گئی۔

شہادت امام حسین پر بھی آپ نے ایک کتاب بنام "منتخب شہادت مع آئینۂ قیامت"، تصنیف فرمائی۔ جس کے متعلق اعلیٰ حضرت فرماتے ہیں کہ کسی سائل نے پوچھا کہ محرم کی مجالس میں جو مرثیہ خوانی ہوتی ہے سننا چاہیئے یا نہیں۔ آپ نے فرمایا۔ مولینا شاہ عبدالعزیز صاحب محدث دہلوی کی کتابیں جو عربی میں ہیں یا میرے بھائی حسن میاں مرحوم کی کتاب "آئینۂ قیامت" میں صحیح روایات ہیں انہیں سننا چاہیئے باقی غلط روایات کے پڑھنے سے نہ پڑھنا اور نہ سننا بہتر ہے۔

(الملفوظ حصہ دوم ص۱۹۱)

۲ر شوال ۱۳۲۶ ہجری مطابق ۱۹۰۸ عیسوی میں وصال ہوا۔ بریلی سٹی اسٹیشن سے متصل قبرستان میں مدفون ہوئے۔ یعنی ۱۲۷۶ھ/۱۳۲۶ھ صرف پچاس سال کی عمر قلیل میں آپ نے جو کارنامے انجام دیئے وہ آج صدیوں پر بھاری معلوم ہوتے ہیں۔

(فقیہ اسلام، از ڈاکٹر حسن رضا، ص۲۳۳)

"ذوق نعت"، کی مقبولیت مثل آفتاب واضح ہے کہ کوئی بھی بزم نعت ہو، ذکر شہادت ہو ہر مجلس و محفل میں کلام حسن کو پڑھا جاتا ہے۔ لاکھوں مسلمان آپ کی نعتیہ اشعار سے اپنی بزم کو آراستہ پیراستہ کرتے ہیں۔

وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ الْمُبِيْنُ ۝

منقبت استاذ زمن رحمۃ اللہ علیہ

سخن میں دلنشیں انداز استاذ زمن تیرا
نہیں ممکن کھینچے بہزاد بھی وصف حسن تیرا

ترے شعروں کا اک اک لفظ ہے غنچہ معانی کا
نہیں ہے غالب و مومن سے کم رنگ سخن تیرا

ترے حسن تخیل میں حقائق کی لطافت ہے
ادب کی روشنی میں پھول جیسا بانکپن تیرا

جہان شعر گوئی میں فصاحت گستگی تیری
ادب میں زندگی تو ہے اعجاز سخن تیرا

بفیض حضرت نوری بفیض حضرت حسرت
چمکتا ہے سخن دانوں کے اے مخدوم فن تیرا

مولانا حسن رضا خاں اپنے وقت کے حسان تھے

از مولانا مظفر احمد قادری جامعہ مظفریہ برکات العلوم داتا گنج ضلع بدایوں شریف۔

ایک فانی انسان کو جب دست قدرت حسن سیرت وصورت سے آراستہ و پیراستہ کرتی ہے، علم وفضل سے نوازتی ہے، علماء ربانیین کی صحبت وفیضان سے سرفراز فرماتی ہے تو وہ کیا بن جاتا ہے اس کی مثال حضرت علامہ زمن مولینا حسن رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ کی زندگی میں دیکھنے کو ملتی ہے۔ وہ اپنے وقت کے حسان تھے، حسان الوقت تھے۔ لسان الحسان تھے۔

حضرت علامہ زمن مولینا حسن رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ ان بے مثال ہستیوں میں ایک ہیں جن کو قدرت نے اپنی فیاضیوں سے مالا مال و سرفراز کیا جن کی شخصیت محتاج تعارف نہیں ہے۔ بس اتنا ہی کافی ہے کہ موصوف سرکار اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی قدس سرہٗ کے برادر معظم، اعلیحضرت کے فیض وصحبت یافتہ، اور اعلیٰ حضرت قدس سرہٗ کی زیر تربیت پروان چڑھے۔ علم وفضل کی دولت سے مالا مال ہوئے۔ فاضل زمن فاضل۔ فاضل بن فاضل تھے۔

حضرت علامہ مولینا حسن رضا خاں صاحب بڑے ہی علم وفضل کے مالک تھے۔ آپ کی ذات ستودہ صفات شریعت وطریقت کی سنگم تھی۔ علم وفن، شریعت وطریقت، تصوف ومعرفت کی اشاعت و تبلیغ میں حضرت علامہ کی مبارک زندگی کے روشن کارنامے ہیں۔

معرفت وطریقت اور روحانیت کی دنیا میں بھی آپ نے وہ کردار ادا کیا ہے جو صوفیا، متقدمین اور مشائخ سلف میں کچھ مخصوص ہستیوں کا حصہ رہا ہے۔

حضرت علامہ مولینا حسن رضا خاں صاحب قدس سرہٗ بہترین شاعر تھے شعر وشاعری میں اپنے وقت کے حسان تھے آپ کی شاعری نے مسلمانوں کے قلوب عظمت محبوب کی طرف پھیر دیئے۔

آپ کا نعتیہ دیوان بنام "ذوق نعت" مشہور ہے جو حدود شرع سے مزین ہے جو حقیقت حقیقت ہے۔ آپ کا کلام، جھوٹ، بناوٹ، مبالغہ اور ریا، تصنع اور تکلف سے پاک ہے۔

عقائد اہلسنت وجماعت کی تبلیغ واشاعت اور محبت رسول کی تلقین کرتا ہے۔ باطل پرستوں کی تردید بھی۔ آپ کے کلام کی خصوصیت یہ بھی ہے کہ آپ نے پورے کلام یعنی ذوق نعت میں، حضور شافع یوم نشور صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے نام نامی اسم گرامی کو استعمال نہیں کیا ہے۔ آپ کے کلام میں سوز وگداز فصاحت وبلاغت، حلاوت وملاحت، لطافت و نزاکت، تشبیہات واستعارات، ندرت، تخئیل جدت، تمثیل، تنوع مضامین والہانہ عقیدت وارادت سب پائی جاتی ہیں۔

نعتیہ شاعری کا کمال یہ ہے کہ اس سے شاعر کے کمال عشق کا سکہ دل پر بیٹھ جاتے یہ سب فیضان محمدی ہی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آپ سے نعتیہ کلام کے بڑے بڑے شعراء معترف ہیں۔ ان کے یہاں جذبہ دل کی بے ساختگی۔ خیال کی رعنائی الفاظ کی شان وشوکت اور عشق رسول کی جھلکیاں قدم قدم پر منظر ہیں۔

میرے والد ماجد فیض العارفین حامدی،
مولینا شاہ منور حسین داتا گنجوی علیہ الرحمہ فرمایا کرتے
تھے "کلام حسن میں خلوص کی جو مہک ہے وہ ذاتی
مشاہدے اور تجربے پر مبنی ہے آپ نے اپنی ہر سانس
میں اپنے محبوب کو محسوس کیا اور اسی سے اپنی شاعری
کو عطر بیز کیا"۔

یہ سب فیضان ہے امام اہلسنت سیدی
اعلیٰ حضرت قدس سرہ کا۔ علماء شعر و ادب نے نعت
گوئی کی مشکل پسندی کے سلسلہ میں ہمہ خامہ فرسائی
کی ہے۔ حمد باری تعالیٰ کہنا آسان ہے مگر نعت
مصطفےٰ (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم) کہنا مشکل اتنا
مشکل جیسے تلوار کی دھار پر چلنا بلکہ اس سے بھی
مشکل ترین مرحلہ ہے۔ اس منزل میں بڑے
بڑے تاجوران سخن اپنی قادر الکلامی کے باوجود
لرزیدہ و ترسیدہ نظر آتے ہیں حضرت عرفی شیرازی
جیسے باکمال شاعر بھی نعت کی اس مقدس راہ کو بر
دم تیغ ہی تصور کرتے ہیں مثلاً ؎

عرفی شتاب ایں رہ نعت است نہ صحرا است
آہستہ کہ رہ بر دم تیغ است قدم را

در اصل نعت گوئی کی وہ منزل ہے
جہاں ایک مداح رسول کو الوہیت و رسالت کی
حدود شناسی اور عبودیت و محبوبیت کے نازک
ترین کا عرفان ہونا لازمی مانا ہے۔ اس مقام پر
جذبات و احساسات میں حد درجہ توازن اور
استدلال اور افکار و نظریات میں بے پناہ پاکیزگی
وطہارت نہایت ضروری ہے۔

ع باخدا دیوانہ باشی و با محمد ہوشیار

یہی وہ کٹھنائیاں ہیں جہاں بہت سے شعراء نعت
محبوب کبریا علیہ التحیۃ والثناء لکھنے میں خوف
کرتے ہیں کیونکہ مدحت محبوب خدا صلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم کے اظہار میں ذرہ برابر چوک سب کچھ
کھو دیتی ہے۔ اور عذاب الٰہی کا سبب بن جاتی ہے

اس راہ میں بعض عظیم المرتبت شعراء
نے بھی گذرے ہیں جو نعت گوئی کے رموز و اسرار
سے واقف بلکہ حقیقی علم و شعور رکھتے ہیں اور جنھوں
نے نعت کو مکمل شاعر اور شعری اصول و ضوابط کے
ساتھ ایک مستقل فن کی حیثیت سے فروغ بخشا
اور اس سعادت ابدی کو عبادت سے تعبیر کیا۔ ان
میں ایک نام تو سر فہرست ہمارے اعلیٰحضرت قدس
سرہٗ کا دوسرے حضرت علامہ زمن مولینا حسن رضا
خاں صاحب کا بھی آتا ہے۔

محبت و اطاعت اور ادب کو ملحوظ رکھتے
شعر کہنا آسان بات نہیں ہے۔ لیکن حضرت حسن
کے کلام میں ادب و احترام و نیازمندی بدرجہ
اتم واحسن ملتی ہے آپ آقا کی بارگاہ بیکس
پناہ میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں ؎

واہ کیا مرتبہ ہوا تیرا ❊ تو خدا کا خدا ہوا تیرا
واہ رے عطر خدا ساز مہکنا تیرا ❊ خوبرو ملتے ہیں کپڑوں میں پسینہ تیرا
سوزن گم شدہ ملتی ہے تبسم سے ترے ❊ شام کو صبح بناتا ہے اجالا تیرا

ایک جگہ یوں عرض کرتے نظر آتے ہیں ؎

آستانہ پہ ترے سر ہو اجل آئی ہو
اور جان جہاں تو بھی تماشائی ہو
اس کی قسمت پہ خدا تخت شہی کی راحت
خاک طیبہ پہ جسے چین کی نیند آئی ہو

اپنے آقائے کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم
کے سایہ بے سایہ سے متعلق نغمہ سنج ہیں ؎

یہی منظور تھا قدرت کو کہ سایہ نہ بنے
ایسے یکتا کے لئے ایسی ہی یکتائی ہو

آگے چل کر اپنے عقیدہ و مسلک کا
اظہار فرماتے ہیں ؎

تمہارا نام مصیبت میں جب لیا ہوگا
ہمارا بگڑا ہوا کام بن گیا ہوگا
خدا کا لطف ہوا ہوگا دستگیر ضرور
جو گرتے گرتے ترا نام لے لیا ہوگا

حضور سرور عالم صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی بارگاہ عالی میں یوں نغمہ سرا ہوتے ہیں ؎

تری طلعت سے زمیں کے ذرے مہ پارہ بنے
تری ہیبت سے فلک کا مہ دو پارہ ہو گیا
ترے صانع سے کوئی پوچھے ترا حسن و جمال
خود بنایا خود بنا کر خود ہی پیارا ہو گیا
کیوں نہ ہو تم مالک ملک خدا ملک خدا
سب تمہارا ہے خدا ہی جب تمہارا ہو گیا

حضور محبوب پاک صاحب لولاک صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے بے مثل و بے مثال ہونے پر عرض کرتے ہیں ؎

سر سے پا تک ہر ادا ہے لاجواب
خوبرو یوں ہیں نہیں تیرا جواب
حسن ہے بے مثل صورت لاجواب
بس خدا تم آپ ہو اپنا جواب

دیار محبوب مدینہ پاک سکینہ سے متعلق یوں نغمہ سرا ہیں ؎

سیر گلشن کون دیکھے دشت طیبہ چھوڑ کر
سوئے جنت کون جائے در تمہارا چھوڑ کر
مر ہی جاؤں میں اگر اس در سے جاؤں دو قدم
کیا بچے بیمار غم قرب مسیحا چھوڑ کر
مر کے جیتے ہیں جو ان کے در پہ جاتے ہیں حسن
جی کے مرتے ہیں جو آتے ہیں مدینہ چھوڑ کر

اللھم ارزقنا زیارۃ حرمک و حرم النبی صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم۔

بلا شبہ حضرت علامہ حسن رضا خاں صاحب علیہ الرحمہ کی شاعری زندہ و جاوید ہے وہ خود بھی زندہ و جاوید ہیں۔ ذلک فضل اللہ یعطی من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

المجمع الاسلامی کی گرانقدر مطبوعات

المبین	جمیل الشیم
امتیاز حق	
اسلام اور امن عالم	حقائق تحریک بالاکوٹ
اسلام اور تربیت اولاد	حقوق والدین
امام احمد رضا اور تصوف	رسوم شادی
اجالا	صحابہ کا عشق رسول
احادیث شفاعت	دروس البلاغہ
الرحیل	عقائد علماء دیوبند
اذان قبر	فلسفہ اور اسلام
اسلامی معاشرت	فیض الحکمت
براءت علی از شرک جاہلی	فضائل قرآن
بادۂ حجاز	قصیدتان رائعتان
تذکرہ علماء بستی	کلام رضا
نوائے نعت	مسئلہ ختم نبوت اور تحذیر الناس
مناجات بدر	مصری مؤرخین
تحقیق الفتویٰ	مسنون دعائیں
تدوین قرآن	نور الایمان
تقدیر و تدبیر	ندائے یا رسول اللہ

ملنے کا پتہ

المجمع الاسلامی فیض العلوم محمد آباد گوہنہ
ضلع اعظم گڈھ

دفتر ماہنامہ سنی دنیا سے خط و کتابت کرتے وقت خریداری نمبر ضرور تحریر کریں تاکہ تعمیل حکم جلد ہوسکے

حسن بریلوی اور ان کی خصوصیات

از۔ عبدالغفار انصاری۔ ایم۔ اے، ریسرچ اسکالر جتادہ ٹیکم گڑھ

اسلاف کے نقش قدم پر چلنا ترقی ہے

دنیا میں بہت سی قومیں آباد ہیں، سب کی سب اللہ کی مخلوق اور اولاد آدم ہیں۔ اللہ رب العزت نے اپنی مخلوق کی ہدایت کے واسطے انبیاء کرام کو مبعوث فرمایا ہدایت پانے والوں نے ہدایت پائی اور جن کی قسمت میں گمرہی تھی وہ آج بھی گمراہ ہیں پروردگار عالم نے اپنی مخلوق پر ایک احسان عظیم یہ فرمایا کہ اپنے پیارے محبوب صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کو ان کی ہدایت کے واسطے دنیا میں رحمت عالم بنا کر بھیجا۔ تمام دنیا میں اسلام کی روشنی پھیل گئی۔ گوشہ گوشہ منور ہو گیا پھر ایک وقت ایسا آیا کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس ظاہری دنیا سے تشریف لے گئے اس کے بعد آپ کے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اور ان کے بعد سلسلہ بہ سلسلہ سلف صالحین نے دین متین کی تبلیغ فرمائی۔ اور پھر اس پاک دین کے علمائے کرام آج تک اس کی تبلیغ میں بنی اسرائیل کے انبیاء کی مانند سرگرم عمل ہیں

جب ہم کسی قوم کی ارتقاء و استحکام پر نظر کرتے ہیں تو یہ بات روز روشن کی طرح عیاں ہو جاتی ہے کہ وہی قوم ارتقار کی منزلیں طے کر پائی ہے جو اپنے سلف کے کارناموں سے آگاہ رہی ہو اور اسے اپنے لئے مشعل راہ بنایا ہو اور انھیں کے نقش قدم پر عمل پیرا رہی ہو۔ اگر نونہال اسلام اپنے دین کے جلیل القدر فرزندوں کی سیرت پاک سے آشنا رہیں اور ان کے کارناموں کے نقوش اپنے دل کی گہرائیوں میں اتارتے رہیں تو انشاء اللہ مستقبل میں کامیابی و کامرانی کی منزلیں ان کے قدم چومتی جائیں گی۔

جو شخص انصاف و دیانت داری و غیر جانب داری کے ساتھ اپنے اسلاف و صالحین کے مذہب کا مطالعہ کرتا ہے وہ بڑی عزم و استقلال سے اپنے حال کے غیر مذہبی اور ملحدانہ قوتوں کی ساری کوششیں ناکام کر دیتا ہے کیونکہ اس کی نظر میں ورثہ میں ملے ہوئے تجربات ہوتے ہیں اور ان سے وہ خوب واقف ہوتا ہے۔ ہمارے اسلاف نے ہمیں جو کچھ ورثہ میں عنایت کیا ہمیں چاہیے کہ کل کا کل قبول کریں۔ کیونکہ ہم ماضی سے صرف اس وجہ سے مربوط ہیں کہ ان پر ہمارا حسن اعتماد ہے اور یہ اعتماد مجروح نہ ہونے پائے کیونکہ یہی ہماری آئندہ نسلوں کے مسلمان رہنے کی ضمانت ہے۔

سرزمین ہند میں مذہب اسلام کو فروغ دینے والے اور اس چمن کو سرسبز شاداب دیکھنے والے ہمارے اسلاف ہی تھے جنھوں نے اس کے گوشہ گوشہ کو اسلام کی خوشبو سے مہکا دیا۔ اگر ہم ان بزرگوں کا ذکر کرنا چاہیں تو ایک دفتر درکار ہے اس وقت ہم دور متاخرین کے علمائے کرام میں سے استاذ زمن حضرت مولانا حسن رضا صاحب بریلوی علیہ الرحمہ کا ذکر کرنا چاہیں گے۔

میرا بیٹا مست ہو گا

استاذ زمن حضرت علامہ مولانا حسن رضا
صاحب بریلوی علیہ الرحمہ کی پیدائش ۴ر ربیع الاول
اور ایک روایت کے مطابق ۲۲ر ربیع الاول ۱۲۷۶ھ
کو بریلی میں ہوئی آپ مولانا مولوی محمد نقی علی خاں صاحب
کے نور نظر اور مولینا احمد رضا صاحب فاضل بریلوی
کے برادر خورد تھے۔ جب آپ کے پیدائش کی خبر
آپ کے جد امجد حضرت علامہ رضا علی خاں صاحب
قبلہ کو دی گئی تو اظہار مسرت کرتے ہوئے فرمایا کہ
"یہ میرا بیٹا مست ہوگا" اور ہوا بھی ایسا ہی کہ مولانا
حسن رضا بریلوی نے عشق رسالت مآب صلی اللہ
تعالے علیہ وسلم میں ڈوبی ہوئی ایسی نعت گوئی کی کہ
عشاق رسول اللہ صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے لئے روحی
غذا ثابت ہوئی اور بذات خود بھی مست و بے خود
رہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ اس خاندان میں پیدا
ہونے والا ہر بچہ علم و فضل و کمال میں یکتائے زمانہ
ہوا۔ غور کریں کہ فاضل بریلوی جیسی بلند و بالا ہستی
نے جس گھر میں جنم لیا اور چہار دیواری کے اندر رہ
کر علم و فضل کے دریا بہا ڈالے بڑے بڑے عظیم
الشان علماء کے سر بھی جن کے در پر خم نظر آتے ہیں۔
پھر انہیں کے برادر خورد حضرت حسن بریلوی تشریف
لائے جو بحر العلوم تھے۔ اگر ہم غور کریں اور یہ جاننے
کی کوشش کریں کہ آخر اس خاندان کا ہر فرد اتنا
معظم و مکرم کیونکر ہوا تو اس کے پس منظر میں ہمیں
صرف ایک چیز کار فرما نظر آتی ہے اور وہ ہے سرکار
دو عالم صلی اللہ تعالی علیہ وسلم سے بے پناہ عشق اس
خاندان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھیں ادب دربار
مصطفے صلی اللہ تعالے علیہ وسلم کے ساتھ ساتھ بے
لوث عشق مصطفے اسقدر تھا جنھوں نے اپنی زندگی کا
کوئی لمحہ ایسا نہ گذرنے دیا جس میں شریعت مطہرہ
کی خلاف ورزی ہوتی ہو۔ اور اگر کسی شخص کے
نوک قلم سے ایک حرف بھی ایسا لکھا گیا جس سے
تنقیص رسول کا شبہ بھی ہو تو اسی خاندان کا ہر فرد
شمشیر برہنہ لئے ہوئے سامنے آیا اور عشق مصطفے صلی
اللہ تعالی علیہ وسلم کا عالم تو یہ رہا کہ فاضل بریلوی فرماتے
ہیں ؎

کروں تیرے نام پہ جاں فدا نہ بس ایک جاں دو جہاں فدا
دو جہاں سے بھی نہیں جی بھرا کروں کیا کروڑوں جہاں نہیں

لہٰذا اس کا صلہ یہ ملا کہ مختار دو عالم صلی
اللہ تعالی علیہ وسلم کے فیض خاص سے نوازے گئے۔
اور جسے ایسے عظیم الشان دربار سے نوازا گیا
ہو وہ خود فیض والا ہو جاتا ہے اور دنیا اس سے
فیضیاب ہونے لگتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیائے سنیت
کی علامت بریلی آج مرکز فیض روحانی و جسمانی ہے۔

استاذ زمن شاعری کی دنیا میں

شروع ہی سے آپ بہت حساس طبیعت کے تھے
لہٰذا شعر و شاعری کا ذوق ہونا فطری بات تھی۔ پہلے
تو بذات خود بہت روز مشق کرتے رہے ابتدا آپ
نے عشقیہ و مزاحیہ شاعری ہی سے کی۔ اس کے لئے بھی
آپکو ایک استاذ کی تلاش تھی۔ اس وقت حضرت
داغ کی شاعری کی ہر جانب دھوم مچی ہوئی تھی۔
آپ کی نظر نے بھی انھیں کا انتخاب کیا اور باقاعدہ
داغ کی شاگردی اختیار کر لی۔ اس وقت چاروں
جانب مزاحیہ اور رومانی شاعری کا ہی دور دورہ
تھا۔ غدر کے ہنگامے کے بعد داغ دہلی سے رامپور
آ گئے اور وہیں مقیم ہو گئے حضرت حسن بریلوی کا
ہمیشہ رامپور آنا جانا ہوتا رہتا تھا کیونکہ آپ کے
پھوپھا جناب فضل حسن صاحب راج دوارہ
رامپور ہی میں رہتے تھے۔ لہٰذا جب بھی اپنے
پھوپھا صاحب کے یہاں تشریف لے جاتے تو حضرت
داغ سے استفادہ ضرور کرتے اور ایسا بھی ہوا
کہ کبھی کبھی ۲/۲ ماہ رہ کر استفادہ کیا۔ اس زمانے

ہیں حضرت داغ ایک مسلم الثبوت اور مستند شاعر تھے ان کی صحبت میں رہ کر حسن رضا بریلوی کا بھی پایہ شاعری بہت بلند ہو گیا تھا۔ اور بذات خود بھی ایک مستند شاعر ہو گئے تھے۔ داغ دہلوی کے تلامذہ میں حضرت حسن بریلوی کا پایۂ شاعری بہت بلند تھا آپ نے اپنے استاد کے رنگ میں اپنے کلام کو اتنا سنوارا تھا کہ کبھی کبھی استاد اور شاگرد کے کلام میں فرق کرنا مشکل ہو جاتا ہے۔ مثلاً

داغ — جلوے میری نگاہ میں کون و مکاں کے ہیں
مجھ سے کہاں چھپیں گے وہ ایسے کہاں کے ہیں

حسن — انکا جلوہ نہیں دیکھا جاتا
دیکھ دیکھا نہیں دیکھا جاتا

داغ — قتل کرتے ہیں وہ طلب و مغفرت کے بعد
جو تھے دعا کے ہاتھ وہی امتحاں کے ہیں

حسن رضا — قتل کرنے کی وہ جلدی تھی نہیں
اب تڑپنا نہیں دیکھا جاتا

حسن رضا — ساقیا اور بھی اک ساغر پر جوش مجھے
دیکھ ایسا نہ ہو آجائے کہیں ہوش مجھے

شعر

وہ بھی ہیں ساغر شراب بھی ہے
چاند کے پاس آفتاب بھی ہے

جس زمانے میں حسن رضا بریلوی نے شاعری کی دنیا میں قدم رکھا اس وقت چاروں جانب مجازی اور رومانی شاعری کا ہی چرچا تھا لہٰذا آپ پر بھی اس کا اثر پڑا اور آپ نے اپنی شاعری میں پختگی اور بالیدگی حاصل کرنے کے لئے داغ سا استاد بنایا اور اپنی غزلیات میں ایک باقاعدہ دیوان مرتب کیا جس کا نام "ثمر فصاحت" ہے۔ یہ ایک عاشقانہ دیوان ہے اور آپ کی ایک بہترین یادگار ہے۔ اس دیوان میں حسن رضا بریلوی نے ایسے فکری و فنی جوہر دکھائے ہیں کہ دراصل ادب کی دنیا میں یہ ایک سنگ میل کی حیثیت رکھتا ہے اور آپ کو ایک مسلم الثبوت اور مستند شاعر کا درجہ عنایت کرتا ہے۔ لیکن افسوس ان تاریخ اردو ادب کے مصنفین پر ہے جنھوں نے آپ کو مستند شاعروں میں نہیں گنا۔ ورنہ آپ کو ادب کا طالب علم ایک مستند غزل گو کی حیثیت سے بھی جانتا۔ ثمر فصاحت کا مطالعہ کرنے پر یہ واضح ہو جاتا ہے کہ آپ کے اشعار بہترین فکر و فن کے اعلیٰ نمونے ہیں اور پوری شاعری میں آپ نے اپنے استاد کا ہی لب و لہجہ اپنایا ہے اور اسی اسلوب پر پوری شاعری کی ہے۔ خود فرماتے ہیں ؎

کیوں نہ ہو میرے سخن میں لذت سوز و گداز
اے حسن شاگرد ہوں میں داغ سے استاد کا

مولانا حسن رضا بریلوی کے تعلقات حضرت داغ سے بہت دنوں تک رہے۔ ایک بار اپنے اخی معظم حضرت رضا بریلوی کا ایک مطلع داغ صاحب کو سنایا۔ ع

وہ سوئے لالہ زار پھرتے ہیں
ترے دن اے بہار پھرتے ہیں

تو داغ صاحب سن کر پھڑک اٹھے اور فرمایا کہ مولوی ہو کر ایسے اچھے شعر کہتا ہے۔

نعتیہ شاعری کی طرف رغبت

جس طرح آپ کو مجازی شاعری سے رغبت تھی ٹھیک اسی طرح نعت گوئی سے بھی بالکل ابتدائی دلچسپی تھی۔ کیونکہ آپ کے گھر کا پورا ماحول مذہبی تھا اور شریعت کا سختی سے پابند تھا۔ آپ کے برادر معظم بہت بڑے عاشق رسول تھے لہٰذا مذہبی ماحول نے مجازی ماحول کو پنپنے نہیں دیا اور مذہب ہی غالب رہا اور مجازی عشق پر حقیقی عشق غالب ہو گیا۔ لہٰذا آپ نے مزاجیت کو خیرباد کہا اور عشق مصطفےٰ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سمندر میں غوطہ زن ہو گئے اور نعت پاک لکھنا شروع کیا اور اس میں اپنے

اخی معظم حضرت رضا بریلوی سے استفادہ کیا۔ فاضل بریلوی فرماتے ہیں کہ میں نے مولانا حسن رضا کو نعت گوئی کے اصول بتادئے تھے ان کی طبیعت میں ایسا رنگ رچا کہ ہمیشہ کلام اسی معیار اعتدال پر صادر ہوتا رہا۔ جہاں شبہ ہوتا مجھ سے دریافت کرلیتے۔

حضرت حسن بریلوی علیہ الرحمہ پر نعت رسول مقبول صلی اللہ تعالےٰ علیہ وسلم کا ایسا رنگ چڑھا کہ دم آخیر تک اپنے اس ذوق کو عبادت کی طرح کرتے رہے اور اپنی فکری وفنی کاوشوں کا ایک لاجواب تحفہ امت مسلمہ کو عنایت فرمایا جس کا نام "ذوق نعت" ہے یہ آپ کا دیوان جو ۱۳۲۶ھ میں شائع ہوا اور تب سے اب تک اس کے متعدد ایڈیشن چھپ چکے ہیں۔ آپ کے اس دیوان سے خوش ہوکر حضرت فاضل بریلوی نے قطعہ تاریخ طباعت کہہ کر آپ کو بہترین خراج تحسین پیش کیا۔

نعت حسن آمدہ نعت حسن
حسن رضا باد بزیں سلام
ان من الذوق بسحر ہمہ
ان من الشعر لحکمۃ تمام
کلک رضا دار چناں سال آں
باغت قبول از شہ راس الانام ۱۳۲۶ھ

کلام حسن اصحاب فن کیلئے مشعل راہ

حضرت حسن بریلوی کا پایہ شاعری باعتبار نعت گوئی ہر لحاظ سے بلند وبالا ہے۔ اول بات تو یہ کہ آپ غزل کے بنیادی شاعر تھے جس میں آپ کی زبان کافی منجھی ہوئی تھی۔ آپ نے نعت گوئی میں جدید ہیئتی اور فنی قدروں کو شریعت کے دائرے میں آزمایا اور بہت کامیاب رہے۔ اردو ادب کو نئی طرز فکر بھی آپ نے عنایت کی۔ آپ نے یہ ثابت کردیا کہ نعت جیسی مشکل صنف سخن کو بھی غزل نما بنایا جاسکتا ہے

یہ بات بغیر کسی رکاوٹ کے کہی جاسکتی ہے کہ چودھویں صدی ہجری کے اوائل میں حضرت رضا بریلوی اور حسن رضا بریلوی وہ دو برگزیدہ ہیں جنھوں نے نعتیہ شاعری کو بہت بلندی عطا کی۔ اور اس میں بڑے وسیع امکان پیدا کئے حضرت حسن بریلوی کا نعتیہ دیوان "ذوق نعت" میں حمد نعت سلام قصیدہ مثنوی رباعی قطعہ نعتیہ غزل وغیرہ سبھی کچھ موجود ہے۔ عشق رسول اللہ صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم سے بھرپور یہ نعتیہ دیوان ہر لحاظ سے فنی تہہ داری۔ فصاحت وبلاغت اور بہت شیریں طرز اسلوب نزاکت ونفاست اور احتیاط شرعی سے لبریز ہے۔ یہ دیوان اصحاب فکر وفن کے لئے مشعل راہ ہے۔ ذوق نعت پڑھنے سے ایسی کیفیت طاری ہوتی ہے جس کا لطف زبان وبیان سے باہر ہے۔ عشق نبی میں ڈوبے ہوئے ایک ایک شعر بوئے رسول سے دل ودماغ کو معطر کردیتے ہیں احساس ندامت اور التجائے مغفرت اور اظہار معصیت کے اشعار پڑھتے ہوئے آنکھوں سے اشک رواں ہوجاتے ہیں۔ اور ایسا احساس ہوتا ہے کہ ان اشعار میں اپنی ہی حقیقت بیان ہورہی ہے۔ حضرت حسن بریلوی نے اپنے اشعار میں عظمت رسول کا پاس رکھتے ہوئے ایسی فنی جوہر دکھائے ہیں اور اپنے جذبہ عقیدت کا اتنا والہانہ اظہار کیا ہے کہ صاحب علم حیرت وتعجب سے دانتوں تلے انگلی دباتے ہیں گنبد خضریٰ میں آرام فرمانے والے آقا ومولیٰ کی شان اقدس میں استاد زمن کا بے لوث عشق شعر کے ایک ایک سطر سے پھوٹا پڑتا ہے۔ آپ نے کس والہانہ انداز میں اشعار کہے ہیں اس کے لئے چند اشعار ملاحظ فرمائیں۔ ؎

(الف) جو سر پہ رکھنے کو مل جائے نعل پاک حضور
تو پھر کہیں گے کہ ہاں تاجدار ہم بھی ہیں
یہ کس شہنشہ والا کا صدقہ بٹتا ہے
کہ خسروؤں میں پڑی ہے پکار ہم بھی ہیں

ہمارے دست تمنا کی لاج بھی رکھنا
ترے فقیروں میں اے شہر یار ہم بھی ہیں

(ب) زمیں تھوڑی سی دیدے بہر مدفن اپنے کوچے میں
لگادے میرے پیارے میری مٹی بھی ٹھکانے سے
پلٹتا ہے جو زائر اس سے کہتا ہے نصیب اس کا
ارے غافل قضا بہتر ہے یاں سے پھر کے جانے سے

(ت) یہاں کے ڈوبتے دم میں ادھر جاکر ابھرتے ہیں
کنارا ایک ہے نہر ندامت بحر رحمت کا
الٰہی بعد مردن پردہ ہائے حائل اٹھ جائیں
اجالا میرے مرقد میں ہو ان کی شمع قربت کا

(ٹ) الٰہی دل کو دے وہ سوز الفت
پھنکے سینہ جلن پہنچے کمر تک
خدا یوں انکی الفت میں گما دے
نہ پاؤں پھر کبھی اپنی خبر تک

(ث) دکھائی جائے گی محشر میں شان محبوبی
کہ آپ ہی کی خوشی آپ کا کہا ہوگا
عزیز بچے کو ماں جس طرح تلاش کرے
خدا گواہ یہی حال آپ کا ہوگا

حضرت حسن بریلوی علیہ الرحمہ کے اشعار میں بہت بڑی خصوصیت یہ ہے کہ زبان و بیان بہت سادہ اور سلیس ہے۔ آپ دل کی گہرائیوں سے نکلے ہوئے جذبات بہت سادہ لفظوں میں پرو دیتے ہیں جو دل سے نکلتے ہیں اور دل میں اتر جاتے ہیں۔ مشکل سے مشکل زمین میں بھی آپ نے طبع آزمائی کی ہے جس میں آپ کے افکار و خیالات نے اسے آسان بنادیا ہے۔ محاورات کا جا بجا استعمال اور اس کے ساتھ جدت طرازی اور معنی آفرینی آپ کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ آپ کے جذبات جو شعر میں ڈھلتے ہیں اس میں آمد ہی آمد کی بہار ہے۔ لفظوں کے انتخاب اور شوکت الفاظ کے ساتھ ساتھ فارسی اور عربی کی آمیزش بھی شعر کے حسن کو دوبالا کردیتی ہے۔ تشبیہات تمثیلات استعارہ و کنایہ کی جلوہ گری بھی آپ کے نعتیہ دیوان میں جگہ جگہ دیکھنے کو ملتی ہے۔ مولانا حسن کی تصانیف میں تقریباً ایک درجن کتابیں ملتی ہیں۔

زیارت حرمین اور وصال

آپ گنبد خضری کے شوق دیدار میں ہمیشہ تڑپتے رہے اللہ رب العزت کی بارگاہ میں ہمیشہ تڑپ کر دعا مانگتے اور اپنے انھیں دلی جذبات کو شعروں میں پرو دیتے فرماتے ہیں۔ ؎

جانے والے چل دیئے ہم رہ گئے
اپنی اپنی اے حسن تقدیر ہے

بارگاہ ایزدی میں آپکی دعا مقبول ہوئی اور زیارت حرمین شریفین کی دیرینہ خواہش ۱۳۲۵ھ میں پوری ہوئی آپ حج کے لئے تشریف لے گئے۔ تمام مناسک حج بہت صحتمندانہ طریقے اور پر خلوص جذبے سے ادا کئے اور دیدار گنبد خضری سے مشرف ہوئے بریلی واپسی پر ۳ر شوال المکرم ۱۳۲۶ھ مطابق ۱۹۰۸ء میں آپ کا وصال ہوا۔ اور بریلی سٹی اسٹیشن سے متصل قبرستان میں مدفون ہوئے انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللہ رب العزت ان کی تربت پر رحمت کی بارش فرمائے۔ آمین بجاہ سید المرسلین۔

حسن بریلوی

معاصرین اور تلامذہ کی نظر میں

مولانا محمد بشارت علی رضوی شید اپھو قیصر گنج ضلع بہرائچ

استاد زمن مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی قدس سرہٗ کا نعتیہ دیوان ذوقِ نعت، ۱۹۰۰ء میں پہلی بار مطبع اہلسنت وجماعت بریلی سے حکیم حسین رضا خاں (بڑے صاحبزادے حسن بریلوی) اور مولانا حسنین رضا خاں بریلوی (فرزند اصغر) نے شائع کیا۔ طباعت وکتابت نہایت درجہ اچھی ہے۔ چونکہ یہ سارے مرحلے مولانا کے شاگردوں نے طے کئے تھے۔ اور جو کام دل جمعی سے کیا جاتا ہے وہ بہتر سے بہتر ہوتا ہے

پہلے نسخہ کی طباعت پر جن شعراء نے خراج تحسین پیش کیا ہے اور تاریخی مادے کہے ان شعراء کا مختصر تذکرہ پھر ہر ایک کے ہوئے تاریخی قطعات پیش کئے جا رہے ہیں

شہر رام پوری

صاحبزادہ مصطفےٰ رضا خاں شہر رامپوری (۱۹۱۷ء)، خلف صاحبزادہ محمود علی خاں ـــ آپ عرصہ تک نواب حامد علی خاں والی رام پور (۱۹۳۰ء)، کے ذاتی معتمد خاص رہے۔ نینی تال میں انتقال ہوا، شہر رام پوری نے رامپور میں ایک عام مشاعرہ ۱۹۰۸ء میں کیا تھا جسمیں تمام مشاہیر شعراء نے شرکت کی تھی اس مشاعرہ کا گلدستہ "تصویر مشاعرہ" کے نام سے شائع ہو چکا ہے ـــ اب پیش ہے صاحبزادہ محمد مصطفےٰ علی خاں بہادر شہر رام پوری کا کہا ہوا تاریخی قطعہ ؎

یہ مضمون ہائے دلکش وہ حسنیاں پر یوشیاں ہیں
ادائیں جنکی جان پرور ہیں جنکا بانکپن اچھا
شام جان معطر ہے عجب لکھا ہے معنی ہے
صفاتِ مصطفےٰ میں کھل رہا ہے یہ چمن اچھا
نہ کیوں ارباب معنی دم بھریں حسن مضامین کا
مصنف شاعر شیریں بیاں لطف سخن اچھا
شرر میں نے بھی لکھا خوب سال طبع کا مصرع!
چھپا ہے نعت سرور میں یہ دیوان حسن اچھا!

عاشق بریلوی

میر محمود علی عاشق وحمد بریلوی مولینا حسن بریلوی سے تلمذ تھا، اور ان کے بہت چہیتے شاگرد تھے۔ ان کے ساتھ حسن سلوک اپنے بیٹوں جیسا تھا۔ پیشہ تجارت تھا۔ ان کے والد ٹوپیوں کی دوکان رکھتے تھے بہ حیثیت مجموعی مالدار آدمی تھے حسن بریلوی کے مطبع اہلسنت "روز افزوں" اور "بہار خزاں" کے متعلق جملہ اوران سے متعلق تھے خوش گو شاعر تھے۔ عاشق بریلوی کی ادارت میں ماہنامہ "بہار بے خزاں" اور ہفتہ وار "روز افزوں" جاری ہوا، جو اس عہد کے مذاق کے مطابق پاکیزہ ادب پیش کرتے تھے فروری ۱۹۰۳ء میں بہار بے خزاں کا رسم اجرا ہوا۔ اخبار روز افزوں کا اجرا ۱۹۰۴ء میں ہوا یہ ہفتہ روزہ اخبار اپنے زمانہ میں بہت مشہور تھا ـــ اب پیش ہے میر محمود علی عاشق وحمد بریلوی کے قطعات ذوقِ نعت پر تاریخی

رنگینی ہے کلام پاک استاد
گلزار بھبوں جیسن کہوں سے ہیں!

جب ہو سنِ طبع کی مجھے فکر
افکار خوش حسن کیوں میں لکھوں ۱۳۲۶ھ
حمد و نعت و منقبت میں یہ کتاب
آپ ہے اپنی نظیر اپنا جواب
کیا ہی پیارا نام ذوقِ نعت ہے
ہے کلام اس میں سراسر انتخاب
نعت پاک اور اس طرح کی آبدار
تو جھکے آگے آب گوہر آب آب
یا خدا اس کے مصنف پر مدام!
بے شمار اکرام رحمت بے حساب
طبع دیوان کے لکھے سن حمد نے
ہر غزل ہے بے بہا و لاجواب
۱۳۲۶ھ

ختم کرد استاد من دیوان نعت
حمد شکر خالق اکبر بگو!!
آفریں صد آفریں و اتم بخوان!
مرحبا صد مرحبا اکثر بگو
چوں سنِ طبعش زہاتف خواستم
گفت زیبا مدح پیغمبر بگو
۱۳۲۶ھ

نامی بریلوی

حکیم سید برکت علی نامی بریلوی مولانا کے تلامذہ میں سے ہیں۔ محلہ ذخیرہ بریلی شریف کے رہنے والے تھے بریلی کی ادبی انجمنوں اور مشاعروں میں خوب حصہ لیتے تھے نامی بریلوی کی تصنیف "تاریخ واسوخت" پر مولینا حسن نے تاریخی قطعہ کہا۔

میر نامی نے لکھا واسوخت خوب :: روح بخش و دل کشا ہے بند بند
فکر ہے مجھ کو اگر تاریخ کی :: لکھ حسن واسوخت نامی دل پسند
۱۳۲۲ھ

حکیم سید برکت علی نامی بریلوی نے ذوقِ نعت پر یوں طبع آزمائی کی ہے

کلام حضرت استاذ اکرم :: کمال شعر و شرع آورد باہم
کمال طبع محبوب خدا چید :: شعرش شرع محبوب خدا دید

بایں معنی اشارت کرد نامی :: ندو مصرع بہ تاریخ گرامی
۱۳۲۶ھ ۔ ۱۳۲۶ھ
نگر زیں شمع نور مجتبیٰ چید :: مگر طبع محبوب خدا چید
۶۶۳۲۲
۱۳۲۶ھ

حسن نے اپنا دیوان طبع کر کے :: سخن سنجوں پر اک احسان کیا ہے
یہ دیوانہ ہے کہ ہے روح فصاحت :: بلاغت جان سے اس پر فدا ہے
ہیں گویا دامن یوسف میں کلیاں :: زمین شعر میں مضمون کیا ہے
کہا ہاتف نے سال طبع نامی :: یہ دیوان ہے کہ عرش مدعا ہے
۱۳۲۶ھ

استاد نے وہ رنگین دیوان نعت لکھا!!
ہر ایک کی زبان سے نکلی صدائے تحسین!
ہر شعر میں مہک ہے خوشبوئے احمدی کی
اس باغ پر فضا میں کیا کیا بہاریں دیکھیں
کی فکر سال دیوان جب نامی حزیں نے
آئی ندائے ہاتف خوش ہو گئے شہ دیں
۱۳۲۶ھ

محشر بریلوی

قاضی حافظ وہاج احمد خلف رشید قاضی برہان علی تحصیل دار ضلع بریلی مرزا داغ دہلوی اور مولانا حسن کے شاگرد تھے۔ محشر تخلص تھا۔ ان کا شمارہ مالدار شعراء میں ہوتا تھا عربی اور فارسی سے بہت دلچسپی تھی۔ ملاحظہ کریں
ذوقِ نعت پر تحریر کردہ تاریخی قطعہ!

دیوان حسن کا آج وہ پیش نظر ہوا!
مرقوم جس میں نعت رسولِ قدیر ہے
مقبول خاص و عام ہو کیونکر نہ یہ کلام
دلکش ہے دل غریب ہے اور دل پذیر ہے
طرز سخن نئی ہے پرانے بیان سے
اشک کلام حضرت داغ و امیر ہے
تاریخ طبع کی مجھے محشر ہوئی جو فکر!
آئی ندا چھپا سخن بے نظیر ہے
۱۹۰۸ء

آج وہ نعت کا چھپا دیوان :. جس کا ہر شعر بابِ رحمت ہے
دل سے محشر لکھا قلم نے یہ سال :. مطلع آفتابِ رحمت ہے

۱۳۲۶

خواہاں بریلوی

سید محمد قاسم علی خواہاں بریلوی ۱۸۴۸ء میں محلہ ذخیرہ بریلی میں پیدا ہوئے، شاعری میں امیر الدین آزاد دہلوی (م ۱۸۹۶ء) اور فرحان بریلوی کے شاگرد تھے طویل عمر پائی بڑھاپے میں فالج کا حملہ ہوا، دس برس صاحب فراش رہے، ۱۶ محرم بروز چہار شنبہ ۱۳۵۱ھ ۹ مارچ ۱۹۳۲ء کو وفات پائی ـــ پڑھئے ذوقِ نعت پر ایک تاریخی نظم اور قطعہ۔

کیا پُر صفا کلام ہے کیا دل ربا کلام
نعت شریف کا ہے عجب واہ وا کلام
کارِ حسن رضائے خدا و رسول ہے
مقبول دہر کیوں نہ ہو یہ خوشنما کلام
صلّی علیٰ جو نعت کہے تیری کسی کہیے
قابلِ درود کے ہے سخن تیرا لا کلام
جو تجھ لکھا ہے تو نے سراپا درست ہے
ہرگز نہیں خلافِ شریعت ہے لا کلام
جو کچھ کہا خدا نے ثنائے جناب میں
ویسا ہی نعت میں ہے تیرا مرحبا کلام
میرا کہاں یہ منہ کہ کروں تیرا وصف میں
ہرگز کسی سے ایسا نہ دیکھا سنا کلام
میں کیا ثنائے بندش و مضمون رقم کروں
ہے حسنِ طبع پر تیرے واصف ترا کلام
محنت تیری وصول ہو تجھ کو صلہ ملے
مشہور یا الٰہی ہو یہ جا بجا کلام
تاریخ سالِ طبع کی خواہاں نے یہ کہی
ہے عاشقِ نبی خدا کا بنا کلام!

۱۳۲۶

مضامین نعت آں چناں دلکش ست
پے جذب دل میکند کار شست!

نداد ہاتف چو کردم خیال
صفو نعت تاریخ خواہاں خوش ست

۱۳۲۶

مظہر بریلوی

منشی مظہر حسین نام اور مظہر بریلوی تخلص تھا آپ چار بھائی تھے اور سبھی کو شعر و سخن سے لگاؤ تھا چار و برادران دبستانِ حسن بریلوی کے خوشہ چینوں میں تھے ـــ ملاحظہ ہو قطعہ ذوقِ نعت پر!

وہ دیوان لکھا میرے استاد نے :. کہ رنگینوں پر فدا ہیں چمن!
سنِ طبع مظہر ہیں اس نسخے :. خیابانِ جنت کلامِ حسن،

۱۳۲۶

اختر بریلوی

منشی اختر حسین اختر بریلوی محلہ نقشبندیان جسولی بریلی کے ساکن تھے مولانا سے شرف تلمذ تھا، اختر بریلوی کچہری بریلی میں ملازم تھے، طویل عمر پاکر انتقال ہو ـــ حاضر ہے تاریخی قطعات،

حضرت استاد کا دیوان چھپا :. کر ہے جو تعریف اسکی میں کہوں
مجھ سے گر پوچھے کوئی تاریخ طبع :. گلشن شاداب خوبی میں کہوں

۱۳۲۶

قیس بریلوی

منشی ہدایت یار خاں خلف ہادی یار خاں، محلہ بازداران بریلی کے ساکن تھے۔ قیس بریلوی تخلص تھا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں بریلوی سے بیعت تھے۔ اور امام رضا بریلوی کی قائم کردہ کل ہند جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی کے تاحیات صدر رہے۔ نہایت درجہ متحرک وفعال آدمی تھے۔ جماعت رضائے مصطفےٰ بریلی کو کامیابی سے چلاتے رہے اسکی پورے متحدہ ہندوستان میں ذیلی تنظیمیں اور شاخیں قائم کردیں۔ مذہبی خدمات کے علاوہ سیاسی سطح پر بھی خدمات قابل تحسین ہے۔ جماعت رضا مصطفےٰ کے ہندستان پر سیاسی و مذہبی مثبت اثرات تھے اہلسنت وجماعت میں اس تنظیم کے بعد جماعتی صلاحتیں اور تنظیمی ڈھانچہ کا معیار ختم سا ہوگیا۔ جب کہ سیکڑوں جماعتیں گھر گھر میں قائم ہیں۔ صرف اور صرف کاغذ ہی پر وجود باقی رہ گیا ہے قیس بریلوی کے تفصیلی حالات

اور خدمات دیکھئے۔ راقم السطور کی قلمی کتاب "تذکرۂ جماعت رضا مصطفےٰ"۔ نگیں بریلوی مولینا کے قابل فخر تلامذہ میں تھے

قطعہ

استاد کا چھپ رہا ہے دیواں :: ہر وصف میں خوش ادا خوش اسلوب
محبوب خدا کی شان میں ہے :: ہو کیوں نہ وہ دل سے کیوں نہ محبوب
مرغوب ہے یہ کلام سارا :: تاریخ نگاہ کہے جلد مرغوب!

حلم بریلوی

منشی دوارکا پرشاد حلم بریلوی خلف منشی لال از اولاد رائے لچھمن لال رئیس بریلی۔ حلم بریلوی کا خاندان اخبار نویسوں کا خاندان کہلاتا ہے حلم بریلوی مولانا حسن بریلوی کے شاگرد تھے، قلمی دیوان منشی بھگوان داس کے پاس محفوظ ہے۔ حلم بریلوی کے شاگردوں میں پنڈت لال بہادر انجم، بابو شیاما چرن بزم کافی مشہور ہیں۔ پھر ذوقِ نعت پر کہا ہوا تاریخی قطعہ!

واہ کیا نعت میں دیوان کہا :: جسکی شہرت کا ہے چرچا گھر گھر
بے بہا ہے یہ حسن کی تصنیف :: اس کا ہر مصرعہ سلک گوہر
کیا کہے گا کوئی اس سے اچھا :: کیا لکھے گا کوئی اس سے بہتر
حلم تاریخ میں ہے پاکیزہ :: خوب لکھی ہے یہ نظم اطہر!

۱۹۰۸ء

فیروز بریلوی

مولینا حسن بریلوی کے دبستان شعر و سخن میں ہندو شعراء کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ انھیں میں برجموہن لال کشور فیروز بریلوی بھی تھے مولینا کے انتقال پر فیروز بریلوی نے تاریخ وصال کہی جسکے اشعار درج ذیل ہیں۔

یہ دنیا سے ہو گئے جب سیر
گئے استاد سوئے دار بقا
نیرِ چرخ نظم تھے استاد!
ان سے تھی ملکِ شاعری میں ضیا
نعت لکھنے میں تھے اگر کامل!
تو مجازی میں بھی تھے وہ یکتا!
اب نہیں کوئی قدر دانِ سخن
اب نہیں لطف شاعری اصلا!!

سال رحلت یہ آہ لکھ فیروز
آج افسوس کی حسن نے قضا

۱۳۲۶ھ/۱۹۰۸ء

فیروز بریلوی نے ذوقِ نعت کی طباعت پر قطعہ کہا۔ ملاحظہ ہو

گفت در نعت طرفہ دیوان! :: عالم بجمال او شدہ شاد
ہاتف پے سال گفت فیروز :: دیوان چو شستہ خوب استاد

۱۹۰۸ء

قیصر مرادآبادی

منشی حکیم اعجاز احمد قیصر مرادآبادی اولاً مرادآباد کے رہنے والے تھے بعد میں بریلی اپنا مستقل مستقر کر لیا تھا۔ مولانا کے دونوں دیوان یعنی ذوقِ نعت اور ثمر فصاحت کی کتابت قیصر مرادآبادی ہی نے کی تھی وہ اچھے خوشنویس تھے کاتب کے ساتھ ساتھ شاعری سے بھی ذوق تھا۔ مولینا کے شاگرد تھے آپ کے مشہور شاگرد منشی احسان الحق قمر مرادآبادی تھے۔

ذوقِ نعت پر تاریخی قطعہ بھی تحریر کیا!

قربان کلام پاک استاد :: قیصر ہے یہ نعت بہشتی!
دل نے پایا جو اس سے آرام :: تاریخ ہے راحت بہشتی!

۱۳۲۶ھ

آثم بریلوی

حضور احمد خاں آثم بریلوی ابتدا میں نیاز احمد خاں ہوش بریلوی (ر ۱۹۲۳ء) کے شاگرد ہوئے بعد کو امیر مینائی (ر ۱۹۰۰ء) کے حلقۂ تلامذہ میں داخل ہوئے، مدرسہ مصباح العلوم بریلی میں مدرسی اختیار کی۔ تاحیات وہ اس پیشہ سے منسلک رہے آثم بریلوی نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی، نعت سے زیادہ دلچسپی تھی۔ نعتیہ کلام منظور حق (۱۳۰۳ھ/۱۸۸۶ء)، مطبع نظامی کانپور سے شائع ہو چکا ہے ۱۹۴۷ء میں فوت ہوئے۔

درج ذیل ذوقِ نعت پر لکھی گئی نظم:

بحمد اللہ دیوان لکھا ہے نعت احمدی میں
کیا ہے کسطرح اظہار اپنے شوق بیحد کا
صدائے صلِ علیٰ کی ہے ترانے مرحبا کے ہیں
قلم بلبل بنا ہے گلشنِ نعت محمد کا

الٰہی فیض اٹھاتی عاشقان مصطفےٰ اس سے
ہو شہرہ شرق سے تا غرب دیوان مجدد کا
صلہ میں نعت اقدس کے جنان دے تو معنٰی کو
بنے ہر گوشہ جنت یا الٰہی اس کے بدلے کا
لکھو یہ مصرع برجستہ سال طبع کا آثم!
بہت زیادہ لکھا دیوان بہت نعت احمد کا!

۱۳۲۶ھ

کیجئے کیا تعریف دیوان کی :: سب سے پاکیزہ واقعی پاکیزہ ہے
طبع کی تاریخ آثم نے لکھی :: دفتر نعت نبی پاکیزہ ہے

۱۳۲۶ھ

محو بریلوی

مولوی مفتی حکیم حماد الحسن عثمانی محو بریلوی نے عربی و فارسی کی کتابیں مولوی سید ہدایت علی بریلوی سے حاصل کی۔ اور تکمیل اپنے والد مفتی سلطان حسن خاں احسن بریلوی سے کی، شہر بریلی میں ایک مفتیوں کا خاندان تھا۔ جن سے مذکورہ شخصیات کا تعلق رہا ہے، محو بریلوی کے شاعری میں استاد حضرت بسمل بریلوی تھے۔ مفتی محو بریلوی نے ملازمت کی طرف توجہ نہ فرمائی۔ اور خانہ نشینی کی زندگی بسر کی تاہم رفاہ عام سے غفلت نہ برتی اور ہمیشہ اپنے اعزا و اقارب، احباب اور عوام الناس کی طبابت سے خدمت فرما رہے۔ آپ مولانا حافظ کرامت علی خاں شاہ جہانپوری سے بیعت تھے۔ ۱۹۳۷ء میں انتقال کیا۔

محو بریلوی مربی سخن اور غزل گو شاعر تھے آپ نے ۱۹۱۳ء میں "بزم ادب" کی تشکیل کی۔ اس کے باقاعدہ مشاعرے ہوتے تھے، ان مشاعروں کی محفلیں مشرقی روایات اور تہذیب کا نمونہ تھیں، "بزم ادب" ۱۹۲۴ء تک قائم رہی۔ آپ کا مولانا حسن بریلوی سے خاص تعلق تھا۔ اس بنیاد پر آپ نے ذوق نعت پر تاریخ لکھی ——— ملاحظہ ہو

جناب حسن شاعر خوش بیان :: کہ بودہ رضا جوی مطلوب حق!
نوشتست دیوان کہ تاریخ اوست :: حدیث حسن نعت محبوب حق

۱۳۲۶ھ

حافظ پیلی بھیتی

آپ کا پورا نام مولوی قاضی حافظ خلیل الدین ہے، حافظ تخلص اختیار کیا، شہر پیلی بھیت کے رئیس تھے، ابتدا میں وکالت کی بعدہٗ آنریری مجسٹریٹ رہے، حافظ پیلی بھیتی شاہ فضل الرحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ سے ارادت رکھتے تھے، دورۂ حدیث محدث سورتی قدس سرہٗ سے کیا، نعتیہ شاعری میں آپ کو ید طولیٰ حاصل تھا۔ آپ کے آٹھ نعتیہ دیوان مطبوعہ موجود ہیں (۱) نعت مقبول خدا ۱۸۸۷ء (۲) نغمہ روح ۱۸۹۳ء (۳) خمخانہ حجاز ۱۸۹۹ء (۴) آئینہ پیغمبر ۱۹۱۱ء (۵) بیاض نعت ۱۹۱۳ء (۶) نغمہ جگر دوز ۱۹۱۶ء (۷) لذت درد ۱۹۱۹ء (۸) میخانہ خلد ۱۹۲۱ء نعتیہ دیوان ہیں۔

حافظ پیلی بھیتی کے تلامذہ کی ایک کثیر جماعت ہے آپ کا مولانا حسن رضا بریلوی اور اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں قدس سرہٗ سے خاص تعلق تھا، اسی بنیاد پر انھوں نے مولانا کے نعتیہ دیوان کی تاریخ رقم فرمائی۔

بحمداللہ حسن کا چھپ گیا دیوان نعتیہ!
ہے عقبیٰ کے لئے روحوں کو لاثانی شمع توشہ
یہ روحانی سفر توشہ نظر آیا جو حافظ کو ا
کہا چھپنے کی ہو تاریخ روحانی سفر توشہ

۱۳۲۶ھ

حسن پہونچے جو سے گرد فر نعت :: حضور کبریا شاباش بشاش سے
سراپردہ سے حافظ بہر تاریخ :: ندا آئی حسن شاباش شاباش

۱۳۲۶ھ

ماخذ

(۱) ذوق نعت ——— مولانا حسن رضا خاں حسن بریلوی مطبوعہ ۱۳۲۶ھ مطبع اہلسنت و جماعت بریلی مملوکہ جناب مرتضیٰ علی صاحب بانس منڈی بریلی۔

---

(۲) ثمر فصاحت ——— مولانا حسن رضا خاں بریلوی ——— مطبع اہلسنت و جماعت بریلی، مملوکہ حضرت مولانا حبیب رضا خاں حبیب بریلوی

(۳) تاریخ شعراء روہیلکھنڈ ۴ جلدیں ——— سید تعظیم علی نقوی شایان بریلوی۔

مطبوعہ فرحان پبلکیشنز کراچی ۱۹۹۰ء باہتمام سید عظیم القدر کراچی

حسّان کی زبان ہیں میرے حسن رضا

جناب صوفی محمد جمیل اختر صدیقی رضوی ۱۵/۵ کرایہ روڈ کلکتہ ۱۷

آقا کے مدح خوان ہیں میرے حسن رضا
ہاں! ثانیِ حسّان ہیں میرے حسن رضا

بے شک مشامِ جانِ دو عالم ہے مشکبار
نعتوں کے عطردان ہیں میرے حسن رضا

نعتوں کو سن کے ان کی فرشتے بھی مست ہیں
مولیٰ کے حمد خوان ہیں میرے حسن رضا

بحرِ علومِ دین و شریعت کے ہیں گہر
حسنِ علم کی کمان ہیں؛ میرے حسن رضا

سرکارِ دوجہاں کی دونوں جہان میں
عظمت کے پاسبان ہیں میرے حسن رضا

شعر و سخن کی راہ کا دراصل دوستو!
سرخیلِ کاروان ہیں میرے حسن رضا

کہتے ہیں سارے لوگ بریلی کے آج بھی
روحانیت کی جان ہیں میرے حسن رضا

فضلِ خدا و فیضِ نبی و ولی سے آج!
بندوں پہ مہربان ہیں میرے حسن رضا

شعروں میں ان کے عشقِ صحابہ کا ہے خمار
حسّان کی زبان ہیں میرے حسن رضا

نعتوں میں عشقِ سیدِ عالم کی ہے مہک
شعر و سخن کی جان ہیں میرے حسن رضا

ردِّ وہابیت پہ بھی اشعار ہیں کہے
مسلک کے ترجمان ہیں میرے حسن رضا

سرکارِ دوجہاں کی عظمت پہ بالیقیں
سو جان سے قربان ہیں میرے حسن رضا

سجدوں کا نور چہرۂ تاباں پہ دیکھتے
ایمان کی پہچان ہیں میرے حسن رضا

پیکر نگاہِ پاک سے سب مست ہو گئے
میخانۂ ایمان ہیں میرے حسن رضا

یوں بندگی پہ جس کی ملائک بھی دنگ ہیں
وہ بندۂ رحمان ہیں میرے حسن رضا

شایانِ شان آپ کی لکھوں کوئی غزل
دل کے مرے ارمان ہیں میرے حسن رضا

نازاں تھا جس کے شعر پہ دلّی کا داغ بھی
وہ شاعرِ ذیشان ہیں میرے حسن رضا

مجھ پر بھی دل سے سُن لے شب و روز اے جمیل
مدت سے مہربان ہیں میرے حسن رضا

آپ اُستاذِ زمن ہیں بالیقین قبلہ حسن

نقیب اہلسنت مولانا علی احمد مصباحی سیوانی، حسن پورہ، ضلع سیوان

عاشق شاہِ زمن ہیں بالیقیں قبلہ حسن
مدح خوانِ پنجتن ہیں بالیقیں قبلہ حسن

نکہت نکتہ بیانی سے معطر ہیں دماغ
خوشبوئے گلہائے فن ہیں بالیقین قبلہ حسن

داغ بھی نازاں تھے اپنے نیک خو شاگرد پر
معترف اہلِ سخن ہیں بالیقیں قبلہ حسن

آپ کا ہر شعر ہے تفسیرِ قرآنِ مجید
مظہرِ خلقِ حسن ہیں بالیقیں قبلہ حسن

آپ کی نعتوں کی تاثیروں سے دل ہیں مضطرب
واصفِ شاہِ زمن ہیں بالیقیں قبلہ حسن

کیسے کیسے شاعروں کی تربیت فرمائی ہے
آپ استاذِ زمن ہیں بالیقیں قبلہ حسن

آج بھی نقادِ فن اس بات کے ہیں معترف
ہاں شہنشاہِ سخن ہیں بالیقیں قبلہ حسن

آپ کی نکتہ بیانی کی جہاں میں دھوم ہے
آفتابِ علم و فن ہیں بالیقیں قبلہ حسن

آپ کی ہر ہر ادا ہے عکسِ کردارِ رسول
پرتوِ شاہِ زمن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

آپ گلزارِ سخن کی ہیں بہارِ بے خزاں
باغبانِ باغِ فن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

آپ کا احسان ہے دنیائے ادب و شعر پر
محسنِ اہلِ سخن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

آپ کے جلووں کی کرنیں ہیں جہانِ شعر میں
نیرِ چرخِ کہن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

گلستانِ شعر و گلزارِ سخن کا دوستو
بلبلِ شیریں دھن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

آپ کی فکرِ رسا کی ہیں شعاعیں دھر میں
جلوۂ شعر و سخن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

اچھے اچھے شاعرانِ نکتہ رس کے دیکھیے
آج بھی استادِ فن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

اہلِ دیں، اہلِ عقیدت سب پہ ہے نظرِ کرم
مشفقِ اہلِ سنن ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

میں علیؔ کم فہم کیا سمجھوں ان کے شعر کو
ماہرِ فنِ سخن میں ہیں بالیقیں قبلہ حسنؔ

تقسیم کار

قادری بکڈپو نومحلہ مسجد بریلی شریف ۔ فاروقیہ بکڈپو مٹیا محل جامع مسجد دہلی
مکتبہ جام نور مٹیا محل جامع مسجد دہلی ۔ رضوی کتاب گھر بھیونڈی ضلع تھانہ